TEXT DARK AND LIGHT WITH IN THE BOOK ONLY

188479

س - ھ

۹۵۳۵۰۲۴

مسٹر نی کاروولن
ہندوستان کی حالت

27 DEC 1963

Checked 978

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۵۴۵۰۲۴ Accession No. ۴۲۴۹۹

Author سڈنی اولیور - س - ہ

Title ہندوستان کی حالت

This book should be returned on or before the date last marked below.

۴۴۶۶۵

سلسلۂ نصابات علمیہ جامعہ عثمانیہ

ہندوستان کی حالت

(برطانی تسلط کے قریب)

تصنیف

اوون سڈنی

ترجمہ

مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

سنہ ۱۳۵۹ھ م سنہ ۱۳۴۹ف م سنہ ۱۹۴۰ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ہندوستان کی حالت

(برطانی تسلط کے قریب)

ابواب	مضامین	صفحات
۱	۲	۳
باب اول	ہندوستان کے حالات طبیعی	۱ تا ۱۶
" دوم	متقدم سلاطین مغلیہ	۱۷ تا ۳۳
" سوم	مغلیہ حکومت	۳۴ تا ۵۵
" چہارم	اورنگ زیب اور شمالی ہند	۵۶ تا ۶۶
" پنجم	مرہٹہ قوت کا بانی، سیواجی	۶۷ تا ۹۶
" ششم	مرہٹوں کی جنگ آزادی	۹۷ تا ۱۱۷
" ہفتم	راجہ، نواب نظام الملک اور پیشوا	۱۱۸ تا ۱۳۹
" ہشتم	سلطنت کی آخری گھڑیاں	۱۴۰ تا ۱۶۸
" نہم	مرہٹوں کے جتھے کی نشو و نما	۱۶۹ تا ۱۹۰
" دہم	مرہٹوں کی طاقت کا انتہائی عروج	۱۹۱ تا ۲۱۱
" یازدہم	حیدر علی کا عروج	۲۱۲ تا ۲۴۹

ابواب	مضامین	صفحات
۱	۲	۳
باب دوازدہم	محاربۂ پانی پت	۲۵۰ تا ۲۷۴
	اختتام	۲۷۵ تا ۲۷۶

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابِ اوّل

ہندوستان کے حالاتِ طبیعی

ہندوستان کی قدرتی حدود اور بڑے بڑے مقررہ اقطاع اچھی طرح نمایاں ہیں؛ اس کے وہ کنارے جن سے سمندر کی موجیں نہیں ٹکراتیں۔ ایشیا کی سطحِ مرتفع سے ملے ہوئے بھی ہیں اور اسی کوہستانی دیوار (یا اس کی شاخوں) کے ذریعے جو انھیں ایشیا سے ملاتی ہے، ہندوستان کی حدِ فاصل بھی بناتے ہیں۔ کرۂ ارض کا یہ کوہستانی حصار اسی علاقے میں اپنی انتہائی بلندی تک پہنچا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، کوہستانِ ہمالیہ کا سلسلہ پھیل کر جنوب میں ہندوکش سے ملتا اور پھر پست ہو کر کوہستانِ سلیمان کی صورت میں بڑھا چلا گیا ہے۔ اور کوہستانِ ہالا کا حصار مغربی سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ اُدھر، مشرق کی طرف آئیے تو گارو اور کوسیا کی پہاڑیاں جن سے وادیٔ برہم پتر کی حد بندی اور بلندیاں بنی ہیں، وہ انھی برمی پہاڑوں کی آگے نکلی ہوئی شاخ ہیں، جو ارکان پر چھائے ہوئے ہیں اور بیرونِ ملک کی ندی ایراودی کے منبعوں کو پانی پہنچاتے اور ہندوستان کو چین سے جدا کرتے ہیں۔

باب اول

سرحدوں کی طرح ہندوستان کی اندرونی تقسیم بھی نہایت واضح ہے اور زمین کی ظاہری ساخت نے ملک کو خود بخود مختلف خطوں میں بانٹ دیا ہے۔ چنانچہ شمال میں تو دریاؤں کے طاس اور شاندار دہانوں کا وسیع بچھا ہوا علاقہ ہے جس کی خصوصیات معلوم ہیں۔ وسط میں بے قاعدہ سا پہلو دار مرتفع علاقہ پہاڑوں میں محصور ہے۔ پہلوؤں پر ساحل کے نشیبی میدان زاویہ بناتے ہوئے چلے گئے اور سطح مرتفع کے جنوبی سرے پر مل گئے ہیں۔ پھر اسی انتہائی جنوب میں وہ میخ نما سنگستانی خطہ ہے جس کے وسط میں بلندی اور سمندر کی طرف دونوں جانب ڈھلانیں ہیں اور راس کماری اس زاویے کا سمت الراس ہے۔ ہندوستان کی صورت طبعی کا یہ خلاصہ ہے اور یہ بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن دیگر تفصیلی بیانات کے مقابلے میں غلط یا غیر اہم ثابت نہ ہوگا۔

اپنی ساخت کے اعتبار سے اراولی پربت کا سلسلہ کاٹھیاواڑ سے شروع ہوتا اور وادی سندھ کا مشرقی فاصل آب ہے یا یوں کہئے کہ اسے فاصل آب ہونا چاہئے تھا مگر ایک خاص وجہ سے جس کا بیان آگے آتا ہے وہ اس خدمت کو بہ مشکل انجام دیتا ہے شمال کے سرے سے یہ پہاڑ جنوب مشرق کی جانب پست ہوتا چلا گیا ہے اور کوہستان ہمالیہ کے قریب قریب متوازی ہے لیکن راج محل کی پہاڑیوں سے یکایک جنوب مغرب کی طرف مڑ جاتا اور اڑیسہ کے پورے علاقے سے نیل گرین وغیرہ پہاڑوں کی صورت میں گزر کر مشرقی گھاٹ سے ملتا یا خود مشرقی گھاٹ کی پہاڑیاں بن جاتا ہے پہاڑیوں کا یہ طویل سلسلہ (= گھاٹ) مختلف مقامات پر اپنی بلندی اور ساخت کے اعتبار سے نہایت مختلف ہے لیکن دکن اور جنوبی ہند کی بلند سطح کا مسلسل کنارا ہے جو جھکا کر پھر مغرب کی طرف مڑا اور بڑھ کر کھمبایت تک پہنچ گیا ہے جہاں سے کاٹھیاواڑ کی سرحد پھر قریب آجاتی ہے۔ جنوبی ہند کی سب سے اونچی چوٹیاں نیل گری کی پہاڑیاں ہیں ان میں سب سے بلند مقام پالی گھاٹ ہے۔ ان پہاڑوں کے زیر قدم ایک مخروطی خلا سا بن گیا ہے جسے کوامبٹور کا کیتیا (یا غلا) کہتے ہیں یہیں سے جزیرہ نما کا مثلثی سرا بنتا ہے اور اس دور دست خطے میں کردامم کی پہاڑیاں ریڑھ کی ہڈی کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔

وسط ہند کی پہلودار بلندی کو مقابلۃً اور عموی طور پر سطح مرتفع کہنا غلط نہیں بلکہ

عملی فوائد سے بھی خالی نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن شمال میں یہ پہاڑ بھی جو وادیٔ گنگا جمنا کے اوپر بلند اور سیدھے اٹھے ہوئے ہیں بمشکل سے سلسلۂ کوہستان کہلا سکتے ہیں اور جنوب میں مشرقی گھاٹ کا بھی یہی حال ہے۔ اسی طرح مغربی گھاٹ کے پہاڑ گو سمندر کی طرف سے یکایک بہت بلند ہو جاتے ہیں، تاہم دوسری جانب جہاں وہ (دکن کی) سطح مرتفع سے مل گئے ہیں، بہت کم بلند ہیں۔ اور چونکہ وسط ہند اور دکن کا بھی سطح مرتفع ہے جس کی بلندیوں اور نشیبوں سے ہم کو اپنے تفصیلی تبصرے میں زیادہ کام پڑے گا، اس لئے ان کے فرق کو وضاحت کے ساتھ معلوم کرنا ضروری ہے۔

سب سے بلند خطہ نیل گری کا ہے۔ مغربی گھاٹ اپنے مشرقی بھائی سے کافی بلند تر ہے۔ ان کے درمیان کے علاقے کی ڈھلان نمایاں طور پر مشرق کی جانب اور قدرے شمال کی طرف ہے لیکن خط نصف النہار پر پہنچ کر جہاں یہ نام نہاد جزیرہ نما ختم ہو گیا ہے، زمین کی حالت بالکل بدل گئی ہے اور اسی لئے طبعی اور سیاسی دونوں اعتبار سے کشور ہندوستان کے بالکل دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں جن کے باہمی اختلاف کی بحث کو ہم مناسب جگہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ اگر کلکتے سے مغرب کی طرف اور الہ آباد سے جانب جنوب ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو یہ دونوں ایسے مقام پر آکر ملیں گے جو نیل گری کو چھوڑ کر اس سطح مرتفع کا سب سے بلند مقام ہے ہندوؤں کے تیرتھ کی جگہ امر کنٹک یہاں سے قریب ہے اور یہیں میکال کی پہاڑیاں دکن کے ابخرے کو جمع کر کے ہر طرف بارش برساتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف سون ندی شمال کی طرف بہ کر گنگا سے جا ملی ہے۔ دوسری طرف ہسدو وغیرہ مہاندی کی مشرقی دھار کو سیراب کرتی ہیں وین گنگا جنوب میں دور تک جا کے گوداوری میں مل گئی ہے۔ اور ان سب کے خلاف نربدا سیدھا مغرب یعنی خلیج کھمبائت کا رُخ کرتا ہے۔ اس طرح یہ غیر آباد علاقہ جغرافی اعتبار سے نہایت اہم ہے اگرچہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کا کہیں مذکور نہ ہونا ہی اس کا امتیاز ہے۔ البتہ اس کے غرب رُو دریا کی کیفیت بالکل دوسری ہے۔ یہ بڑی ندی یعنی نربدا اور اس کا علاقہ تاریخی اور جغرافی دونوں اعتبار سے قابل یادگار ہیں۔ تاریخی لحاظ سے میں اسے ایک اور موقع پر ہندوستان کا

باب اول

لو آر لکھ چکا ہوں اور اسے اب دُہرا کے تصدیق و توجیہ میں سرِدست یہ لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہی ندّی ہندوستان خاص کو جنوب کے ملک یا دیسیوں کی اصطلاح میں "دکھن" سے جدا کرتی ہے۔ رہا اس کا جغرافی ماحول، تو اس بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ شمال و جنوب کے درمیان صرف ایک نہیں بلکہ پانچ خطوط فاصل موجود ہیں۔ نربدا کا شمالی کنارا ہی بندھیاچل کے مشہور سلسلے کا پہلو ہے اور یہ وہ پہاڑ ہے جس کی شاخیں (میہر، کیمور اور کیمن جوا) سون کے ساتھ ساتھ گنگا کے درشن کو جاتی ہیں۔ دوسرے نربدا کے دوسری جانب ست پڑا کے پہاڑ چھائے ہوئے ہیں جو ساخت کے لحاظ سے بندھیاچل سے الگ ہیں اور نربدا اور اس کی غرب رُو بہن تاپتی کے درمیان حائل ہو گئے ہیں۔ آخری بات یہ کہ تاپتی سے نیچے اُترتے ہی مغربی گھاٹ کا سلسلہ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے اور وہ پہاڑ آ جاتے ہیں جنھیں شمالی گھاٹ کہنا چاہیئے اگرچہ یہ اصطلاح ابھی تک رتبۂ قبول کو نہیں پہنچی ہے۔ بہرحال "ہندوستان" اور "دکھن" کے درمیان یہی مختلف النوع اور عجیب سرحد بنی ہوئی ہے۔ جنوبی سطح مرتفع کی نسبت سرِدست اتنا سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی عام بلندی میں کم و بیش یکساں ہے اگرچہ یہ تصریح ضروری ہے کہ یہ پورا مثلث نما جس کے ایک طرف بندھیاچل اور مشرق میں سرحد گجرات کے پہاڑ، اروَلی پربت اور پھر وادی گنگا کے جنوبی سرحد کی پہاڑیاں ہیں، بہت بلند سرزمین ہے اور ان میں مالوے کی سطح مرتفع خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہے۔ مگر بندھیل کھنڈ کا جنگلی علاقہ ایسا نہیں، اور سب سے کم بلندی (جہاں تک مجھے علم ہے) سون اور کیمور کی پہاڑیوں کے خطے یعنی مشرقی گوشے کی طرف پائی جاتی ہے۔

ہندوستان کے محل و قوع اور نیز اوپر جو کچھ بیان ہوا، اسے پڑھکر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جغرافیۂ ہندوستان کی فروعی خصوصیات اپنے بڑے برّاعظم اور خود اپنی سرزمین (یا زیادہ صحت کا لحاظ ہو تو کہنا چاہیئے کہ جزیرہ نمائے ہند) کی ہیئت اور دوسرے طبیعی حالات کے تابع ہوں گی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ ہندوستان اور اس کا مختص جغرافیہ قریب قریب وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہندوستان خاص، یعنی اس ٹکڑے کی جو ایشیا میں زیادہ پیوست ہے، حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ بہ قول جامع اضداد

نظر آئے گا لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ عام طور پر سب سے اونچے پہاڑ کا رُخ سب سے لمبے میدان کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ ہمالہ کے معاملے میں یہ قاعدہ ہندوستان کی بجائے برّاعظم ایشیا کے پھیلاؤ سے مطابقت رکھتا ہے۔ البتہ جزیرہ نمائے ہند کا رُخ وہی ہے جو یہاں کے مشرقی اور مغربی گھاٹوں کا ہے۔ اسی طرح شمال کے چار بڑے دریا بھی اپنے ماخذ، طول، بہاؤ کے رُخ اور عام خصوصیات کے اعتبار سے خالص "ایشیائی" ہیں بجالیکہ دکھن کی بڑی بڑی ندیاں (سوائے تربدا کے) مشرق کی طرف بہ کر خلیج بنگالہ میں گرتی ہیں۔ ان میں پانی کم، بہاو تیز، پیٹے گہرے اور مرتفع علاقے میں کشتی رانی غیر ممکن ہے۔ یہ دہانوں پر شاخ در شاخ ہو گئی ہیں اور اپنی مٹی سے اس علاقے کو مالا مال کر دیا ہے لیکن عموماً دہانے پر ایسے انبار جمع ہو گئے ہیں کہ پانی رُکتا ہے اور گھنگور بھنور آتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ہندوستان کا صحرائے عظیم جو دریائے سندھ کے مشرق میں ہے اپنے زیادہ مشہور و وسیع تر مغربی حریفوں کا محض اگلا سلسلہ ہے۔ میں یہ اضافہ بھی کر سکتا ہوں کہ مغربی گھاٹ کا سلامی دار اور بلند پہلو محل وقوع، سنگ بستہ سواحل، دامن کے میدانوں کی تنگی، اسی وجہ سے اس پہلو پر بڑے دریاؤں کا نہ ہونا اور چھوٹی پہاڑی ندی نالوں کا کثرت سے ہونا، ان ندیوں کا بہاؤ مشرق کی جانب ہونا پھر مشرقی سواحل پر وسیع نشیبی میدانوں اور شاخ دار دہانوں کا ہونا، یہ سب ایسے طبیعی حالات ہیں جو امریکہ، افریقہ، سویڈن ناروے اور خود ہمارے ملک (برطانیہ) میں بھی قریب قریب بعینہٖ پائے جاتے ہیں۔

بندھیاچل، ست پڑا اور شمالی گھاٹ کے پہاڑ نیز وہ دو دریا جو ان کے درمیان بہتے ہیں صریحاً ایشیا کی بجائے ہندوستان سے زیادہ متعلق ہیں بر این ہم ان پہاڑوں کا رُخ بھی اسی زبردست سلسلۂ کوہستان کی نقل ہے جس کے مقابلے میں یہ بالکل پست نظر آنے لگے ہیں۔

ہندوستان کے بڑے ایشیائی دریا چند امور میں باہم نہایت مشابہ ہیں۔ ان سب کا منبع دنیا کا بلند ترین فاصِل آب ہے جس کے ثبوت میں وہ سب پانی کی کثیر مقدار لاتے، بڑی شدت کے ساتھ بہتے اور بار بار اپنا رُخ اور دھارا بدلنے کا

میلان رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی کثرت سے کھاد لاکر جمع کرتے اور خاص خاص موسموں میں طغیانی پر آجاتے ہیں۔ یہ سب وہ حالات ہیں جن کو پڑھکر ہیرودوٹس کی حیرانی یاد آتی ہے جو اسے نیل کی کیفیت دیکھکر ہوئی تھی اور جن پر نئی دنیا کے دریا بھی مشکل سے سبقت لے جا سکتے ہیں۔

مگر اس مشابہت سے بڑھکر تاریخی اور عمرانی نتائج اور نیز ان دریاؤں کے ذاتی اختلاف کے لحاظ سے ان کے باہمی فرق پر خاص توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ برہم پتر اور سندھ بہت دور شمال میں ہمالہ کے خطے سے نکلتے اور ان پہاڑوں کے اندر سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے سرحد ہندوستان پر میدان میں داخل ہوتے ہیں بظاہر ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے ان کو کوئی سروکار نہیں رہا نہ یہاں کے باشندوں میں محبوب و محترم ہو سکے، جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ برہم پتر تو ہندوستان کے میدانی علاقے کا بہت کم حصہ طے کرتا ہے اور سندھ کے معاملے میں، اوّل تو ہندوستان پر بڑے حملے کرنے والے اسی طرف سے آئے اور ان یورشوں کا لوگوں کے دلوں میں خوف جاگزین ہوا یا ان یورشوں کا نتیجہ شورش، تباہ حالی، بے کاری، افلاس اور ویرانی ہوا۔ دوسرے وادیٔ سندھ کا بڑا حصہ ہمیشہ غیر مزروعہ صحرائی رہا یا آباد ہونے کے بعد اجڑ گیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ باشندوں کے تغافل کو اس میں کتنا دخل ہے بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ صحرائی علاقہ تاریخی زمانے میں اکثر ان قطعات کی طرف پاؤں بڑھاتا رہا جو نسبتہً سرسبز و آباد تھے۔ گرم ممالک میں آب پاشی کے وسائل توڑ دئے جائیں یا ان سے غفلت برتی جائے اور مٹی بھی باریک ہو تو وہاں ویرانی کا یہ عمل سرعت سے جاری رہتا ہے۔ سندھ اور اراولی کے درمیان ریت کے بنجر ٹیلوں کا بھی طویل سلسلہ موجود ہے اور اوپر آگے بڑھیں تو زمین میں شورا پھیلا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں سے جو ندی نالے مغربی جانب بہتے ہیں وہ سب ایک دریا میں آگرتے ہیں جو سندھ تک نہیں پہنچتا بلکہ یا تو ریت میں خشک ہو جاتا ہے اور یا (کچھ کی) بڑی شورے کی جھیل میں آگرتا ہے پنج ند یعنی پنجاب کی پانچوں ندیاں جہاں سندھ سے ملتی ہیں، اس کے آگے مشرق کی طرف کوئی معاون ندی نہیں جس کا عجب نہیں سبب یہ ہو کہ دریائے سندھ مغرب کی طرف اپنی گزرگاہ بدلتا رہا ہے۔ چنانچہ ملک سندھ، اندملی پربت اور صوبۂ اجمیر یا راجپوتانہ کے درمیان سارا علاقہ غیر آباد ریگستان ہے۔

جس میں صرف کہیں کہیں پانی اور سرسبزی نظر آجاتی ہے یہاں پر اتم راجپوت آباد ہیں اور اپنے اسلاف سے جنھوں نے اسی نواح میں سکندر یونانی کا مقابلہ کیا، ابھی تک حیرت انگیز مشابہت رکھتے ہیں۔ ایسے قریبی زمانے یعنی ۱۸۱۹ء کے ایک زلزلے میں بھی دریائے سندھ کا دہانہ یا ڈیلٹا بہت کچھ بدل گیا۔ ممکن ہے اس تمام علاقے کے ویران و بے گیاہ ہونے کا ایک بڑا سبب یہی زلزلے ہوئے ہوں کچھ بھی آتش فشاں پہاڑوں کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر اشارہ کرچکا ہوں، کاٹھیاواڑ اور نیز کچھ کے بے تعلق علاقے کی پہاڑیاں نوعیت کے اعتبار سے اراولی کے آگے بڑھے ہوئے اجزا معلوم ہوتی ہیں۔ اسی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں اقطاع کی وضع دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے اس طرح گول کٹے ہوئے ہونے کی وجہ یہ ہو کہ یہ ماقبل تاریخ زمانے میں سندھ کے شاخدار دہانے کا علاقہ ہوں جب کہ سندھ اپنا زبردست پانی مشرق میں اور آگے تک لاتا اور ایک طرف سمندر اور دوسری طرف نربدا و تاپتی کے متحدہ دریا نیز اور ندیوں سے کشتیاں کرتا تھا۔ ممکن ہے یہ عمل اس وقت تک جاری رہا ہو جب تک کہ یہاں کی پہاڑیاں یا ٹاپو ٹوٹ ٹوٹ کر مٹی بن گئے اور رفتہ رفتہ پھیل کر ہندوستان کے جسم میں ضم ہو گئے۔

پنجاب کی ندیوں کے درمیان کا علاقہ یا دوآبوں کی سرسبزی وزرا بھی یکساں نہیں ہے۔ چنانچہ چناب اور راوی کے درمیان پھر صحرائی علاقہ آجاتا ہے بحالیکہ ستلج و بیاس کا دوآبہ جالندھر جو شمال مشرق کی بلند سرزمین کا انتہائی ضلع ہے۔ نہایت سرسبز و زرخیز ہے۔

گنگا اور اس کی ساتھ کی ندی جمنا سے اتنی انواع و اقسام کی دلچسپیاں مصحوب ہیں کہ محض طبیعی اعتبار سے چند سطروں میں انھیں بیان کیا جائے تو شاعرانہ مبالغہ معلوم ہوگا یہ لکھنا تحصیل حاصل ہے کہ ہندو کے لئے یہ مقدس دریا وہی درجہ رکھتا ہے جو قدیم مصریوں کی نظر میں نیل کو حاصل تھا اور یہ کہ اس کے کناروں پر کثرت سے تاریخی شہر آباد اور مشہور یادگاریں جمع ہیں، لیکن جیسا کہ میں ان شمالی دریائی علاقوں کی نسبت اجمالاً لکھ چکا ہوں، نہریات پر لکھنے والے کے لئے بھی یہ دریا قابل مطالعہ نمونہ ہے۔ ہم گنگا کا ایک واحد دریا کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک جغرافی

اصطلاح ہے جس سے بڑی بڑی ندیوں کا وسیع مجموعہ مراد ہے ان میں سے ہر ندی خود کئی کئی سو میل لمبی اور متعدد ماخذوں سے سیراب ہوتی ہے۔ پھر یہ سب مل کر ہمالہ کے پانی سوتنے کا ایک عظیم الشان اور پیچیدہ نظام بن گئی ہیں اور اسی میں وسط ہند کی سطح مرتفع کی ندیاں آملتی ہیں۔ یہ گنگا کے دوسرے معاونوں سے طول میں کچھ کم نہیں اگرچہ ان کا نظام اتنا وسیع نہیں ہے جتنا شمالی ندیوں کا۔ پھر پانی کا یہ بے حساب ذخیرہ اس ملک میں بہتا ہے جس کے ہر حصے میں اس سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زمین بتدریج اور خوش نمائی کے ساتھ خلیج بنگالہ کی طرف نیچی ہوتی چلی گئی ہے۔ نباتات اور روئیدگی کی ہر جگہ کثرت ہے۔ ہر سال دریا کی طغیانیاں زمین کو پانی دیتی اور بیش قیمت کھاد لا لا کے پھیلاتی رہتی ہیں۔ دریا کے نشیبی حصے میں پانی پرانی جھیلوں اور پہلے کے خشک پیٹوں میں جمع ہو جاتا ہے اور آخر اس خطے میں ختم ہوتا ہے جس کی نسبت ہیرودوتس کا وہ قول صادق آتا ہے جو اس نے نیل کے دہانے کی نسبت لکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں چار چار سو میل تک زمین اتنی گدیلی ہے کہ ایک کنکر تک نہیں مل سکتا۔ اور سرے پر سندربن کی صورت میں وبائی نباتات کی وہ افراط ہے کہ آدمی مشکل سے زندہ رہ سکتا ہے اور ہنٹر کے الفاظ میں، شیر اور تپ وبائی کی اس جولان گاہ میں "فطرت، انسان پر غلبہ رکھتی ہے۔" گنگا کی، جسے یکتا دریا کہنا بیجا نہ ہوگا، بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

اِس کے معاونوں کی کیفیت اور پھیلاؤ کا صحیح اندازہ نقشے کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تاہم ایک دو مثالیں یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ اسے ایک دریا نہیں بلکہ متعدد دریاؤں کا مجموعہ کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا نیپال کے بعید صدر مقام، کھٹمنڈو، کے مشرق سے سن کوسی اور مغرب سے گنڈک بہتے ہوئے آتے اور الگ الگ اس ندیوں کے مجموعے میں مل جاتے ہیں۔ لیکن پہلی کے ساتھ تو اور بھی کئی خاصی بڑی ندیوں کا پانی گنگا میں آتا ہے اور دوسری قریب قریب ٹھیک اسی مقام پر گنگا سے ملی ہے جہاں شمال مغرب سے گاگرا اور وسط ہند سے سون آملے ہیں۔ اسی طرح گاگرا حقیقت میں کئی لمبی چوڑی ندیوں کے مجموعے کا نام ہے اور سون کے معاونوں کی تو تعداد بتانی دشوار ہے۔ اور اوپر، گنگا جمنا کے سنگم سے دوآب خاص کے علاقے میں بڑھیئے تو شمالی ندیوں کا جال اور بھی حیران کن ہو گیا ہے اور جنوبی سطح مرتفع کی بیتوا وغیرہ کئی ندیوں کو چھوڑ دیں تو اکیلا چنبل ندیوں کا ایک لشکر ہے اور

اپنے ذاتی طول میں جمنا کا مقابلہ کرتا ہے۔

واقع میں ہندو کا دریائے سندھ سے ڈرنا اور گنگا کو پوجنا کچھ بیجا نہیں۔ قدرت اور انسان دونوں نے پہلے نام میں خوف و وحشت کا رنگ بھر دیا ہے لیکن دوسرا دریا فطرت کی زندگی بخش اور ہمہ گیر قوتوں کا مرقع ہے۔ ہر زمانے میں حصول معاش اور آمد ورفت کی سہولت، قومی رفاہ اور سیاسی اقتدار اس نام سے منسوب رہے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے ابتدائی حصے میں قسطنطنیہ کے لرزہ براندام باشندوں کے حق میں ڈین یوب جو کام کرتا تھا، سندھ ہندو کے لئے وہی بلکہ اس سے بدتر کر چکا ہے۔ قرون وسطیٰ کے آخری حصے میں فرانس کے سیاسی محاسبوں کی نظر میں جو اہمیت نورمنڈی کو حاصل تھی، وہی بلکہ اس سے بڑھکر وقعت سلاطین دہلی کے وزرا کے نزدیک وادیٔ گنگا کی تھی۔

اس مختصر خاکے میں ان رنگ برنگی اور وسیع بلندیوں کا اجمالی بیان لکھنا بھی مشکل ہے، جو ایک طرف نیل گری سے راج محل کی پہاڑیوں تک اور دوسری جانب ارولی پربت سے مشرقی گھاٹ تک چلی گئی ہیں۔ البتہ چند خصوصیات کا ذکر کر دینا ممکن ہے۔ اس خطے کا بڑا شمال مشرقی حصہ بظاہر ہمیشہ سے بدوی بلکہ بربریت کی حالت میں رہا، اور اب تک ایسا ہی ہے۔ سرسری طور پر یہ گوداوری اور مشرقی گھاٹ سے لیکر مہکال کی پہاڑیوں اور سُبَن ریکا ندی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقے کے اکثر باشندے عہد ماقبل تاریخ کی نسلوں میں ہیں جو سرکش اور وحشی سرداروں کے ماتحت، جنگلوں میں زندگی گزارتے اور معاشرت کے معدودے چند آداب ولوازم رکھتے ہیں۔ جزیرہ نمائے ہند کی تاریخ سے ان کا تعلق بھی بہت کم رہا ہے۔ بخلاف اس کے، ان بلندیوں کا مغربی حصہ شمال سے جنوب تک تاریخی یادگاروں سے مملو ہے اور سکھوں کے سوا تمام اُن دیسی قوتوں کا گہوارہ، مستقر اور میدان جنگ رہا ہے جو قرون گذشتہ میں شہنشاہی کے خواب دیکھتی تھیں۔ ہندوستان کی زندگی کا وادیٔ گنگا سے جس قدر صنعتی تعلق رہا، اسی قدر اس علاقے کا جنگی تعلق پایا جاتا ہے۔ اس کی موجودہ ملکی تقسیم بھی ہر قدم پر اس واقعے کی شہادت دیتی ہے، مثلاً جب جنگجو راجپوتوں کے سوراج بنسی خاندان کو حملہ آور مسلمانوں نے ابتدا میں شکست دی تو

یہ خاندان ہٹ کر اراولی پربت کی مشرقی ڈھلانوں کے دُور دست خطے میں آبسا اور بعد میں یہیں سے وہ قبیلے میدان میں نکلے جنھوں نے خود باہر سے ہندوستان کی سلطنت کے لیئے زور شور کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اسی طرح، گجرات کے سبزہ زار، مغربی صحرا اور اوپر کی سطح مرتفع اب تک بے شمار ایسے ٹھاکروں کے قبضے میں ہے جن کی دلیری، نخوت اور عیاشی، عام اہل ہند کے نمونے سے حیرت انگیز اختلاف رکھتی ہے۔ پھر جس وقت بابری سلطنت میں زوال آیا تو دارالسلطنت کے قریب ہی جاٹوں کی گھٹیا قوم پہاڑی قلعوں میں قوت پکڑ گئی۔ چنانچہ جاٹوں کے قلعے بھرت پور پر ہماری قوم انگریزی کا جتنی بار اور جس قدر جم کر مقابلہ کیا گیا ہندوستان میں اور کہیں نہیں ہوا۔ یہ لوگ ابھی تک اس خطے میں، نیز الور اور مچھیری میں آباد ہیں۔

لیکن جنگ میں محل وقوع کی اہمیت اور کسی پہاڑی قوم کو، جو قابل سردار کے ماتحت ہو، مغلوب کرنے کی مشکلات سب سے بڑھکر مرہٹوں کے حالات سے واضح ہوتی ہیں میں اس بارے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ "مغربی گھاٹ کو گہرے پیٹوں، خطرناک بلندیوں، گھنے جنگلوں اور نیچے کے رُخ، ناہموار و دشوار گذار کوکن نے بڑی شان کا ملک بنا دیا ہے۔ یہی کوہستانی علاقہ تھا، جس کی بدولت (سیواجی) تعاقب کرنے والوں سے بھاگ کر ناقابل دسترس مقامات میں پناہ لے سکتا اور لوٹ مار کا مال لا لا کر محفوظ کر دیتا تھا۔ یہیں اسے اُن جفاکش پہاڑی قبیلوں سے مدد ملتی تھی جن میں وہ پل کر بڑھا اور ابتدائی تاختوں میں انھی کی رفاقت سے کامیاب ہوا اور ان پر کامل اعتماد کر سکتا تھا"۔ فلپ ثانی کے مقابلے میں ولندیزوں کو جو کام ہالینڈ نے دیا وہی فائدہ اورنگ زیب کے مقابلے میں مرہٹوں کو گھاٹ اور کوکن کے پہاڑوں نے پہنچایا۔ اس طرح پہلے تو سلطنت کے مقابلے میں اس عجیب قوم نے اپنی آزادی قائم رکھی اور بعد میں سطح مرتفع کا بڑا علاقہ فتح کرنے پر کمر باندھی چنانچہ نہ صرف راجہ ستارا اور پیشوا، بلکہ گائکواڑ کے سوا ان کے سب بڑے بڑے سرداروں کے مستقر اسی بلند خطے میں بن گئے۔ یعنی سندھیا کا گوالیار میں ہلکر کا اندور میں اور بھونسلے کا

ا۔ "The Mussulman, the Maratha & the European." P. P. 21. 22.

ناگپور میں۔ مرہٹوں کے ذکر میں یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُن کے بدسلیقہ نقال پینڈاریوں نے بھی کام نربدا اور تاپتی کی وادیوں سے لیا تو ہمارے لشکروں کے مقابلے میں انھیں کوئی معقول پناہ میسر نہ آسکی۔ باقی یہ لکھنے کی تو ضرورت نہیں کہ دکن ہی کے وسط میں سلطنت مغلیہ کے صوبیدار نظام کے نام سے پایۂ تخت حیدرآباد میں فرماں روائی کر رہے ہیں۔

اورنگ زیب کے حق میں جو سیواجی تھا، وہی بہت دن تک خطرہ رہا کہ حیدر علی انگریزوں کے حق میں بن جائے گا۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت میں بن گیا تھا۔ اور چونکہ اس مضمون کا ہم انگریزوں کے مستقبل سے اتنا گہرا تعلق رہا، لہٰذا اس سلسلے میں حیدر علی کے ملک کی کیفیت اور انگریزوں کے خلاف اس کی کامیاب میدان داریوں کے اسباب پر چند سطریں لکھنا مناسب ہوگا۔

میسور خاص کی مدود گھاٹ کی جنوبی پہاڑیوں کے چکر سے ملی ہوئی چلی گئی ہیں اور اس طرح گویا ایک مضبوط حصار بن گیا ہے جس کو تین طرف سے تسخیر کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن شمال کا رُخ کھلا ہوا ہے اور وسط دکن سے حملہ کرنے والے اس کو بلا وقت تاراج کر سکتے ہیں۔ حیدر اور ٹیپو سلطان کے وقائع ان جغرافی خصوصیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں۔ نظام حیدرآباد کی تگاہے گاہے کی آمد سے قطع نظر، ان کے شمال میں برابر مرہٹے منڈلاتے اور سرحدوں پر گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ جب موقع ملا ملک کو تباہ وبرباد یا چوتھ وصول کرتے، قلعوں پر قبضہ جماتے اور ایک دفعہ سے زیادہ مرتبہ خاص پائے تخت پر حملہ آور اسے محصور کر لیتے ہیں۔

دوسری طرف، پہاڑیوں کی اوٹ لیکر۔ اپنی بلند زمین کے موقع سے فائدہ اٹھاکر اور فوجی اصطلاح میں، اپنے وسطی مقام کے خطوط داخلی پر حرکت کرکے، اپنے پیچ در پیچ دہن کشادہ دروں کے راستے یہ زیر قدم رہنے والے لوگ انگریزوں کے دل میں اپنی پراسرار دہشت بٹھاتے۔ اپنے حریفوں کی ہر جنبش کو دیکھتے رہتے اور پہلا وار خود کر جاتے۔ وہ اپنی جنگی کارروائیاں آخر وقت تک مخفی رکھتے اور پھر بلا کی طرح یک بیک ٹوٹ پڑتے۔ جزیرہ نما کے ایک طرف سے دوسری طرف تک برابر

چکر لگاتے اور حریف کے علیحدہ علیحدہ لشکروں پر جن کی تعداد اتنی نہ ہو سکتی تھی کہ اتنے وسیع خطے پر مل کر کام کرے، باری باری سے دائیں بائیں ضرب لگاتے رہتے تھے۔

ہندوستان کی وسطی سطح مرتفع کے متعلق میری کتاب میں جس قدر لکھنے کی گنجائش ہے، دکن کی بڑی ندیوں کی نسبت چند سطروں سے اس کی تکمیل ہو جائے گی جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ سب مشرق کی طرف بہ کر خلیج بنگالہ میں آگرتی ہیں لیکن ان میں باہم امتیاز کرنا ممکن ہے۔ ان میں شاید سب سے چھوٹی مہاندی مگر سب سے زیادہ قابل جہاز رانی ہے اور مجموعی طور پر اسی کے دہانے کا رقبہ (= ویلتا) سب سے بڑا ہے۔ نہایت ویران علاقے سے گزرتی ہے۔ بڑے معاونوں سے محروم ہے اور ہندوؤں کے ایک مقدس ترین مقام، یعنی جگناتھ پر سمندر میں گرتی ہے۔ سب سے بڑی ندی گوداوری ہے۔ ایک رخ سے پورے جزیرہ نما کو طے کرتی ہوئی دوسرے سرے تک گئی ہے۔ اس کا منبع بمبئی سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے اور قریب ہی عہد حاضرہ کے شاندار انجنیری کارنامے کا مقام یعنی تھل گھاٹ کا ریلوے کا کٹاؤ ہے۔ یہ ندی آگے بڑھ کر مملکت آصفیہ کی شمالی حد بن گئی ہے (اس کی ایک بڑی معاون ندی پرن ہتا اور نیز شمالی گھاٹ کی پہاڑیاں اس خط سرحدی کو پورا کرتی ہیں) کرشنا ندی میں سب سے وسیع رقبے کا پانی اور بہت سی مشہور ندیاں آملی ہیں۔ ان میں سے ایک بھیما ہے کہ گوداوری کے جنوب میں بمبئی کے عین مشرق سے نکلتی ہے لیکن تنگا، بھدرا اور ہگری میسور کے مغربی علاقے سے نکلی ہیں۔ (اول الذکر دو ندیاں ملکر تم بھدرا یا تنگ بھدرا کے نام سے ممالک محروسہ سرکار عالی کی جنوبی سرحد پر کرشنا میں آگری ہیں) یہی کرشنا جنوب کی طرف ریاست حیدرآباد کی سرحد بناتی ہے یہاں تک کہ آخر میں اور بھی جنوب میں مڑ کر سمندر میں جاگری ہے سب سے آخری ندی کاویری غالباً قطعی طور پر چاروں میں سب سے چھوٹی ہے لیکن انگریزوں کے لئے سب سے بڑھکر دلچسپ تاریخی یادگاریں رکھتی ہے حقیقت میں اس کی گزرگاہ کو اگر دہانے کی طرف سے طے کیا جائے، تو یہ ہندوستان میں برطانی سرگزشت کا مرقع نظر آتی ہے۔ اسی کے دہانے پر ہمارا دیسیوں سے وہ مقابلہ ہوا جو فرانسیسیوں کے ساتھ آیندہ سخت جنگ وجدال کا پیش خیمہ تھا۔ اور اسی جنگ کے نتیجے میں ہم (انگریزوں) نے آیندہ کشمکش کے خیال سے ایک اہم مقام پر قبضہ کرلیا۔ انگریز و فرانسیسی

معرکہ آرائی کا سب سے بڑا مرکز ترچناپلی اسی کاویری کے کنارے آباد تھا۔ ہماری دوسری خونریز جنگ اہل میسور سے ہوئی اور ان کا صدر مقام سرنگاپٹم بھی اسی ندی کے کنارے واقع ہے۔ اسی شہر کی تسخیر سے ٹیپو کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور ہم (انگریز) دکھن کی سب سے قوی طاقت بن گئے۔ پھر جب مرہٹوں نے ہماری مخالفت کی، یا اندر ہی اندر عداوت پر کمر باندھی اور ہمیں دو مرتبہ اپنا حق سیادت منوانا پڑا، تو اس وقت بھی یہ حریف کاویری کی طرح مغربی گھاٹ ہی سے چلا اور فرنگی حملہ آوروں سے لڑنے کے لئے اسی ندی کی طرح آگے بڑھا تھا۔

پالار و پینار کی مثل جنوبی ہند کی چھوٹی ندیاں کرشنا اور کاویری کے درمیان کے علاقے میں پانی لاتی اور کرناٹک کے میدان کو سیراب کرتی ہیں۔

وہ مثلث نما کوہ پارہ جہاں جزیرہ نمائے ہند ختم ہوا ہے، اپنے سے شمالی خطوں کی کئی جغرافی خصوصیات کی نقل ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی پال نی نیل گری کی حریف و مقابل ہے جو پال گھاٹ کے درے یا کوامبٹور کے پیٹے کے دوسری طرف واقع ہے۔ گھاٹ کے بڑے پہاڑوں کی طرح، کردامم کی پہاڑیاں بھی مشرق کی بجائے زیادہ تر مغرب کے ساحل سے ملی چلی جاتی ہیں۔ اسی لئے ٹراونکور کی زمین سلامی دار نہیں تو بہت ڈھلواں اور تنگ ضرور ہے بحالیکہ مدورا اور تناولی کے اضلاع چپٹے میدان ہیں جن سے ویگا وغیرہ ندیاں گزرتی اور مقامی رقبے کی مناسبت سے چھوٹے پیمانے پر وہی عمل کرتی ہیں جو ہم کاویری وغیرہ دکن کی بڑی ندیوں کو کرتے دیکھ چکے ہیں۔ راس کماری سے کچھ فاصلے پر کردامم کی پہاڑیاں دفعتہً دو ہزار فیٹ نیچی ہو گئی ہیں اور خود راس (میرے خیال میں) پانچ سو فیٹ سے کم نہ ہوگی، اس پورے ٹکڑے کو برساتی نالے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں خوب سیراب کرتی ہیں اور اسی لئے یہاں، خصوصاً مغربی پہلو پر نباتات کی بڑی کثرت اور جنگلی درختوں کی وہی خصوصیات موجود ہیں جو ملیبار خاص کے ساحل پر پائی جاتی ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ گذشتہ صدی میں تناولی بھی سالہاسال تک اسی قسم کی خوفناک بدامنی کا آماجگاہ رہ چکا ہے جیسی کہ زیادہ روشن اور وسیع پیمانے پر ساحلی جنگ کے زمانے میں کرناٹک میں پھیل گئی تھی۔ یعنی اس انتہائے جنوب کے علاقے میں بھی پہاڑی سردار، میسوری فوج بے قاعدہ، انگریزوں کے

دیسی سپاہی نواب کرناٹک کے باغی ملازمین اور اعزہ اور محض قسمت آزما سپاہی جو ذاتی اغراض کے لئے لڑتے تھے، باہم کشمکش کرتے رہے۔ یہ اضلاع اب (برطانیہ میں) زیادہ تر اس لئے مشہور ہیں کہ یہاں مسیحیت نے حیرت انگیز ترقی کی اور اس ترقی کی بدولت وہاں کی معاشرت میں بہت کچھ اصلاحیں ہو گئیں۔

سلسلۂ کوہستان کے دوسری جانب انگریزی علاقے کی بجائے ٹراونکور کا رجواڑہ قدامت کی یادگار رہے لیکن انگریزوں کی سیادت وسرپرستی کی بدولت اس نے انگریزی طور طریق جن میں جامعی تعلیم بھی داخل ہے، اختیار کر لئے ہیں اور دیسی ریاستوں کے لئے قابل تقلید نمونہ نظر آتا ہے۔ اسے انگریزی حکام نے بدویت سے نکالکر اس درجے پر پہنچایا لیکن اپنا لقمہ نہیں بنایا جیسا کہ گذشتہ صدی میں ٹیپو کی ہوسِ ملک گیری قریب قریب بنا چکی تھی۔

ساحلی علاقے اور اس کے اور گھاٹوں کے درمیان کے نشیبی میدانوں کی کیفیت ضمناً اوپر بیان ہوئی لیکن اپنی گنجائش کی مناسبت سے، ان کا عمومی حال بیان کر دینا مناسب ہوگا اگرچہ اس میں مکررات کو گوارا کرنا پڑے۔ مغربی گھاٹ کے پہاڑ اتنے ممتاز مسلسل اور قریب قریب خطِ مستقیم میں واقع ہیں کہ ان میں اور مشرقی گھاٹ کی پست ومقطوع اور ٹیڑھی پہاڑیوں میں نمایاں فرق ہے۔ اسی طرح مغربی گھاٹ سمندر سے قریب اور مشرقی نسبتہً بہت دور ہے۔ یہ معلوم کرنا بھی دشوار نہیں ہے کہ مغربی نشیب اکثر مقامات پر بالکل میدانی نہیں ہیں بحالیکہ مشرقی زمین کا بڑا حصہ دریا برار ہے۔ یہ اور اضافہ کر دینا چاہیئے کہ کوہستانِ ہمالہ میں ذیلی یا پست شاخوں کا سلسلہ اور ان کے سروں پر چوٹیاں، یہ دہری ترکیب مشرقی گھاٹ کے بڑے حصے میں بھی پائی جاتی ہے۔ دکن کی ندیوں کے دہانے بھی سرسبزی میں (اگرچہ چھوٹے پیمانے پر) وادیٔ گنگا کی زرخیزی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن ساحل کی کیفیت یہ ہے کہ دہانوں کے اٹ جانے اور پھر تمام مشرقی کنارے پر سخت بھنور پڑنے کے باعث مہاندی سے راس کماری تک ایک بھی اچھی بندرگاہ نہیں ہے۔ مغربی ساحل بھی اس بارے میں کچھ بہتر نہیں کیونکہ گو جنوبی حصے کے سوا یہاں بھنور نہیں پڑتا لیکن ساحل کی ساخت ایسی ہے کہ کشادہ اور محصور بندرگاہوں کا ہونا غیر ممکن ہوگیا ہے۔ بے شبہہ

کھاڑیاں موجود ہیں مگر یہ خطرناک گودیاں ہیں، حتیٰ کہ بمبئی جو اپنی پہاڑیوں سے دنیا کا نہایت خوشنما بلکہ شاندار نظارہ پیش کرتی ہے۔ جہاز رانی کے لئے ایسی سہل نہیں ہے جیسا کہ شاید کوئی ناواقف مبصر خیال کرے۔

اہل ہند کے دل میں سمندر کی جو دہشت اور نفرت بیٹھی ہوئی ہے اس کا سبب کس حد تک اچھی بندرگاہوں کا نہ ہونا ہے؟ اس کا یہاں صحیح اندازہ میں نہیں لگا تا البتہ اس چیز نے موسمی (برشگالی) ہوا کے ساتھ ملکر انگریزوں فرانسیسیوں کی لڑائی کی رفتار پر جو اہم اثر ڈالا، اس کا ایک اور موقع پر تذکرہ کر چکا ہوں ؏۱"

اسی طرح ہندوستان کے جغرافئے کے اس سرسری تذکرے میں بھی، ملیبار کی بعض خصوصیات فراموش کرنی نہ چاہئیں، جہاں صحیح معنی میں کوئی ساحلی میدان ہی نہیں

؏۱۔ "لیکن بری جنگ میں سب سے سخت دشواری اور بحری سعی میں پوری رکاوٹ برسات (مان سون) سے پڑ جاتی تھی جس کا کورومنڈل کے ساحل پر اکتوبر سے دسمبر تک دور دورہ رہتا ہے۔ اس کی آمد عموماً برق وباراں کے خوف انگیز طوفانوں سے ہوتی ہے۔ آناً فاناً ندی نالے چڑھ جاتے اور زور شور سے بہنے لگتے ہیں۔ پانی کی گہری گزرگاہیں بھر جاتی ہیں اور باقی زمین بھی کبھی جھیل اور کبھی دلدل رہ جاتی ہے۔ اس بھیانک موسم کی تکلیف دہ ٹھر، تیز ہوا اور فضا میں ہر طرف سیل کی کیفیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہو۔ اسی عالم میں وقت بے وقت تیز اور تپتی دھوپ نکل آتی ہے اور مجموعی طور پر دیسی ہو، یا فرنگی سب کی صحت پر بہت ہی ناگوار اثر پڑتا ہے۔ ساحل پر بندرگاہیں نہیں بلکہ بھنور کے زور سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ اور برسات میں یہ بھنور اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے۔ پس جہازوں کو برسات شروع ہونے سے قبل ساحل چھوڑ کر دور پناہ لینی پڑتی یا یہ خطرہ برداشت کرنا پڑتا ہے کہ لنگر اندازی کی حالت میں ساحل پر موجیں ان کے ٹکڑے اڑا دیں یا یہ کے بیچ سمندر میں رہ کر سخت ترین طوفانی موسم کی آفت جھیلیں۔ یہ اسباب تھے کہ یہاں کے (فرنگی) آبادکاروں کو سال کی اس چوتھائی میں صرف اپنے وسائل یا محض تقدیر پر بھروسہ کرنا پڑتا اور وہ اس خاص (جہازی) مدد سے بالکل محروم ہو جاتے جس پر نہ صرف ان کی جنگی استعداد بلکہ اس دور دست پردیس میں، زندگی کا انحصار تھا۔"

(اقتباس از دی مسلمان۔ صفحہ ۴۵)

بلکہ سمندر اور گھاٹ کے پہاڑوں کے درمیان زمین کی ایک تنگ پٹی واقع ہے جو سمندر کے اندر آجانے کی وجہ سے جگہ جگہ سے شکستہ اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے تا آنکہ ابتدائی مگر زیادہ جنگلی قسم کی بلندیوں کے بعد وہ یک بہ یک اچھلتی اور بالکل سیدھی، خوفناک کراڑوں اور چوٹیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے میں بیان کرنے کی کوشش نہ کروں گا کیونکہ اس کا حسن اور سطوت سمجھنے کے لئے اسے دیکھنا لازمی ہے۔ ان پہاڑیوں پر شاندار جنگل کھڑے ہیں جن کا سلسلہ غیرآباد دامنوں تک پھیلتا ہے اور بالائی سطح مرتفع کے ساتھ ساتھ میلوں تک ان کا طلسمی اور پر فریب سایہ چلا جاتا ہے۔ پہاڑ کے پہلوؤں سے بے قرار نالے کودتے پھاندتے، پھلتے، چکر کھاتے ساحل کی ناہموار کھنڈیلی سطح کو طے کرتے ہوئے، سمندر کی طرف، سر کے بل چلے آتے ہیں اور وہ نالے جو خشک موسم میں خالی پڑے تھے، بارش کے آتے ہی چند گھنٹوں میں گہرے تیز و تند اور ناقابل عبور سیلاب بن جاتے ہیں۔ اس علاقے کے طوفان برق بھی غضب کے شدید ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح پانی کے تریڑے اس تیزی اور فراوانی کے ساتھ پیہم پڑتے ہیں کہ ہندوستان کا کوئی اور حصہ بالکل مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایک دیسی کہاوت ہے کہ ملیبار میں نو مہینے برسات رہتی ہے۔ ملک کے بہت بڑے حصے میں سڑکیں بالکل نہیں ہیں۔ زمین کی حالت اور جنگل کی کثرت ہی سڑکیں بننے کے مانع ہے۔ غرض (دوبارہ بکل کے بقول) یہاں فطرت انسان پر غالب ہے۔

باب دوم

متقدّم سلاطین مغلیہ

سلطنت مغلیہ کا بانی، بابر، باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی جانب سے چنگیز کی اولاد میں تھا۔ بابر کی ابتدائی زندگی بھی بایزید کے فاتح (یعنی تیمور) سے جس کا گبنؔ نے نقشہ کھینچا ہے، کافی مشابہت رکھتی ہے۔ بارہ سال کی عمر تھی جب کہ باپ کی وفات سے وہ وادیٔ سیر یا قدیم جیحوں کی ریاست فرغانہ کا وارث ہوا۔ آئندہ دس سال کی کشمکش اور قسمت آزمائیوں کو خود اس نے کمال خوبی سے بیان کیا ہے اور اس میں ایک من چلے بانکے کی، شاندار پیمانے پر جاں بازیوں کی داستان کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ محنت کش جسم، لڑکپن میں غیر معمولی پختگی اور گوناگوں قابلیتیں ہار نہ ماننے والی مستعدی، تیز مشاہدۂ فطرت کے عجائبات، نوادر اور خوبصورت چیزوں سے سچی دلچسپی، گرمجوشی، زندہ دلی، اور مصائب و مشکلات میں بھی پرجوش رہنا یہ سب نہایت دلکش پیرایے میں اس کی تزک سے عیاں ہیں۔ مزید برآں اپنی پے در پے فتحوں، شکستوں، بال بال بچ نکلنے اور جان پر کھیل کر کام کر گزرنے کے واقعات کو

باب دوم

وہ ایسی طرز تحریر میں لکھتا ہے کہ ایک وحشی تاتاری کے متعلق عام تصور سے اسے مطلق مناسبت نہیں اور ان کو پڑھنے سے اس پرانی کہاوت کی تمثیل ملتی ہے کہ واقع میں اکثر اوقات حقیقت، افسانے سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔

آخر کار ازبکوں کے غلبے نے اسے ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا۔ وہ شکست کھا کر چیدہ جاں نثاروں کی جماعت کے ساتھ جنوب کی طرف روانہ ہوا مگر اس انتشار میں بھی ہمت اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا چنانچہ مملکت کابل پر تصرف کرتے ہی عجیب دلیری سے، یہ منصوبے باندھنے شروع کئے کہ ہندوستان میں اپنے جدّ امجد تیمور کے کارناموں کو پھر دہرایا جائے اگرچہ اس مرتبہ وہ اتنے سخت اور خوف انگیز نہ ہوں جیسے تیمور کا حملہ تھا۔

ہندوستان میں اس وقت قدیم سلطنت کا شیرازہ بکھرے ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی اور حسب معمول اس کے کھنڈروں پر بہت سی بادشاہیاں الگ الگ قائم ہو گئی تھیں ایک۔ افغان فرماں روا دہلی پر حکومت کرتا تھا۔ وہ جفاکش اور آزمودہ کار حملہ آوروں کی سیل بے پناہ کو نہ روک سکا۔ پھر ایک ہندو راجہ نے خود اپنی قوم یعنی جنگجوئی میں مشہور، راجپوتوں کا بڑا بھاری لشکر فراہم کیا اور اپنی حکومت جمانے کے لئے لڑنے آیا۔ وہ سولہ پشت کا راجہ اور سولہ لڑائیوں کا سورما تھا۔ لیکن یہاں بھی بابر کا اقبال غالب آیا۔ بابر کا تسلط جم گیا اور اس کی بنیاد صرف جبر و تشدد پر نہیں بلکہ مفتوحوں کے ساتھ حسن سلوک پر قائم تھی۔ اس تسلط کو دفع کرنے یا اس کے استیصال کی آیندہ جو کوششیں ہوئیں، وہ بھی ناکام رہیں۔ ٹھیک اس زمانے میں جب کہ یورپ میں قرون وسطیٰ کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے اور چارلس پنجم کے عہد نے مغربی دنیا کی ترمیم اور تقویم جدید کے وسیع امکانات پیدا کر دیئے ہیں، وسط ایشیا کا یہ غریب الوطن ہندوستان میں اپنا تخت سلطنت کا پایا جما رہا ہے۔ اس نے چند ہی سال کے عرصے میں ایک طویل زندگی کے تجربے اور کارنامے جمع کر لئے تھے لہٰذا وفات بھی اسی کے مناسب عجیب طریقے پر واقع ہوئی کہ وہ اس کامل عقیدے کے ساتھ جان سے گیا کہ میں نے اپنی جان اپنے بیٹے کے عوض نذر کی اور قضا و قدر نے اس نذر کو قبول کر لیا۔

چند لفظوں میں بابر کی سرگزشت یہ تھی۔ وہ تاریخ کی نہایت دلفریب شخصیت ہے۔ الفنسٹن رائے ہے کہ ایشیا میں اتنا قابل ستائش بادشاہ کبھی مسند فرماں روائی پر متمکن نہ ہوا تھا۔ اور جو لوگ اسے محض وحشی فاتح کہکر بھول جانا چاہتے ہیں، بہتر ہے کہ وہ لارڈ جیفری کا وہ مضمون پڑھیں جو تزک بابری کے ایک عمدہ انگریزی ترجمہ شائع ہونے کے موقع پر، اس نے "اڈن برو ریویو" (Edinburgh Review) میں بابر کے حالات پر قلمبند کیا ہے۔

اگر بابر کی خود نوشتہ سوانح میں داستان کا مزا ہے، تو اس کے بیٹے ہمایوں کی زندگی بھی عجیب عجیب مصائب، خوفناک حادثات، ذرا ذرا سی، مایوسیوں اور انوکھی پریشانیوں کی بدولت مبالغہ آمیز داستان غم بن گئی ہے۔ اس کی تزک خود اس کی لکھی ہوئی نہیں لیکن ایک ہمعصر اور گرم و سرد حالات کے رفیق نے اسے قلمبند کیا تھا۔ ہمایوں کی زندگی کو چارلس ثانی سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن غالباً نورمنڈی کے روبرٹ یا شاہ اسٹیفن کے حالات اس سے مشابہت کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ بادشاہ ہوتے ہی اسے تلوار کے زور سے اپنا حق فرمانروائی منوانا پڑتا ہے۔ وہ کمال دلاوری، نیز حیرت انگیز (لیکن غیر مستقل) مستعدی کا ثبوت دیتا اور ابتدا میں نمایاں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کی ذاتی کمزوریاں، حالات کی طبعی دشواریاں بھائیوں کی بے وفائی اور ہوس پرستی، خصوصاً کامران کی جس نے ہمایوں کی فوجی قوت کے ماخذ یعنی کابل کو غصب کر لیا اور ہمایوں بھائی سے فوری جنگ نہ چھیڑنے کی خاطر اس سے دست بردار ہو گیا، نیز اس کے افغان حریف شیر خاں کی قابلیت، یہ سب اسباب اس کو تباہی میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ پے درپے ہزیمتیں پاتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر لڑنے اور گئی ہوئی قوت واپس لینے کی سعی کرتا اور ناکام ہوتا ہے قید یا موت سے بچ بچکر نکلتا اور ہندوستان کے صحرائے عظیم میں شدید تکلیفیں اٹھا کر یہ معزول بادشاہ شاہِ ایران کے دربار میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں کا پر نخوت بادشاہ سرپرستی کے ساتھ ساتھ توہین و تعدی سے پیش آتا ہے اور ہمایوں کو امداد حاصل کرنے کی امید میں شیعوں کا اگر عقیدہ نہیں تو بھیس ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آخر، مصائب سے خستہ و آشفتہ، ایرانی امداد کے ساتھ وہ ہندوستان واپس آتا اور راستے میں کامران سے بدلہ لیتا ہے

باب دوم

کیونکہ ہمایوں کی دانست میں یہی بھائی اس کی ساری مصیبتوں کا اصلی باعث ہوا تھا۔ پھر وہ آگرہ، دہلی اور قریب کا تھوڑا سا علاقہ واپس لیتا اور تھوڑے دن بعد ایک حادثے میں چوٹ کھا کر فوت ہو جاتا ہے۔ وہ ہرگز معمولی آدمی نہ تھا۔ بعض فرنگی اس کی دلی تعریف نہیں تو کافی ادب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ بابر کے زمانے میں اس نے جنگی ناموری حاصل کی۔ اس کو عمدہ اوصاف ملے تھے اور بظاہر ابتدا میں وہ بے رحم آدمی نہ تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ اس کی سیرت اور اس کی سرگزشت اپنے باپ اور اس سے بھی زیادہ نامور فرزند (اکبر) کے تقابل میں ہونے سے بالکل نگاہ سے گر جاتی ہے۔ اس کی مستعدی بھی دوری تھی، اور وہ خلقی طور پر کاہل اور تعویق پسند تھا۔ اس کی نیک مزاجی بھی صرف چارلس ثانی کی سی نیک مزاجی تھی۔ ورنہ وہ خودغرض، متلوّن مزاج، دوسروں کی راحت و تکلیف سے بے پروا، شیخی خورا اور بدگمان آدمی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص مسلسل جنگ و مخالفت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور نہ متضاد و مخالف اغراض میں وحدت و آشتی پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے جس کے لئے سیاسی ایثار و بے غرضی سب سے ضروری شرط ہے۔ دوسرے اس میں جوش یا احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی صفات نہ تھیں اس کے رفیق برابر ساتھ چھوڑتے رہتے اور ملازم تک بے ادبی کر گزرتے تھے۔ یہ تو اس کے پہلے پُرشور عہد کی کیفیت ہے۔ بعد میں جب وہ دوبارہ سلطنت کا مالک ہوا تو اس کی سیرت کے تاریک پہلو ظاہر ہوئے جسے غالباً گذشتہ مصائب کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ اگر وہ اور زندہ رہتا اور کامران و شیر شاہ سے (جو مر چکے تھے) زحمت و ایذا کا اندیشہ نہ ہوتا اور اس کی بادشاہی بلاخرخشہ قائم ہو جاتی تو بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی حالت بہتر ہو جاتی۔ غرض ہر قسم کی رعایت کرنے کے بعد بھی ہمایوں کی تعریف کرتے تو بن نہیں پڑتی البتہ اس کی مصائب اور قسمت آزمائیاں عبرت اور دلچسپی سے خالی نہیں ہیں اور اس بات کے بہت ہی نمایاں قرائن موجود ہیں کہ اس کے جانشین نے جس طرح عاقبت اندیش، مستقل مزاج اور فیاض فش بابر کے کامیاب و پسندیدہ نیز عاقلانہ طرز عمل سے سبق لیا اسی طرح ہمایوں کی غلطیوں اور ان کے افسوسناک نتائج دیکھ کر بھی بہت کچھ سیکھا ہو گا۔

ہمایوں کے عہد میں نوخیز سلطنت کا یک بہ یک بیٹھ جانا، حیرت انگیز نہیں تو

حسرت آمیز ضرور تھا، لیکن اس کے فرزند کے زمانے میں اس کا دوبارہ قائم، وسیع اور مستحکم ہوجانا بھی تاریخ کا کچھ کم عجیب و دلکش واقعہ نہیں ہے۔

بابر، کورنٹس کی مثل، بہت کامیاب قسمت آزما بھی اس قدر زندہ نہ رہنے پایا کہ نظم و نسق کی اہلیت ثابت کر سکتا۔ البتہ اس کی شہرت، شرافت اور دوست و دشمن کے ساتھ مناسب سلوک، اخلاف کے واسطے نیک مثال بنے رہے اور اسی مسلک پر پوتے نے چلکر زیادہ پائیدار نتائج بہم پہنچائے۔

اکبر اس خاندان شاہی کا شارل مین گزرا ہے۔ نظام سلطنت کے ممتاز و نمایاں اجزا کا بانی وہی تھا۔ اس زمانے کے حالات کے مطابق، بدنظمی میں نظم پیدا کرنے کی وہ قدرتی صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی متفرق رعایا کے دل و دماغ پر ایک ایسی مضبوط و دیرپا سلطنت کا، جیسی کہ اس وقت ممکن تھی، نقش قائم کرنے کی اس میں خاص قابلیت تھی اگرچہ دوسری دشواریوں کے علاوہ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ نہ معلوم اس کے اخلاف کس درجہ اہل اور قدرشناس ثابت ہوں۔ بذاتہٖ وہ طاقتور، ورزشی، جفاکش جسم کا آدمی تھا جسمانی اور دماغی اعتبار سے غضب کا مستعد، من چلے پن کی حد تک دلیر، فنون سپہ گری کا دلدادہ جنگ میں بہت ہوشیار، پیش قدمی کرنے والا، مصائب سے نہ گھبرانے والا اور سرکش و جاہ پسند ماتحتوں پر پورا قابو رکھنے والا تھا۔ اسی کے ساتھ اعتدال و ضبط خلوص و انصاف، تدبر و کامل فیاضی سے متصف تھا۔ اسے صرف سلطنت کی حدود بڑھانے اور امن امان قائم رکھنے کی فکر نہ تھی بلکہ رعایا کی مادی، دماغی اور اخلاقی فلاح و بہبود کا بھی برابر خیال لگا رہتا تھا۔ اس طرح، اپنے خصائل اور کارناموں کے اعتبار سے وہ مقدس سلطنت رومہ کو دوبارہ قائم کرنے والے، مشہور و معروف فرنگی فرماں روا (شارل مین) کا نہ صرف مثیل ہوتا بلکہ حقیقت میں بعض لحاظ سے اس سے بھی فائق حریف اور سلاطین مغلیہ بلکہ شاید تمام ایشیائی سلاطین میں سب سے افضل و بہتر بادشاہ گزرا ہے۔

شروع ہی میں اس کی مدد اور تربیت، باپ کی سرپھری فوج کے ایک لائق مگر سخت گیر و تحکم پسند سردار نے کی لیکن ابھی اٹھارہ سال ہی کی عمر تھی کہ وہ آزاد ہوگیا اور حکومت کی باگ بالکل اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ پندرہ سال مسلسل اور شدید شمشیر زنی میں گزارے کہ وہ ممالک جسے وہ اپنے خاندان کا ورثہ سمجھتا تھا، زیر نگیں آجائیں۔ اس

طویل وصعب کشمکش میں اس نے اعلیٰ درجے کے جنگی اوصاف، جانبازانہ مردانگی، اور شجاعانہ شرافت کے وہ جوہر دکھائے کہ دلوں کو مسخر کر لیا۔ اسی کے ساتھ دشمنوں سے مخلصانہ و مصلحت آمیز رحم وکرم کا برتاو کیا جس میں بے رحمی اور غضب کے جذبے کا نشان تک نہ تھا۔ ایک ہیندو رئیس کے سوا، جو گجرات کے جنگلوں اور بیابانوں میں چھپ چھپ کر اسے پریشان کرتا رہا۔ اور سلطنت کے جس قدر دعویٰ دار نربدا کے شمال میں تھے، سب کو اس نے پوری طرح مغلوب ومطیع کیا اور ہندوستان خاص کا تمام علاقہ اس کے زیر نگیں آگیا۔ قندھار وکابل کا دوبارہ الحاق کیا گیا۔ کشمیر کی تسخیر عمل میں آئی جو سلاطین مغل کے لئے پربہار شملہ بن گیا۔ افغانستان کے شمال مشرقی قبائل سے اس کے سپہ سالاروں کو سخت زک پہنچی جس کے حالات بہت کچھ اُس خوفناک تباہی سے مماثل تھے جو ہم (انگریزوں) کو اسی سرحد پر اٹھانی پڑی۔ لیکن بادشاہی افواج کی شکست کے بعد اکبر نے پہاڑ کے ان ابدی سرکشوں کو کسی حد تک مغلوب ومطیع کر لیا۔ دکن میں برار وخاندیس شاہی صوبے بنا لئے گئے۔ طویل اور یادگار مدافعت کے بعد پائے تخت احمد نگر مسخر ہوگیا اور اس ریاست (نظام شاہی) کی بنیادیں ہل گئیں گو اس کے الحاق کی تکمیل کچھ عرصے کے بعد ہوئی تھی۔

عہد اکبری کی یہ کافی وسیع اور زبردست جنگی فتوحات تھیں۔ اس کشور کشائی میں خود اکبر یا اس کے سپہ سالاروں کو پوری قوت سے تلوار چلانی پڑی لیکن جو ملک ایک دفعہ فتح ہوئے پھر ان کو دوبارہ فتح کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، بلکہ قلعوں کی تعمیر اور ایک جرار لشکر کی از سرنو تنظیم تیاری اور بہ احتیاط معائنے، باقاعدہ تنخواہ یابی کی بدولت نیز جنگ کے فن اور آلات میں کارآمد جدتوں سے جو خود بادشاہ سے منسوب کی جاتی ہیں، ممالک مفتوحہ پر قبضہ قائم رہا۔ مگر اس سچے سورما بادشاہ کا دل امن ہی کے پُر فلاح کاموں میں پڑا تھا۔ وہ اگر دعویٰ کرتا کہ

"یہ فتوحات امن ونجات کا پیام ہیں، ہم ایک دوسرے کے بھائی،
ایک آدم کا کنبہ ہیں"

تو اس قول میں کوئی تصنع اور تعلی نہ ہوتی۔ کیونکہ آیندہ اس نے فی الواقع کامل انصاف کے ساتھ ایسی شخصی حکومت کی کہ اپنی تمام رعایا کے حق میں ان کا بزرگ وسرپرست ثابت ہوا۔ موزوں صوبہ دار و وزرا بہت احتیاط سے منتخب کئے اور ان پر ہر وقت پوری نگرانی رکھی۔

طرح طرح کے غیر ضروری اور تکلیف دہ محاصل، خصوصاً وہ جن کا بار غریبوں پر پڑتا تھا، منسوخ کر دئے۔ مالگزاری کے طریق کی ایسی اصلاح کی کہ براہ راست حکومت کو زیادہ روپیہ مل سکے اور کاشتکاروں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے۔ سکے کی اصلاح کی۔ افادۂ عام کی غرض سے عمارتیں بنائیں۔ باقاعدہ اور زود رو ڈاک کا انتظام کیا۔ ہر طبقے کے واسطے ورزشی کرتب، حیوانات کے جوش انگیز مقابلوں کے تماشوں کا سامان بہم پہنچایا جن میں کچھ نہ کچھ میدان جنگ کی لڑائیوں کا مزا آتا تھا۔ فوجی اور دیوانی خدمات میں ہندو مسلمان دونوں کو یکساں جگہ دی۔ دربار شاہی کی شان و شوکت کے ساتھ خیال رکھا کہ بادشاہ تک سب کی رسائی ہو سکے چنانچہ اس کے طویل عہد جہاں بانی میں دربار کی پاسبانی اور شرکت میں ہر قوم و زبان اور ہر مذہب و ملت کے لوگ موجود رہے مگر (کہتے ہیں) جن لوگوں کو اعزاز باریابی بخشا جاتا تھا، ان سے بھی وہ ایسی نذریں اور تحائف لینے سے اِبا کرتا تھا جو لینے والے کو اندھا اور دینے والے کو بھوکا بنا دیتے ہیں اور جن کا اُس زمانے میں عام رواج تھا۔ مسلمان سرداروں سے اس کا برتاؤ فیاضانہ تھا اور ہندوؤں پر اُس نے اپنا تسلط اس طرح قوی کیا کہ بہادر و باوفا راجپوتوں پر خاص عنایتیں کیں اور ان کے قدیم و عالی نسب خاندانوں کی لڑکیوں سے شادی بیاہ کا طریقہ جاری کیا۔ مذہبی جور و تعدی اور فرقہ بندی کے تعصبات کا سدّ باب کیا اور اپنے دربار کی، ممتاز اہل علم و قلم اور اساتذہ سے زینت بڑھائی۔ عام دماغی تربیت اور مدارس کو ترقی دی، خصوصاً مختلف مذاہب کے علوم، دوستانہ مناظرے اور فلسفیانہ رائے زنی کی سرپرستی کی۔ اور یہ سب وہ اسباب تھے کہ واقع میں اکبر شارلمین کی غیر فانی شہرت کا مدّ مقابل ہو گیا۔ اس سرزمین پر جسے قوت بازو سے حاصل کیا تھا، مضبوطی سے قابض رہا۔ نئے آئین اور ادارے وضع کئے اور ایک ایسی روح پھونک دی کہ اس کی وفات کے بعد ایک صدی تک سلطنت کا دم جسم قائم رہا۔ رعایا اس کا احسان مانتی رہی اور نوع انسان کی آئندہ نسلوں میں اس کا نام عزت و احترام سے یاد رہا۔ یہ جلیل القدر بادشاہ اعلیٰ درجے کا تربیت یافتہ تھا مگر اس کے قلم کی ایک سطر بھی محفوظ نہیں رہی[1]

[1] فرشتہ کہتا ہے کہ اکبر نے شعر لکھے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ اس کے بعد بھی محفوظ رہے یا نہیں؟

باب دوم

البتہ اس کے محبوب دوست اور مداح شیدائی، ابوالفضل نے اس ہارٹ کا کام دیا اور اکبر کی سیرت کے علاوہ آئین اکبری تالیف کی جو سلطنت کے نہایت بیش بہا اور قابل وید حالات پر مشتمل ہے۔ مقامی حالات، انتظامات، فوجی اعداد و واردات، دربار کے جملہ کارخانوں کی کیفیت، بادشاہ کے اصول حکمرانی، عمّال کے نام ہدایات اور مزاج وخصائل کے متعلق بے شمار کارآمد جزئیات اس کتاب میں ملتی ہیں۔ پھر دوسرے ماخذوں کے علاوہ اس کے بیٹے جہانگیر کی تزک سے بھی اکبر کی سیرت اور عہد بادشاہی پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

اس تمام معلومات کو پیش نظر رکھکر بھی یہ مسئلہ ایک حد تک لاینحل ہے کہ اکبر نے جو مخلوط مذہب اختیار کیا، اس کی خصوصیات کہاں تک خود اس کے فلسفیانہ مزاج کی مظہر اور کس حد تک سیاسی دوراندیشی پر مبنی تھیں۔ اس کے باپ کا مجبوراً شیعہ مذہب اختیار کر لینا بھی ممکن ہے کسی حد تک اکبر کی آزاد خیالی کا سبب ہوا ہو۔ راجپوتوں سے اپنے اختلافات کم کرنے اور انھیں اپنا ہم رنگ بنانے کی اسے خصوصاً بہت فکر تھی۔ لیکن یہ باور کرنا دشوار ہے کہ اس کے یہ سب کام محض سیاسی مصلحت کی بنا پر تھے۔ حقیقت میں اسے خود مذہبی مسائل سے دلچسپی تھی اور اخلاق کی خوبی اور معقولیت کے ساتھ تقویٰ، خواہ کسی پیرایے میں ہو، پسند تھا۔ اسی طرح ایسی غیر معقول خود پسندی جو اس کی رائے میں نہ صرف فساد انگیز بلکہ بیجا ضد اور خود رائی تھی، اسے وہ دل سے ناپسند بھی کرتا تھا۔ بہرحال اکبر کے عقائد اور مذہبی طرز عمل ایسا پریشان کن معمّا ہیں کہ ان کا غور و مطالعہ شاید انھی لوگوں کو ضروری محسوس ہوگا جو تھیوڈرک اور شہنشاہ فریڈرک ثانی کی روحانی کیفیات اور نیتوں کا حال تولتے اور ان کے متعلق وثوق و قطعیت سے رائے لگانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اتنا البتہ خاصی طرح یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ اکبر بظاہر احوال مسلمان مرا مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان ظاہری رسوم کی خلاف ورزی نہ کرنے سے اصل مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔

اکبری ضوابط کی خوبی کی آیندہ دو جانشینوں کے عہد میں بخوبی تصدیق ہو گئی۔ یہ سچ ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں بعض اوقات پریشانیاں لاحق ہوئیں اور شرقی مطلق العنانی کے بہت سے معروف و بدنما خصائص کا بھی ظہور ہوا۔ شروع ہی میں ایک بیٹے نے بغاوت کی اور گو ناکام رہنے کے بعد اس کی جاں بخشی کر دی گئی لیکن وہ اسیری کی

حالت میں مرا اور اس کے رفیقوں کو تعداد کثیر میں وحشیانہ سفاکی سے مروا دیا گیا۔ عہد حکومت کے آخر میں دوسرے بیٹے، یعنی خود آیندہ بادشاہ، شاہ جہاں کو بغاوت کرنی پڑی کیونکہ اس کی بجائے ایک اور چھوٹے بھائی کو تخت نشین کرنے کی صاف صاف تدبیریں اور شاہ جہاں کو طرح طرح سے دق کیا جا رہا تھا۔ اس ہنگامہ خیزی کا اصلی سبب نور جہاں کا بے حد رسوخ و اثر تھا کہ اس شہرۂ آفاق ملکہ کا قصّہ جس قدر حیرت انگیز یا حسن و جمال غیر معمولی تھا، کردار و مزاج کے اعتبار سے وہ ایسی نہ تھی۔ اس نے باپ بیٹے میں بس کا بیج بونے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اسی کی بدولت جہانگیر اپنے ایک سب سے قابل و ذی اقتدار امیر سے بدگمان ہوا اور بُری طرح پیش آیا اسی بنا پر اُس امیر نے یک بہ یک خود بادشاہ کو لشکر گاہ شاہی کے وسط میں حراست میں لے لیا۔ بارے چالاک و حوصلہ مند ملکہ اپنے سرتاج کو اس آفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ بایں ہمہ جہانگیر ان تشویش انگیز مناظر کا زیادہ متحمل نہ ہوا اور اس کی وفات پر شاہ جہاں مالک تاج و تخت ہو گیا۔ ساتھ ہی ملک میں نور جہاں کی شہرت بھی ختم ہو گئی۔

جہانگیر کے عہد میں قندھار بھی جو ایران و ہندوستان میں برابر وجہ مخاصمت چلا آتا تھا، ہاتھ سے نکل گیا۔ ولی عہدی ہی کے زمانے میں شاہ جہاں نے راجپوتانے کی تسخیر و تالیف قلوب کی تکمیل کی اور دکن میں بھی بہت کچھ بادشاہی اقتدار کو تقویت پہنچائی، لیکن باپ سے ان بن ہو جانے کے باعث جہانگیری دور کے آخری رُبع میں ان کوششوں کے ثمرات ضائع ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر خاندان تیموری کی استواری کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ اور سلطنت پر ہمایوں کی تباہی کا دور پھر آنے والا ہے لیکن حقیقت میں اس خیال کو میں بالکل غلط سمجھتا ہوں۔ تخت ہندوستان کے تمام پرانے دعویٰ داروں کا اکبر قاطبتہً قلع قمع کر چکا تھا۔ مشرق میں تخت کے وارثوں کی ایسی لڑائیاں جنھیں ہم سوائے خانہ جنگی کے اور کوئی نام نہیں دے سکتے۔ معمولی نہیں تو ناگزیر ضرور سمجھی جاتی ہیں اور گو ان میں خونریزی ہو، تاہم ان کو اصل حکومت کے حق میں تباہ کن تو درکنار کچھ بہت خطرناک بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ پس ایک مشرقی بادشاہی اگر اس کا نظام حکومت دوسرے اعتبار سے اچھا ہے، تو ایسی لڑائیوں کا عرصے تک صدمہ جھیل جاتی ہے۔ یہ گویا ایشیا میں یورپ کی فرقہ بندیوں اور بلووں کی بجائے برپا ہوا کرتی ہیں۔ یا قدیم تر زمانے کی مثال لیجیے کہ ولیم فاتح کے بیٹوں میں

باب دوم

جو معرکہ آرائیاں ہوئیں تو ان سے نورمنوں کی انگلستان میں حکومت کا ختم ہونا تو ایک طرف، اسے کونسا ایسا صدمہ یا خطرہ لاحق ہو گیا؛ مختصر یہ کہ محلسرا کی رقابت و حیلہ کاری سلطنت کو اکھاڑنے کے لئے کافی نہ تھی اس کے لئے زیادہ عام اور گہرے اسباب درکار تھے اگرچہ یہ درست ہے کہ ان پس پردہ ریشہ دوانیوں کا اہل ہند کے قلبی جذبات پر نہیں، تو تخیل پر روزافزوں گہرا نقش بنتا جاتا تھا اور دیسی یا پردیسی قابو طلب ان سے، چالاکی سے اپنے مطلب کے موافق کام لے سکتے تھے۔ بایں ہمہ یہ یقینی ہے کہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان کے باہر کی دنیا جس میں یورپ بھی داخل ہے، سلطنت مغلیہ کے شاندار نظام حکومت کو دیکھکر ستائش کرتے اور مرعوب ہوتے جاتے تھے۔ اس دوسرے رُخ کی تفسیر و تصویر دیکھنی ہو تو خود جہانگیر کی دورنگی خصائل کا مطالعہ کرنا چاہیئے جسے جیمس اوّل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیمس اس مغل شہنشاہ کا ہمعصر تھا اور اس نے اپنے ایشیائی بھائی کے دربار کو سفارت بھی روانہ کی تھی۔ واقع میں ان دونوں میں کئی باتیں مشابہ پائی جاتی ہیں۔ بادشاہی کے ربانی فرائض و اوامر کے متعلق ان کے خاصے مختص دور اور پُرشکوہ نظریات۔ نافرمانی کی مجرم یا مشتبہ رعایا پر ان کا گرجنا برسنا اور درشتی آمیز غیظ و غضب۔ فن جہانداری کی ادنیٰ ادنیٰ تدابیر پر ان کا تفاخر جسے سنکر ہنسی آئے۔ جادو ٹونے پر ان کا تھوڑا بہت دلی اعتقاد۔ خودغرضی اور بیہودہ سفاہت کا کھلا ہوا اظہار۔ بیجا پاسداریاں اور بناوٹی دادخواہیاں؛ خصوصاً نشے کے عالم میں۔ خلوت میں چبھتے ہوئے مگر نامہذب فقرے اور اکثر خودداری سے تجاوز کر جانا جس کی جلوت کے پرتصنع ضبط و آداب سے کوئی کامیاب تلافی نہ ہوتی تھی۔ یہ سب اور اسی قسم کی اور صورتیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں انسان کی ضعیف خلقت دو مختلف اکھاڑوں مگر ایک ہی زمانے میں خدائی اوصاف سے متصف نظر آنے کی ہوس کرتی ہے اور دونوں جگہ اتنے بلند مطمح نظر کا انجام یہ ہوتا ہے کہ عمل کے وقت یہ ہوس بہت ہی مضحکہ انگیز طریق پر سر کے بل اوندھی آرہتی ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ گو جہانگیر پر بھی لوگ گھروں میں بیٹھکر پھبتیاں کہتے اور مذاق اُڑاتے تھے لیکن چونکہ طبائع شخصی بادشاہوں کی سنکوں سے زیادہ مانوس تھیں، لہذا وہ مغل شہنشاہی کی شان اور قوت کو فی الجملہ نباہ گیا اور جیمس کو شاہ انگلستان کی حیثیت سے اس کی عشر عشیر کامیابی بھی نصیب نہ ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ دوسرے

اعتبارات سے اس ایشیائی فرماں روا کی سیرت اور عمل کو زیادہ غور سے جانچا جائے تو وہ حقیقت میں بہت سی خوبیوں سے متصف نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ نہ صرف اپنے امتیازات بلکہ اپنے بادشاہی فرائض کی نسبت بھی بہت بلند خیالات رکھتا تھا اور اس کی سچی آرزو تھی کہ اپنی رعایا پر عمدہ حکومت کرے۔ اس بارے میں اس کی خود نوشتہ سوانح میں جا بہ جا جو سیاسی پند و نصائح موجود ہیں، ان میں کتنا ہی تصنع یا لفاظی کا دخل ہو اور عمل میں کتنا ہی ان سے وہ تغافل برتتا ہو، یہ خیال کرنا غیر ممکن ہے کہ یہ سب خالی ریا کاری کی جھوٹی باتیں تھیں۔ دوسرے اس کی حکومت بھی، مجموعی طور پر نہ محض ناکارہ تھی نہ ظالمانہ۔ وہ اپنے باپ کے اوصافِ حمیدہ اور عاقلانہ احکام کا پورا اور دل سے مداح ہے۔ اس پر کبھی کبھی قابل نفرت سفاکی کا بھوت سوار ہوا مگر یہ سفاکی بھی طبعی نہ تھی بلکہ اس کا محرک یہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے جائز اقتدار کو سلامت رکھنے کے لئے ایسی سختی مناسب ہے۔ پھر یہ سفاکیاں بھی عمر بڑھنے کے ساتھ شدت اور تواتر میں کم ہوتی گئیں اور یہ وہ بات ہے کہ اس میں بہت سے مشرقی یا مغربی جابروں سے مقابلہ کیا جائے تو وہ یقیناً بہتر ٹھہرتا ہے۔ نور جہاں پر اس کی فریفتگی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اس سے حسب معمول بیگم کے عزیزوں نے فائدہ اٹھایا، لیکن یہ جیمس کی بیگم بکنگ ہم وغیرہ عورتوں کے ساتھ شرمناک، قابل نفرت اور ضرر رساں آشنائی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ جہانگیر نے اپنی ملکہ بنانے کے لئے جس عورت کا انتخاب کیا، وہ حسن و جمال، ذوق و ذہانت، عزم و ہمت، ہر لحاظ سے اعلیٰ صفات رکھتی تھی۔ سوائے ان موقعوں کے جہاں اس کا ذاتی اقتدار خطرے میں ہو، وہ اپنے اثر سے کوئی غلط یا غیر مفید کام بھی بظاہر نہ لیتی تھی۔ اس کے پہلے شوہر کے ساتھ جو برتاؤ ہوا، اس پر وہ اتنا بگڑی کہ حرم سرا میں داخل کرنے کے بعد بھی مدت تک جہانگیر کی یہ جرأت یا ارادہ نہ ہوسکا کہ اسے اپنی محبوب ملکہ بنا لے جس کی شروع سے نیت رکھتا تھا۔ اسی واقعے سے نور جہاں کی دلیری ثابت ہے۔ پھر جب وہ جہانگیر کی بیوی بنی تو بادشاہ کے دل میں آخر تک کسی دوسری عورت کی جگہ نہ ہوسکی۔ آخر میں نور جہاں کے رشک و خود غرضی سے فتنہ و فساد کی نوبت ضرور آئی لیکن اس کے باوجود بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رسوخ شوہر کی خوخصلت اور اس کی رعایا کے

باب اول

حق میں فائدہ بخش رہا۔ نورجہاں کا باپ بہت لائق اور متدیّن وزیر تھا اور بھائی اپنی بہن کے توڑ جوڑ سے الگ ہو گیا اور شاہ جہاں کی تخت نشینی میں مدد دی۔

دربار مغلیہ کے جس تجمل و آرائش کو اہل یورپ دیکھ دیکھ کر بہت دن تک اش اش کرتے تھے، اس میں بھی نورجہاں کا کافی حصہ تھا۔ طرفہ تر یہ کہ اپنے سنگار میں وہ جتنی نفیس مذاق تھی، اسی قدر کفایت شعار بھی تھی حالانکہ اکثر شوقین مزاج عورتوں کا رنگ اس کے بالکل برعکس ہوا کرتا ہے۔ بادشاہ کو اس کو اس کی معیت میں بے تکان شراب خواری کی ہڑک بھی نہیں اٹھتی تھی بلکہ غالباً نورجہاں نے اس کی کثرت کو جہاں تک ہو سکا روکنے کی کوشش کی اور کم سے کم اس بدعادت کو اس طرح نہیں بڑھایا جس طرح کہ شاہ انگلستان کے دربار میں ترغیب دی جاتی تھی۔ کیونکہ اگر جہانگیر کی قدح نوشیوں کی کیفیت طامس رو نے قلم بند کی ہے تو جیمس کی رنگ رلیوں کا حال بھی ایک عینی شاہد پوری رنگینی کے ساتھ تحریر کر گیا ہے۔ مزید برآں مغل شہنشاہ، روادار و تحمل پسند تھا حتیٰ کہ اس کا مسیحیت کی جانب میلان بھی بیان کیا جاتا ہے۔

غرض مجموعی طور پر اہل یورپ کے معیار سے دیکھا جائے، تو جہانگیر برا بادشاہ نہ تھا بلکہ مشرقی فرماں رواؤں کے عام نمونے سے یقیناً بہت بہتر تھا۔ رہے اس کے زمانے کے فتنہ و فساد، تو وہ محض وقتی اور چند روزہ ہنگامے تھے۔

شاہ جہاں کے زمانے میں سلطنت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی۔ ہندوستان کے پرانے صوبوں میں اتنا اچھا انتظام، یہ امن و فراغت اور آسودہ حالی کبھی نہ ہوئی تھی۔ راجپوتانے کے باج گزار راجہ سلطنت کی جاں نثاری میں پہلے کبھی اتنے سرگرم نہ تھے۔ دربار میں اس سے بڑھکر تزک و احتشام، بادشاہ کو اس سے زیادہ اقتدار، ثروت اور عام احترام کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ مغل اعظم کا روایتی تخیل جو فرماں روائے ہند اور صرف اسی کے ساتھ منسوب ہوا، عملاً اتنا صحیح کبھی نظر نہ آیا تھا۔ شروع میں بزرگوں کی ماوراء النہر والی ہندوستانی میراث واپس لینے کی کچھ کامیاب اور کچھ ناکام سعی کے بعد، شاہ جہاں نے آخر میں قیصر ہادریاں کی روش کے مطابق، ان دشوار گزار بیش خرچ و کم نفع علاقوں کو واپس لینے سے ہاتھ اٹھا لیا البتہ جنوب کی طرف سلطنت کی حدود بڑھتی رہیں، احمد نگر کی سلطنت پر اکبر نے حملہ کیا اور خود شاہ جہاں نے باپ کے زمانے میں

باب سوم

اس کا قریب قریب خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن اُس کے آخری ہوا خواہ اور نامور سیواجی کے باپ شاہ جی کی جاں بازانہ تگ ودو کے باوجود اس بادشاہی کا چراغ اب ہمیشہ کے لیئے گل کر دیا گیا۔ دکن کی باقی ماندہ دو افغان[1] سلطنتیں یعنی بیجاپور و گولکنڈہ جبراً باج گزار بنائی گئیں اور دونوں جگہ مغل شہنشاہی کے طرفدار تیار کر لئے گئے۔ گولکنڈے کے تو وزیر اعظم ہی نے اپنی بیش بہا خدمات شہنشاہ کے حضور میں پیش کر دیں اور شاہ جہاں گولکنڈے کے اندرونی معاملات اور بیجاپور کی وراثت کے مسائل میں سرپرست و آقا بنکر دخل دینے لگا۔ یہ صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان ریاستوں کو فوراً، یا اس سے قبل کہ یہ اقدام حزم واحتیاط کے مطابق ہو، نابود کرنے کی فکر میں تھا۔ دکن کے جو صوبے سلطنت میں شامل ہو گئے تھے، ان کی اسی عہد میں پورے اہتمام سے پیمائش کی گئی اور اکبر کا طریق مالگزاری جاری کیا گیا۔ یہ بادشاہ اپنی حکومت کے آخر تک بذاتہ پوری تن وہی سے سلطنت کے کاروبار انجام دیتا رہا اور اپنے عہدہ داروں کے انتخاب اور بیٹوں سے کام لینے میں بھی نہایت کامیاب ہوا۔ ان عہدہ داروں میں الفنسٹن کا بیان ہے کہ سعداللہ خاں اتنا قابل اور دیانت دار وزیر تھا کہ ہندوستان میں کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اور بادشاہ کے بیٹے بھی زمانۂ دراز تک باپ کی بے چون وچرا اطاعت اور دل سے خدمت گذاری کرتے اور ملکی غنیم سے سرحدوں پر مصروف جنگ وجدال رہے۔

شاہجہاں اپنے باپ کی نسبت زیادہ پکا مسلمان تھا لیکن گو مسلمانوں کی ہمت افزائی کی جاتی تھی مگر ہندوؤں کو آزار نہ دیا جاتا تھا۔ نورجہاں کا معقول وظیفہ کر دیا گیا۔

---

[1] فاضل مصنف نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کو افغان سلطنتیں لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ ابتدائی انگریز مورخوں نے جو ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں ان میں اکثر وہ مغلوں سے قبل کی تمام حکومتوں کو افغان تصور کرتے تھے حالانکہ ان میں افغانی سے زیادہ ترکی عنصر موجود تھا۔ دکن کی سلطنتیں تقریباً اس زمانے میں وجود میں آئیں جب کہ لودھیوں کی شمالی ہند کی سلطنت میں ابتری اور بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اور بابر نے ۱۵۲۶ء میں سلطنت مغلیہ کی داغ بیل ڈالی۔ سلطنت گولکنڈہ ۱۵۱۸ء میں اور سلطنت بیجاپور ۱۴۸۹ء میں قائم ہوئیں جبکہ بہمنی سلطنت میں انتشار پھیل گیا تھا اور صوبجاتی حکومتوں کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا کہ وہ اپنے تئیں خود مختار ہو جائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے نظم ونسق کو درست کریں۔

شروع میں ایک زبردست بغاوت نے سر اٹھایا تھا مگر اسے بلا تاخیر فرو کر دیا گیا اور اس کے بعد سے نرمی اور باموقع دریا دلی حکومت کا عام مسلک بن گئی۔

شاہ جہاں کی قابلیت، کثیر مداخل اور (یک بہ یک پورا تختہ الٹ جانے سے پہلے تک) اس کی نیکنامی کی اس سے بہتر شہادت کیا ہوگی کہ جدید محاصل یا زرستانی کا کوئی اور طریقہ اختیار کئے بغیر اس نے صرف ایک موقع پر تخمیناً سولہ لاکھ اشرفی انعام واکرام میں اٹھا دی دو لاکھ سواروں کی باقاعدہ فوج اور دوسرے شاہی کارخانوں کو اس طمطراق کے پیمانے پر قائم رکھا کہ جن کی نظیر ملنی محال ہے۔ ہندوستان میں سب سے خوبصورت اور بیش قیمت عمارتیں بنائیں جن میں روضۂ ممتاز محل کی نامی گرامی عمارت بھی شامل ہے۔ دہلی میں نہایت شاندار جدید دارالسلطنت تیار کیا۔ مشہور ومعروف تخت طاؤس کی آرائش وزیبائش میں اتنے جواہرات لگائے جن کی قیمت کا مبصروں نے چالیس سے بیالیس لاکھ اشرفی (پونڈ) تک اندازہ کیا ہے اور ان سب شاہ خرچیوں اور مذکورہ بالا مصارف میں مبالغے کا عنصر مان لینے کے بعد بھی کوئی دو کرور پونڈ (یعنی تقریباً تیس کرور روپیہ) خزانے میں محفوظ چھوڑے۔

مگر یہ درخشاں منظر تھوڑی ہی مدت میں تاریک ہونے والا تھا۔ اب تک پانچ تاجدار تخت مغلیہ پر متمکن ہوئے ہر ایک اپنے باپ کا وارث ہوا اور نمایاں انفرادی امتیازات کے باوصف سب میں فی الجملہ خاندانی مشابہت نمایاں ہے پانچوں قابلیت، مستعدی، اولوالعزمی اور (بہ استثنائے ہمایوں اعلیٰ درجے کی صفات حکمرانی سے متصف تھے بلکہ ہمایوں کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ پانچوں کو دنیادار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کم سے کم ایشیائی معیار سے، وہ اپنی سیرت وخصائل میں صاف، سادہ۔ رفتار وگفتار میں سچے اور مخلص اپنے عام مقاصد میں بالکل راست باز وصاف گو اور عموماً ان ظالمانہ میلانات اور خونریزی کے افعال سے بری تھے جو مشرق کے شخصی بادشاہوں سے بجا اور عام طور پر منسوب کئے جاتے ہیں۔ عقائد کے نازک معاملے میں روادار تھے البتہ شریعت اسلامی کی پیروی میں سست ضرور کہے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک کی رعایا کی قسمتوں کے مالک ہونے اور ایسی سلطنت کے وسائل کو بڑھانے کے واسطے یہ بادشاہ خوب موزوں تھے اور اس کی وسیع حدود میں جو مختلف النوع اور زود اثر باشندے بستے تھے، ان پر یہ بخوبی تسلط رکھ سکتے تھے۔

لیکن وقت آگیا تھا کہ اب ایک بالکل مختلف مزاج کا شہریار بالکل مختلف قسم کے نظام حکومت کو ملک میں جاری کرے۔

جس قدر شاہ جہاں مسن ہوتا گیا، اسی قدر زیادہ پیرانہ سالی اور عیش اندوزی کی بدولت قوئ نے جواب دینا شروع کیا اور آیندہ تخت نشینی کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کی عمر پختہ گرم و سرد دیکھے ہوئے، دولت وجاہ کے حریص تھے اور سلطنت کی قیمتی بازی میں ایک دوسرے کی رعایت و رواداری کرنے پر مطلق آمادہ نہ تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا مراد بہت کم اہلیت رکھتا تھا اور دلیر ہونے کے باوجود پرلے درجے کا عیاش تھا۔ منجھلا بیٹا شجاع طبیعت کا ہوشیار تھا مگر بے اعتدالیوں نے فطری اوصاف کو اور شیعیت کی جانب میلان نے اپنے ہم مذہبوں میں اس کی نیکنامی کو صدمہ پہنچا دیا تھا۔ سب سے بڑا دارا باہمت، کھلے دل کھلے ہاتھ کا شہزادہ تھا لیکن مزاج کا بے قابو اور تحکم پسند۔ آزاد خیالی میں شجاع سے بھی دو قدم آگے۔ چنانچہ ہندو و مسلمانوں کے مذہب میں اتحاد و مصالحت کی تجویزیں کتابی صورت میں لکھ کر مسلّمہ عقائد اسلامی سے آزادی کا ثبوت دے چکا تھا، البتہ ہندو اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ تیسرا بھائی اورنگ زیب نہ صرف اپنے بھائیوں سے مختلف بلکہ تیموری خاندان بھر میں سب سے الگ اور عجیب شخصیت رکھتا ہے۔ حلیم الطبع مسکینی کے درجے تک منکسر مزاج، عام طور پر ملنے جلنے میں متواضع اور خلیق، اس کے ساتھ وقت پر شاہانہ تمکین و وقار سے آراستہ۔ روزمرہ کی زندگی میں سادہ اور زہد پسند۔ اخلاق کے اعتبار سے متقی پرہیزگار، لیکن ساتھ ہی ساتھ دولت و بادشاہی کی بے پناہ ہوس چھپائے ہوئے محتاط، دور اندیش، بے مہر۔ مذبذب اور غیر جانبدار اشخاص کو ترغیب دے کر اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ چھپی ہوئی مخالفتوں کو تاڑ جاتا اور ان کا سدِ باب کر لیتا۔ جو علانیہ حریف ہوتے، ان میں پھوٹ ڈلواتا، اور طرح طرح سے تنگ اور پریشان کر ڈالتا تھا[ع۱]۔

ع۱۔ اورنگ زیب کی سیرت کے متعلق جو رائے زنی مصنف کتاب نے جا بجا کی ہے وہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے اورنگ زیب کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ متقی، پرہیزگار، اور فرض شناس بادشاہ گزرا ہے۔ اس کی عادات و اطوار میں انتہائی سادگی پائی جاتی تھی۔ اس نے

باب دوم

فلپ کی طرح وہ سلطنت کی ایک ایک جزئیات پر ہمہ تن متوجہ رہتا تھا۔ شکست و ناکامی کے وقت بھی خرق عادت و استقلال دکھا سکتا تھا لیکن وسیع مدبرانہ خیالات سے عاری تھا۔ انسانی کردار کے عام اور ابدی خصائص، حکومت کی غیر نوشتہ حد بندیوں، زمانے کے رنگ اور آیندہ کے امکانی نتائج سے اُسے آگہی نہ تھی۔ باقاعدہ جنگ کے فن کی بہت اچھی تربیت اور مہارت تھی۔ شخصی یا ملکی اغراض نے جب کبھی میدان میں طلب کیا، وہ تکلیف و مشقت یا کسی خطرے کو خاطر میں نہ لایا۔ بایں ہمہ اسے یہ خبر نہ تھی کہ

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ اپنی عمدہ عادات کی بدولت اپنے اوپر ایسا قابو پا لیا تھا کہ اپنے مقاصد کے لئے انتہائی یکسوئی اور جفاکشی اختیار کر سکتا تھا۔ اس کی قوتِ ارادی انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں ایک شخصی بادشاہ کی اعلیٰ ترین مثال اپنی زندگی سے پیش کی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہوا ہے جو اپنی زندگی کو مملکت کے مفاد کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں اور ان کی راہ میں جو روڑا آئے اسے بلا تامل ہٹانا اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والا کس مذہب کا پیرو ہے اور نہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اجنبی ہے یا قرابتدار۔ اورنگ زیب نے اپنی ساری عمر ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کے تحت لانے کے لئے صرف کی۔ وہ ہندوستان کی سیاسی زندگی کے اس پرانے مرض کا علاج کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس ملک میں انتشار پھیلتا رہا اور تمدنی ترقی میں رخنے پیدا ہوئے۔ اس پر مذہبی تعصب کا الزام اس لئے غلط ہے کہ اس نے سرحد کے یوسف زئیوں اور دکن کے سلاطین کے ساتھ اسی طرح سخت برتاؤ کیا جب وہ اس کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنے جس طرح اس نے مرہٹوں اور راجپوتوں کے ساتھ سلوک کیا۔ اس کی ذاتی زندگی بے بوثی، سادگی اور پاکبازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کی حکمت عملی کو سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث قرار دینا تاریخ ہند کے سطحی علم پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے عہد حکومت میں نظم و نسق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی لیکن بدقسمتی سے اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا حوصلہ مند اور اہل شخص پیدا نہیں ہوا جو اتنی زبردست سلطنت کی ذمہ داریوں سے کماحقہٗ عہدہ برا ہو سکتا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں نظم و نسق میں خرابی پیدا ہو چلی تھی لیکن شاہ جہاں نے اپنی ہوشمندی اور مستعدی سے انتظام ملکی میں درستی پیدا کر دی۔ اگر اورنگ زیب کو لائق جانشین ملتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کی تاریخ ہندوستان میں بالکل مختلف نہ ہوتی اور سلطنت مغلیہ میں اس قسم کی ابتری اور انتشار پیدا نہ ہوتا جو اورنگ زیب کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے زمانے میں پیدا ہوا۔

یہ سپہ سالاری اور سلطنت کی پوری طاقت بھی خاص حالات اور غیر معمولی ذہانت کی تدبیروں کے آگے نہیں چل سکتی۔ غرض، اورنگ زیب اس قسم کا آدمی تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے سب بھائیوں پر غالب آنے، اور تخت سلطنت تک راستہ نکالنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ جو اب تک اس کے خاندان میں باقاعدہ اور امن امان کے ساتھ متوارث ہوتا چلا آیا تھا۔

باب سوم

مغلیہ حکومت

یہاں سلطنت مغلیہ کے آئین و نظام کی مختصر کیفیت بیان کر دینی مناسب ہے تاکہ آئندہ سرگزشت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

بادشاہ کو اصولاً اقتدارِ مطلق حاصل تھا۔ رعایا کا مال، آزادی اور جانیں کلیۃً اس کے ہاتھ میں تھیں۔ دربار کی مسلّمہ شریعت کی رو سے سلطنت کی تمام زمین کا وہ بلاشرکت مالک تھا۔ محاصل کا عائد کرنا، بڑھانا یا منسوخ کر دینا بالکل اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ وہ اجارہ داریاں قائم کر سکتا اور تجارت وصنعت وحرفت کے لئے جیسے چاہے قاعدے بنا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو علاقے بھر کے باشندوں کو جبراً دوسرے علاقے میں منتقل کر سکتا تھا۔ فوجی خدمت یا مصارف جنگ کے لئے جتنا چاہتا روپیہ اور آدمی طلب کر سکتا تھا۔ جنگی اور دیوانی خدمات تمام تر اس کے قبضۂ اختیار میں تھیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو جسے مطلق تجربہ نہ ہو، وہ بڑے سے بڑے مرتبے اور اقتدار کے عہدے تک ترقی دے سکتا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار کا آناً فاناً تنزل کر کے سارا اقتدار خاک میں ملا سکتا تھا۔ رعایا کے کسی فرد کو ہر قسم کی شدید ترین سزا دینے کا مختار تھا۔ ذرا سے شبہے پر یا محض غصّہ نکالنے کی خاطر جب چاہتا جرمانہ، قید،

تعذیب، قتل یا موت کی سزا دے سکتا تھا۔ ان مہیب شاہی اختیارات کو جو اسباب مستقل قوت اور مرعوب کن واقعیت بخشتے تھے، وہ یہ تھے کہ بادشاہ وسیع ملک کا حکمراں تھا۔ اس کا دربار بڑے طمطراق کا، اور کثیر التعداد فوجیں بہترین سازوسامان سے آراستہ ہوتیں۔ وزراء، صوبہ دار و سپہ دار عاجزانہ خوشامد میں مصروف رہتے۔ وہ مبالغہ آمیز پرشکوہ القاب سے یاد کیا جاتا اور، حقیقت میں زوالِ سلطنت کے وقت تک حکمرانی کے فرائض کو بذاتہ کمالِ مستعدی اور قابلیت سے انجام دیتا تھا۔

یہ استبداد و قہاری تھی بھی لابد۔ اس لئے کہ مغلوں نے ہندوستان کی سلطنت تلوار کے زور سے حاصل کی تھی ملک میں مدت تک جاگیرداروں یا رئیسوں کی ایسی کسی جماعت کا وجود نہ تھا جیسی تیوتانی قوموں میں تیار ہوگئی تھیں، کہ وہ بادشاہی استبداد سے برابر مقابلہ کرتی رہتی اس مقصد کے لئے عام لوگوں کی تنظیم خارج از بحث تھی۔ رہا وہ "عمرانی معاہدہ" جسے یورپی فیلسوفوں کے دماغ نے تراشا ہے، تو وہ تاریخی صحت سے عاری اور اہلِ ایشیا میں اس کے مبادی بھی ناقابل تصور تھے۔ اسلام کے اصول یا ایشیائی بادشاہی کی روایات بھی بادشاہی اختیارات کی حدبندی کے موید نہ تھے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ (ڈاکٹر آرنلڈ کی زبان میں) بادشاہ کی مستقل اور عجیب طور پر وہ حالت تھی جو ایک مفتوح ملک میں قابض افواج کے سپہ سالار کی ہوتی ہے۔

لیکن اقتدارِ شاہی کے اصولاً اس قدر غیر محدود ہونے کے باوجود، عملاً بہت سی حدود و قیود موجود تھیں۔ اول تو یہی حقیقت سیاسی حالت پر اثر رکھتی تھی کہ وہ بہت کثیر ہندو آبادی میں، جس میں جنگجو گروہوں کی کمی نہ تھی، بالکل اجنبی مسلمان تھا اور آتش مزاج و فتنہ جو افغانوں میں، جن کے دل میں حکمرانی کی تازہ یاد گدگداتی رہتی تھی، غیر قوم کے مغل فرماں روا کی حیثیت سے متمکن ہوا تھا۔ پھر یہ کہ اس کی حکومت کا قیام اور احکام کا نفاذ وزراء، صوبہ دار و سپہ دار اور آخر میں سپاہ کی اطاعت گزاری پر منحصر تھا۔ رائے عامہ کے کم سے کم عام اور معروف محسوسات اور رعایا کے، خواہ ہندو ہو یا مسلمان، مذہبی تعصبات بھی کچھ نہ کچھ وزن رکھتے تھے۔ شخصی یا ملکی شکایتوں کو رفع کرنے کے سلسلے میں شدید ہنگامے اور بغاوت برپا ہو جانے کا بھی بادشاہ کو برابر خطرہ لگا رہتا تھا

گو ان کا منشا بانی شکایات (یعنی بادشاہ) کو قتل کر دینا نہ ہو۔ پھر یہ کہ فتح کے نشے کے وقت بھی بابر نے معتدل اور مجموعی طور پر منصفانہ اور فیاضانہ حکومت کی طرح ڈال دی تھی، اکبر نے ترقی اور تہذیب دے کر اسے ایک مفصل نظام بنا دیا جس کی بنیاد معقولیت پر تھی۔ یہی مسلک اہل ہندوستان کی جبلی قدامت پرستی کی بدولت مسلّم و محترم ہو گیا تھا۔ اور اب اس کے خلاف چلنا اور بھی مخدوش ہوتا۔ سب سے آخری سبب جس سے استبداد کی آفت بہت کچھ کم ہو جاتی تھی، یہ تھا کہ خود یہ مغل بادشاہ عموماً بہت ہوش مند، متحمل مزاج اور وسیع الخیال تھے۔ ان سب وجوہ سے بادشاہ کی ہمت و ستعدی میں تو کوئی کمی نہ آتی تھی، البتہ ان کی حکمت عملی اگر خدا ترسی کی نہیں تو حزم و احتیاط کی ضرور ہو جاتی تھی

اورنگ زیب کے زمانے سے پہلے، سلطنت کے اندر فساد و بغاوت کی بہت کم نوبت آئی اور بیرونی جانب اس کی حدود برابر اور قریب قریب بلا وقفہ وسیع ہوتی رہیں۔ اکبر کا فیاضانہ اور شجاعانہ اصول کہ باغیوں تک کو معاف کر دیا جائے، مقبول نہ ہو سکا اس لئے بعض اوقات بغاوت کرنے والوں کا بڑی بے رحمی سے قلع قمع کیا جاتا تھا اور مجرموں کو بھی فوری اور شدید سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہ بادشاہ جو زیادہ نیکدل یا تربیت یافتہ نہ تھے، جذبے میں آ کر ممتاز عہدہ داروں کو ستاتے اور ذلیل کرتے اور اس کے لئے محض شبہہ کافی حیلہ بن جاتا تھا۔ بایں ہمہ مغل سلاطین کا عام طرز عمل ایشیائی جبر و استبداد کے ضرب المثل معیار کا نہ تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مقابلہ کیا جائے تو میرا گمان ہے کہ زمانۂ قدیم یا جدید کے بہت سے قیصروں، حامیانِ وطن، ممدوح بانیان انقلاب اور شفیق مطلق العنانوں سے کچھ بہتر ہی ثابت ہو گا۔

اس سلسلے میں یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ اورنگ زیب کی وفات ہو چکی تھی جس کے بعد ہم (اہل انگلستان) اسٹورٹ خاندان کی بحالی کے خطرے سے پوری طرح نجات پا سکے اور یہ کہ ہمارے مجموعۂ قوانین سے ایک صدی قبل تک بھی ایسی دفعات دور نہ کی گئی تھیں، جن کی عجیب شدت و سفاکی دیکھ کر سخت گیر و بے باک بادشاہ ششدر ہو جاتے۔

باب دوم

مغلِ اعظم کے غیر محدود اختیارات کو جو مذکورۂ بالا اسباب قابو میں رکھتے تھے، بہتر ہوگا کہ ان کی نوعیت اور طریق کار پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔ ان اسباب میں سب سے بڑھکر تو یقیناً قتل و بغاوت کا اندیشہ تھا۔ صرف ترکی ہی ایسی سلطنت نہیں ہے جہاں استبداد و مطلق العنانی، خونی کے پھندے یا اس کے اندیشے سے فی الجملہ نرم ہوگئی ہے۔ ابوالفضل نے بادشاہی مطبخ کے بیان میں ان جزئی احتیاطوں کا بھی ذکر کیا ہے جو شاہی کھانوں کے پکانے، چھننے اور پیش چشی میں برتی جاتی تھیں اور ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو کھانے میں زہر دیئے جانے کا خوف رہتا تھا۔ لیکن مغلیہ دور کے بڑے حصے میں اس قسم کی کوششوں[۱] کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ یہ اس بات کا خاصہ ثبوت ہے کہ ان بادشاہوں کی حکومت نہ جابرانہ تھی نہ ظالمانہ حالانکہ سلطنت میں زوال آیا تو زہر خورانی اور اسی قسم کے بہت سے برے طریقے مُروّج ہوگئے چنانچہ اورم نے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصے میں جنوبی ہند کے بہت سے فرماں رواؤں کے قتل و خون کے مسلسل واقعات تحریر کئے ہیں اور وہ دارالسلطنت دہلی کے ان واقعات سے، جن کا مجھے آگے ذکر کرنا ہوگا، پوری مماثلت رکھتے ہیں۔

لیکن قتل کر دینے کے اس چلتے ہوئے نسخے کے علاوہ، بغاوت کا میدان بھی، اگرچہ پیچ کا تھا مگر بادشاہ کے لئے کچھ کم اندیشہ ناک نہ تھا۔ ہوسناک امرا یا مظلوم وستم رسیدہ رعایا اس سے کام لے سکتے تھے۔ جن اسباب نے تھیوڈورک کو نرم ومنصف مزاج (یا مستشرقین کی دانست میں، رعایا پر ضرورت سے زیادہ شفیق) اور عام طرزِ عمل میں بہت محتاط بنایا وہی مغلوں پر اپنا عمل کرتے تھے۔ اول تو رعایا کی تعدادِ کثیر غیر مذہب کی پیرو تھی۔ پھر خود ان مغل بادشاہوں کے لشکر میں شمال کے وہ لوگ بھرے ہوئے تھے جن کا مذاق ہی قتل و غارتگری کا تھا اور اگر وہ بادشاہ کو ذرا بھی اس طرف مائل پاتے تو خود اس کی تقلید میں بہت جلد قابو سے نکل جاتے۔ نرمی اور ملاطفت کا طریقہ جاری ہوا تو چند روز میں بادشاہوں کا مذاق ہی یہ ہوگیا۔

۱۔ سلطان ابراہیم کی ماں نے بابر کو زہر دلوانے کی جو کوشش کی تھی، اس کا خود بابر نے بہت تفصیل سے حال لکھا ہے۔

وسیع القلب اکبر نے مذاہب کو ملانے کی کوشش کی تھی لوگوں نے اس کا نیا دینی نظام تو عام طور پر اختیار نہیں کیا لیکن سیاسی فوائد کے اعتبار سے یہ زیادہ کامیاب ہوا۔ ہندوؤں سے وہ ناگوار محصول لینا موقوف کر دیا گیا جو صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔ پھر انھیں فوجی اور ملکی عہدوں پر بے تکلف مقرر کیا جانے لگا۔ اس عملدرامد کے بعد ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی قوم یا مذہب کے خلاف کوئی عام زیادتی نہ چل سکتی تھی نہ کسی طرح مناسب ہوتی بلکہ اس سے غالباً خود خاندانِ شاہی کی بنیادیں ہل جاتیں اگرچہ اس خاندان کا نظم ونسق دوسرے لحاظ سے بالکل منصفانہ اور عاقلانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ چنانچہ اسی قسم کی زیادتی جو یورپ میں بہت معمولی سمجھی جاتی، اورنگ زیب جیسے اعلیٰ درجے کے اوصاف اور صاحبِ اقتدار بادشاہ کے زمانے میں کافی سبب بن گئی کہ راجپوت، بددل اور جاٹ نہایت ناراض ہوگئے سیواجی کو اپنی خود مختاری کی تجاویز میں اچھی خاصی تاویل اور بڑی بھاری مدد مل گئی اور آخر میں بادشاہی قوت کی جڑیں اندر سے کھوکھلی ہوگئیں۔

آئین حکومت کے اندر بھی استبداد کی ایک تحدید موجود تھی۔ بادشاہ کے بڑے عہدہ دار اصولاً تو اس کی بے روک مرضی کے پابند تھے لیکن مشرق میں معمولاً وہ درحقیقت اسی قدر بادشاہ کے مطیع ہوتے جس قدر کہ ان کا جی چاہتا یا اپنی حالت اور بادشاہ کی خوخصلت کے لحاظ سے مجبور ہو جاتے۔ ان عمّال و حکّام کو ایک دوسرے کا رقیب بنا کر انھیں یا ان کے متعلقین کو اپنے سے وابستہ کر کے ایک چالاک و محتاط بادشاہ انھیں بالکل غلام بنا سکتا تھا مگر اسے جو کچھ اختیارات شاہی حاصل ہوتے انھیں درجہ بدرجہ وزرا و نائبین کے تفویض کئے بغیر چارہ نہ تھا اور شخصی نظامِ حکومت کی خود سادگی کا مقتضیٰ تھا کہ کوئی باہمت صوبہ دار یا پرہوس سرلشکر اسے الٹ پلٹ یا اس کے اختیارات محدود کر دے۔ فوجی حکومت کو ایسے جنگی خطرات ہمیشہ لاحق رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ لازماً تحمل پسند ہو۔

روک تھام کی ایک اور وجہ بھی تھی جسے ہندوستان کے مسائل پر قیاس آرائی کرنے والے بارہا بھول جاتے ہیں عام طور پر مسلم ہوگیا ہے کہ سلطنت مغلیہ میں موروثی امرا کا طبقہ نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان یا یورپ کے دوسرے ملکوں میں

آج کل امارت کی جیسی خصوصیات، اور آئینی حقوق و امتیازات مقرر ہو گئے ہیں، اس طرز کا باقاعدہ طبقہ امراء ہندوستان میں نہ تھا، لیکن اگر عہد ہومر کے "بالیلیا" (چودھری) کو زمانۂ حال کے "بادشاہ" کا مرادف کہنا جائز ہے اور اگر قرون وسطیٰ کے کشورکشاؤں اور جاگیرداری زمانے کے بادشاہوں کے کام، باقاعدہ آئین و دستور سے کوئی مناسبت نہ رکھنے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ان کے امرا، شرفا، اعیان وغیرہ سے منسوب کئے جا سکتے ہیں اور اگر آج بھی جب کہ برطانی ہند میں گورنر جنرل کے شخصی اقتدار کی بجائے، مجلس انتظامی اس کی ذمہ داریوں میں شریک کر دی گئی ہے اور اس کے باوجود ماتحت عہدہ داروں کے رسوخ و اثر میں کوئی کمی نہیں آسکی، تو پھر یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ گو مغل اعظم پورے اہتمام سے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتا اور اسی کا فیصلہ آخری اور ناطق ہوتا تھا تاہم وہ عادتاً اپنے امراء وزرا اور خاص امتیاز یا واقف افراد سے مشورہ لیتا اور بہت کچھ انھی کی رائے پر چلتا تھا جن کو مبالغے یا الفاظ کے بے جا استعمال کے بغیر ہم اس کی مجلس کبیر کہہ سکتے ہیں۔ بادشاہی رائے پر امیروں کے اثر یا اس طبقۂ امرا کی جیسا کہ ہمارے ملکوں میں موجود ہے یا موجود رہی ہے، ہندوستان میں ایک صورت تو یہ تھی۔ اس کے علاوہ، ہر چند بادشاہ کو اختیار تھا کہ چاہے تو کسی دریوزہ گر کو ملوک و امرا میں داخل کر دے۔ نوابی و خانی کے خطابات بھی موروثی اور خاندانی نہ تھے بلکہ عہدوں کی طرح محض شخصی اور وقتی ہوتے تھے۔ بایں ہمہ اس میلان کے حسب ذیل چار موانع قابل لحاظ ہیں:-

(۱) یورپ کے قدیم زمانے کے دستور کی مثل جیسا ہیلم نے لکھا ہے، ہندوستان میں بھی نسب کی صحت و قدامت کا بہت خیال کیا جاتا تھا۔ لہذا مذکورۂ بالا اعزاز عموماً انھی خاندانوں میں رہتے جن میں پہلے سے چلے آتے تھے۔ حتیٰ کہ سلطنت کے آخری ایام میں تو خالص عہدوں کے نام بھی قطعی موروثی ہو گئے اور یورپ کی طرح ان کے وارث حکومت کے پابند و محتاج نہیں رہے۔

(۲) نو دولت اشخاص کے معاملے میں بھی یہ ہوتا کہ جو لوگ بادشاہ کی وفاداری میں سرگرم رہتے اگرچہ ان کے مرتے ہی عہدہ اور ان کا اثاث البیت بھی

قانوناً بادشاہ کی ملکیت ہو جاتا تھا اور اعزازی خطابات بھی دم کے ساتھ ختم ہو جاتے تھے تاہم رسم ہوگئی تھی کہ اثاث البیت کو چھوڑ دیا جاتا یا اس کی کچھ قیمت لگا دی جاتی۔ پس ماندوں کو سرکاری خدمات دی جاتیں اور اگر فوراً نہیں، تو کچھ مدت بعد ان لوگوں کو ازسرِ نو خطابات سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

(۳) زمین یا اس کی مالگذاری کے دوامی عطئے کی مثالیں کچھ کم نہ تھیں۔ اس قسم کا انعام مذہبی اور خیراتی اغراض کے واسطے ہی نہیں بلکہ بادشاہ، خاندانوں یا افراد کو عمدہ خدمات کے صلے میں دیا کرتے تھے۔ اس طرح، اگرچہ کہنے کو سارا ملک بادشاہ کی ملکیت تھا، لیکن رفتہ رفتہ بڑے بڑے قدیم خاندان، یورپ کی طرح، یہاں بھی زمین پر قابض اور قانوناً نہیں تو واقعۃً ضرور اس کے مالک ہوگئے۔ دوسرے حالات مساعد ہوتے تو ایسے معافی یاب اور نیز جاگیردار جنھیں زمین کا دوامی پٹہ مل جاتا تھا، کچھ مدت میں کافی قدر وقعت حاصل کر لیتے اور ازمنہ وسطیٰ کے بیرن یا زمانہ حال کے امیر یا بڑے زمیندار کی مثل، حکومت کی حکمت عملی پر کافی اثر رکھتے تھے۔

(۴) سلطنت کے باقاعدہ اور پوری طرح ملحق شدہ صوبوں کو چھوڑ کر دیسی ریاستوں میں آیئے جو سلطنت کا جزو نہ سہی، اس سے متعلق ضرور تھیں تو وہاں، عہد وسطیٰ کے جاگیرداری نظام کا پورا نقشہ، اور خصوصیت کے ساتھ راجپوتانے میں، بادشاہی مطلق العنانی کے خلاف مبہم مگر جم کر مقابلے کا جذبہ نظر آتا ہے۔ کرنل ٹاڈ نے ایک دلپسند نظریئے کی تصدیق اور اپنی محبوب قوم کے لئے انگریزوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر، اجمیر میں ایک جاگیرداری آئین کا خاکہ پوری تفصیل سے پیش کیا ہے اور وہاں کے اور انگلستان کے تمدن میں جو بعد عظیم ہے، اسے بھی خفیف کر کے دکھایا ہے۔ لیکن اگر یہ بیان درست ہو تو بھی انھی غلطیوں کا اعادہ ہے جو ٹاڈ کے زمانے میں مقبول عام ہوگئی تھیں۔ یہ ان مصنفوں کی غلطیاں تھیں جنھوں نے صدیوں کے فاصلے کو نظر انداز کیا، تحقیق تاریخی کے خلاف اختلافات کو کم کر کے دکھایا اور مغربی جاگیرداری کے خط و خال کو یا تو بہت زیادہ ابھارا یا اتنا راسخ اور معین ثابت کیا کہ حقیقت میں وہ ایسا نہ تھا۔ بہرحال یہ واقعہ ضرور ہے کہ راجپوت راجہ، بادشاہوں کو اپنی بیٹیاں دیتے اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدے پاتے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر

درجہ اول کے موروثی امیر اور بالکل خود مختار تھے مگر سلطنت کو سپاہی اور خراج ادا کرتے تھے۔ ان کے حقوق و امتیازات اپنی برادری کے دستور کے مطابق باپ سے بیٹے کو متوارث ہوتے تھے اور نیز یہ کہ وہ نسل ہا نسل تک سلطنت کے معزز و عالی قدر ستون اور بادشاہی بزم شوریٰ میں ہندو حقوق کے موروثی محافظ بنے رہے۔ یہ اسی قبیل کی خصوصیات ہیں جو گوی زٹ وغیرہ مصنفوں نے یورپ کے دورِ امارت کے امیروں کی بیان کی ہیں، آخر میں جب اورنگ زیب نے کسی بری گھڑی میں ان راجپوتوں کو بدل کر دیا تو اس کے خاندان کے اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا اور ایسا زوال آیا کہ پھر ابھرنا نصیب نہ ہوا۔

جمہور اہل ملک کو ظاہر ہے کہ براہ راست سلطنت میں قانوناً کوئی دخل نہ تھا۔ ان کا کام سننا، اطاعت کرنا محنت مشقت اور تکلیف اٹھانا تھا۔ بے شبہہ وہ ظلم و تعدّی کے خلاف فریاد کر سکتے تھے اور بعض دفعہ ادنیٰ ترین آدمی کی آواز سن لی جاتی اور بڑے بڑے عہدہ داروں یا امرا کے مظالم بلکہ خود بادشاہی احکام کی سختیوں کی تلافی کردی جاتی تھی، لیکن یہ نداوی اتنی دشوار، غیر یقینی اور مخدوش تھی کہ عملاً اسے کارگر نہیں سمجھ سکتے۔ باایں ہمہ مذہبی آزادی، املاک ذاتی، دستور دیہی کے جو قدیم اور مسلمہ اصول و رواج چلے آتے تھے، وہ بادشاہی اقتدار کی کافی روک تھام کرتے تھے۔ اور گو بادشاہ ان کو اسٹوارٹ خاندان کے طرز بیان کے مطابق "مراحم خسروانہ" کہیں، یہ حقیقت میں خود بادشاہی سے قدیم تر حقوق اور اس کے اقتدار کی تحدید تھے۔ پھر سب سے بڑھکر قابلِ اندیشہ اُن لوگوں کی مایوسی اور ارادے کی پختگی تھی جنھیں یورپ کے عالم نما جاہل زمانۂ حال میں "مسکین ہندو" کہہ کہہ کے خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی صاحب ذہانت انھیں اشتعال دے کر کسی ہم قوم و دردمند سردار کے تحت میں مجتمع اور منظم کر دے تو پھر یہی مسکین عوام وہ کچھ کر سکتے تھے جس کی مثال ہم آگے پڑھیں گے اور جس کا بیش از بیش اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو انسانی فطرت کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں اور اُس عہد کے اشارے پہچانتے ہیں جو اورنگ زیب اور اس کے اسلاف کا عہدِ اقتدار تھا۔

رعایا کے ساتھ حکومت کا طرز عمل نرم تو ضرور تھا مگر اس سے حکومت کی اصلی اور حقیقی جنگی نوعیت میں فرق نہ آیا تھا۔ بے شبہہ بادشاہ سب سے بڑا ملکی حاکم اور ملکی قوانین و احکام کا ماخذ تھا۔ اکبر جیسے بادشاہ کے زمانے میں توفی الحقیقت، اور

یوں بھی کسی نہ کسی حد تک رعایا سے اس کا برتاؤ واقع میں پدرانہ ہوتا تھا، مگر ان سب اعتبارات سے بڑھکر اور خصوصیت کے ساتھ وہ ہر موقع پر سلطنت کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ جہاں گیر و جہاں کشا وغیرہ پر شکوہ القاب بھی اکثر جنگی ہوتے تھے۔ ملک بھر میں فوج کے سپہ سالار ہی کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا اور عہد اقبال و عروج میں صوبہ داری پر ہمیشہ انھی کا انتخاب ہوتا جو خاص جنگی قابلیت رکھتے تھے اور بادشاہ کی طرح، ان کے عہدے کو بھی جنگی انتظامات سے براہ راست کام رہتا تھا۔ اس بارے میں وہ بابی زنطی سلطنت کے بھیموں۔ ولیم فاتح کے اُمرا۔ کروم ویل کے میجر جنرلوں اور بوناپارٹ کے نو ساختہ بادشاہوں سے کافی مشابہ ہیں۔ سلطنت کے خطابی امرا اور خصوصاً منصبدار یا تو وہی ہوتے جنھوں نے جنگی معرکوں میں نام پایا اور یا وہ جنھیں دوسری خدمات و اوصاف کے صلے میں، مثلاً ایک مقرّرہ فوجی گروہ کی سرداری پر نامزد کر کے طبقۂ امرا میں داخل کرلیا جاتا تھا۔ بہرنوع، دولت، حکومت اور امارت کا سب سے بڑا ذریعہ جنگی ناموری ہی تھی۔ راجپوت راجاؤں کی اتنی سیاسی قدر و منزلت اور ان کی بیٹیوں کا مغل شہزادوں کی زوجیت کے لئے انتخاب بھی اُن کے عالی نسب اور ملک بھر میں نامور ہونے کے علاوہ، اسی وجہ سے پسند کیا گیا تھا کہ تمام راجپوت قوم جنگ کی موروثی قابلیت رکھتی تھی اور راجاؤں کے ذریعے بہت سے کارآمد سپاہی بادشاہی مقاصد سے بخوبی وابستہ ہوجاتے تھے۔

مغل دربار، خود دارالسلطنت میں، خواہ دہلی ہو یا آگرہ، قیام کے زمانے میں بھی ایک بڑے فوجی دارالسند وہ کی شان رکھتا تھا۔ تفریح و تفنن میں بھی جنگ کی جھلک نظر آتی تھی۔ روزانہ جُوق درجوق فوجیں جمع ہوتیں۔ ان کے ساز و یراق کا معائنہ کیا جاتا۔ ان کی حالت اور سرداروں کی قابلیت کی جانچ پرتال ہوتی۔ اور یہ سب کام وقتاً فوقتاً خود بادشاہ کرتا یا براہ راست اس کی نگرانی میں انجام پاتے تھے۔ نیم فوجی ملازموں کا غول کا غول عین شاہی محل کے قریب، آپس میں یا جنگلی جانوروں سے کشتیاں کرنے پر مقرر تھا۔ شاہ و وزیر جنگل میں شکار کے علاوہ، اپنے مقام پر انھی حیوانات کی لڑائیاں دیکھکر جی بہلاتے اور لڑائی کے وقت بھی ان حیوانات سے کام لیا جاتا تھا۔ اس باب میں جنگی ہاتھیوں اور اونٹوں کے متعلق آئین اکبری میں پوری تفصیل موجود ہے۔

بادشاہی سواری بھی خاصا جنگی جلوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ بے شمار سپاہی پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ اور ہلکا اور بھاری توپ خانہ بھی شامل ہوتا اور اس کے قیام اور کوچ کی ترتیب کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کشمیر کے سرمائی قیام یا صوبوں کے معمولی دورے اور ایسی جنگی مہم کے سفر میں جیسی کہ اورنگ زیب دکن پہ لے گیا تھا جس کا مقصد کسی بڑی بغاوت کو فرو کرنا، یا کوئی زبردست جنگ وکشور کشائی ہو، بجز باقاعدہ لشکر کی کمی بیشی کے اور کچھ فرق نہ ہوتا تھا۔

ملک کے عام نظم ونسق میں بھی اس کی فوجی نوعیت آشکار ہے۔ عدالت گاہ میں دیوانی کی کچہری کی بجائے اکثر فوجی عدالت کا طمطراق نظر آتا ہے۔ اہل فوج سے عادتاً کوتوالی کی خدمات لی جاتی ہیں۔ مزید برآں، آئرستان تو ایک طرف ہمارے عہد میں خود ہندوستان میں، غیر قوم کی جبری بادشاہی اور رعایا کا جرائم کی جانب خاصا عام میلان اس واقعے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوتوالی کے جوان بھی کم سے کم نیم سپاہی کی شان رکھتے ہیں۔

اسی طرح، سلطنت کے داخل کا بڑا حصہ جنگی ضروریات میں صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں کی مسلسل جنگ سے بدامنی پھیلی اور مالگذاری میں کمی آنے لگی تو اکبر کا وہ باضابطہ انتظام کہ سپاہی اور سرداروں کو ماہ بہ ماہ تنخواہ دی جائے، قائم نہ رہ سکا اسی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ یقینی ہوگیا اور حکومت کا بہت جلد شیرازہ بکھر گیا۔ اس موقع پر یہ اور لکھ دینا چاہیئے کہ ابوالفضل نے سلطنت کے جو اعداد کمال جامعیت کے ساتھ جمع کئے ہیں، ان میں سب سے اہم اور ضروری چیز بار بار یہی بتائی گئی ہے کہ ہر ضلعے سے بادشاہی خدمت کے لئے کتنی فوج باقاعدہ اور کتنی بے قاعدہ مہیا ہوسکتی ہے

سلطنت کی فوجی نوعیت کی سب سے آخری شہادت یہ ہے کہ اس کے عروج کا زمانہ ہی وہ ہے جب کہ اس کی جنگی خصوصیات سلامت تھیں سست وعیش دوست جہانگیر تک لڑائیاں لڑا گو کچھ ناموری نہ پائی۔ لیکن باقی پانچوں مغل شہنشاہ نہایت ممتاز، جفاکش اور کم وبیش کامیاب سپہ سالار تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سخت غلطیوں کے ساتھ ناسازگار حالات نے ہمایوں کو شیر خاں کے مقابلے میں شکست دلوائی شاہجہاں بھی آخر عمر میں امن پسند ہوگیا تھا اور اپنی گذشتہ جنگی شہرت کے

باب سوم

مطابق مردانہ وار مقابلہ کئے بغیر اس نے آخر میں معزول ہونا گوارا کر لیا۔ ان سب باتوں کے باوجود دنیا کی تاریخ میں اور کونسا شاہی خاندان ایسا ہے جو مسلسل چھ ایسے نامی گرامی اعلیٰ درجے کے لڑنے والے فرماں روا پیش کر سکے؟ ان میں سب سے پہلا بانیٔ سلطنت بابر تھا کہ ہم اسے عمر سے کہیں بڑھکر تجربہ کار، بلا کا مستقل مزاج اور ہر معرکے میں سب کے آگے پاتے ہیں۔ تیسرا اکبر جس نے ایسے ایسے معرکے سر کئے کہ چارلس اعظم کے جنگی کارناموں کا مقابلہ کرتے ہیں اور انھی فتوحات کی بدولت سلطنت کو از سر نو قائم اور وسیع کیا اور فوج کو کلیۃً از سر نو مرتب کر دیا۔ چھٹا عالمگیر ہے کہ لڑکپن سے برابر سپہ گری کے جوہر دکھائے اور اپنی طویل و پُر تشویش زندگی کے آخری تئیس برس مسلسل و تکلیف دہ معرکہ آرائی میں صرف کئے حتیٰ کہ اٹھاسی سال کی بڑی عمر میں وفات پائی تو اس وقت بھی، کہنا چاہئے کہ شمشیر در کمر تھا اور جنگ کرنے سے سیری نہ ہوئی تھی۔

یہ تو سلطنت کی عام نوعیت اور اصولِ عمل تھے۔ اب اس کی ترکیب پر نظر ڈالئے تو ایشیائی سلطنتوں کی طرح وہ نہایت سادہ تھی۔ بادشاہ مختلف وزیروں کے ذریعے نظم و نسق کرتا تھا۔ ان میں وزیر اعظم، سپہ سالار یا امیر الامرا، وزیر مال یا دیوان اور کوتوال یا امور داخلی کا صدر یا کوتوال سب سے بڑے وزیر ہوتے تھے۔ انھی پر بادشاہ کی مجلس وزرا مشتمل ہوتی اور یہی اس کو مشورہ دیتے اگرچہ ہر معاملے کا آخری فیصلہ، جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا، قطعی طور پر بادشاہ ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ پیچیدہ اور اہم مسائل کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے غیر سرکاری عمائد یا جو لوگ خاص علم و واقفیت رکھتے ہوں، وہ بھی کبھی کبھی بلا لئے جاتے تھے۔ تخت کی عدالتوں، ظالم وزیروں اور صوبہ داروں کے احکام کے خلاف خود بادشاہ کے حضور میں فریاد ہوتی اور بادشاہ دار السلطنت کے دیوانِ عام یا اسی کے مماثل مقام پر روزانہ حاکم عدالت کی حیثیت سے اجلاس کرتا تھا۔

یہ بھی لکھدینا چاہئے کہ مسلمانوں میں بادشاہ کو اگر پاپا کا نہیں تو اصولاً خلیفہ یا مذہبی صدر کا مرتبہ حاصل تھا۔ اسی بنا پر اکبر نے اپنے اجتہادات کو واجب العمل ثابت کیا یا ثابت کرنا چاہا تھا، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں شیعہ فرقے کے لوگ اسے سنّی اور فی الواقع ملحد سمجھتے تھے۔ دو لحاظ سے اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

اوّل تو اس لئے کہ یہ مذہبی اختلاف، دلیلِ مزید ہے کہ بادشاہ کو دینی معاملات میں رعایا کے معتقدات دیکھکر احتیاط رواداری سے کام لینا قرینِ مصلحت تھا۔ دوسرے اس سے اورنگ زیب کی اس شدت کی ایک حد تک توجیہ ہو جاتی ہے جو اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسلمان بادشاہوں کے خلاف جائز رکھی۔ مغربی ممالک میں پاپا یا اسقفوں کے مقابلے میں علمائے کلیسا جس طرح منظم ہو کر مخالفت کر سکتے ہیں، وہ بات یہاں اس لئے ممکن نہ تھی کہ ایک تو بادشاہ مذہب کے معاملے میں مجتہد اور امام ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا دوسرے مسلم علما کی کوئی باضابطہ جماعت بندی نہ تھی۔ پرجوش مذہبی پیشواؤں اور ان کے پیروؤں نے بعض اوقات سخت ہنگامے برپا کئے بلکہ بغاوت کی نوبت آ گئی بایں ہمہ بای زنطہ کی مذہبی سلطنت سے یا ست دینی کے معاملے میں ان بادشاہوں کا کوئی مقابلہ ممکن نہ تھا کیونکہ یہاں سلطنت اور مذہب دونوں کی ہیئتِ ترکیبی اس کی مقتضی نہ تھی۔

دنیوی معاملات کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں، تو مقدمات کا فیصلہ کرنے کی غرض سے دار السلطنت میں اور عدالتیں بھی ہوتی تھیں اور حکام عدالت یا تو بادشاہ کو بطور اسیسر مشورہ دیتے تھے یا بطور خود فیصلہ سناتے تھے۔ ان کے مددگار قاضی کہلاتے جو قانون کی تعبیر کرتے تھے۔

وقتاً فوقتاً، اور خاص کر سلطنت کے زوال کے زمانے میں، طرح طرح کے عہدوں کے محض نام و خطاب ایجاد کر لئے گئے تھے۔ اس کی وجہ یا تو وہی جذبہ تھا جس کی بدولت قرونِ وسطیٰ میں بای زنطی دار السلطنت میں بڑے بڑے پرشکوہ خطابات گھڑے گئے تھے یا ذی اقتدار اشخاص کے مطالبات اعزاز و سرفرازی کو پورا کرنا مقصود ہوتا اور یا کسی خاص عہدے سے ایک شخص کو الگ کر کے زیادہ کارآمد آدمی کو مقرر کرنا ہوتا تو معزول عہدہ دار کی اشک شوی کے لئے نیا خطاب یا عہدہ تراش لیا جاتا تھا۔

مرکزی حکومت اور اس کے مناصب کی مختصر کیفیت یہ تھی۔ آگے بڑھیئے تو سلطنت صوبوں میں تقسیم تھی جن میں ہر صوبے کے والی کو اوّل اول سپہ سالار موسوم کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں ایسے صوبے پندرہ تھے بارہ نربدا کے

باب سوم

اوپر اور تین دکن میں۔ اورنگ زیب کی فتوحات سے دکن میں تین صوبے اور بن گئے۔ آگے چلکر سپہ سالار کی بجائے نواب کی اصطلاح جاری ہوئی اور کئی کئی صوبوں کا ایک والی، صوبہ دار کے نام سے مقرر کیا جانے لگا۔ الفنسٹن کے الفاظ میں "صوبہ دار، بادشاہ کے احکام کے ماتحت، اپنے علاقے میں تمام جنگی اور دیوانی معاملات کا حاکم ہوتا تھا" وہ بادشاہ ظل اللہ کے ایک اشارے پر معزول کیا جا سکتا تھا لیکن آخر زمانے میں (جیسا کہ نواب نظام الملک کے معاملے میں ہوا) وہ نہ صرف تازیست اپنے عہدے پر قائم رہتا بلکہ اپنے صوبے کو مستقل ریاست بنا سکتا تھا چنانچہ دکن کے علاوہ بنگالے اور اودھ میں یہی ہوا اور اودھ کا صوبہ دار ایک زمانے تک مستقل وزیر سلطنت بھی رہا۔

ابتدا میں صوبہ دار اپنے صوبوں کا خود انتظام کرتے لیکن اورنگ زیب کے بعد سے یہ بری اور مخدوش رسم پڑ گئی کہ وہ اپنا نائب وہاں بھیج دیتے اور خود دربار میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے۔ رسوخ و اثر قائم رکھنے کی غرض سے بیش قرار نذرانے فراہم کرتے رہتے یا ان حریفوں اور دشمنوں کے خلاف ریشہ دوانی میں مصروف رہتے جن سے اندیشہ تھا کہ صوبہ دار کی بجائے خود بادشاہ کا تقرب حاصل کر لیں گے اور قبل اس کے کہ صوبہ دار اپنے دور افتادہ مگر پر نفع میدان عمل کی جانب روانہ ہو، اس کی معزولی کا حکم حاصل کر لیں گے۔ انھی دنوں ایک اور برا دستور یہ پڑ گیا تھا کہ کئی کئی عہدوں کو ایک شخص کی ذات میں جمع کرنا جائز ہو گیا یا جائز رکھنا پڑا۔ مثالاً، نواب نظام الملک ہی کو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں دکن اور مالوے کی صوبہ داریوں کے علاوہ وہی وزیر سلطنت بھی ہیں۔ اس عہدے سے ایک اور پر شوکت خطاب لیکر استعفا دیا تو بھی وہ ایک تیسرے صوبے کا اس وقت تک دعویٰ کرتے رہے جب تک کہ واقعات نے اس سے دست برداری پر مجبور نہیں کر دیا۔ یہ گجرات کا صوبہ تھا جہاں سے موصوف نے بادشاہ کے نام سے سابقہ صوبہ دار کو جو بغاوت پر آمادہ تھا، جبراً نکالا تھا۔

کرنل ڈاو کا بیان ہے کہ شاہی فرامین ہر ضلعے میں بھیجے جاتے۔ انھیں علی رؤس الاشہاد پڑھکر سنایا جاتا اور پھر قاضی کی عدالت میں قلمبند و محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بادشاہ کی آنکھ سے اوجھل، اتنی دور سے ان پر عمل کس حد تک ہوتا تھا؟

باب سوم

یہ صحیح ہے کہ شارل مین کے "مسی ڈومی نکسی" کی طرز پر بادشاہ کبھی کبھی ناظروں کو بھیجتا کہ نظم ونسق کی خرابیاں ظاہر کریں اور پوری سلطنت کے انتظام کی ہمرنگی اور مشترکہ کام کی قوت قائم رکھیں۔ لیکن برنیر نے خود اورنگ زیب کے عہد میں لکھا ہے کہ یہ ناظر محض رشوت خوار ہوتے اور جن کی تنقید و محاسبہ کے لئے بھیجے جاتے، عامتہً انھی کے اشاروں پر چلنے لگتے تھے۔

صوبہ داروں کے تحت ہیں ایک ایک صوبے کے حاکم یا نواب ہوتے اور ان کے بعد ضلعے پر فوجدار یا فوجی حاکم کی عملداری ہوتی ان کے متعلق بھی ہم الفنسٹن کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ان کے حدود اختیارات میں مقامی یا فوج بے قاعدہ، جملہ فوجی انتظامات اور وہ اراضی آتی تھیں جو فوجی اغراض کے لئے مخصوص کردی گئی ہوں۔ فوج باقاعدہ بھی ان کے زیر حکم ہوتی اور اپنی حدود میں ایسے فتنہ وفساد کا دفع کرنا، جس میں فوج کی ضرورت پڑے، فوجداروں کا فریضہ ہوتا تھا۔

صوبہ دار، نواب اور غالباً فوج دار، ہر ایک کے ساتھ ایک دیوان یا وزیر مال مقرر کیا جاتا تھا اور گو وہ صوبہ دار کے ماتحت ہوتا لیکن کم سے کم صوبہ داری کے دیوان کا تقرر خود بادشاہ کرتا تھا۔ وہ چونکہ عموماً ہندو ہوتا تھا اس واسطے غالباً اس سے اپنے بالادست کی جاسوسی کا کام بھی لینا مقصود ہوتا تھا۔ سرکار کے ادنیٰ سے اونی درجے تک کے حکام کی نامزدگی یا اس کی منظوری اصولاً صاحب سلطنت کا کام تھی اگرچہ انتخاب اور ہنگامی تقرر عہدہ دار بالادست کر دیتا تھا۔ مگر اس میں بھی، جب بادشاہوں کی ذاتی مستعدی اور نگرانی میں کمی آئی تو اس اصول کو عام طور سے نظر انداز کیا جانے لگا حالانکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی فتنہ جو یا صوبوں کے باغیوں کو حیلہ مل جاتا تھا کہ بادشاہی منظوری کے بغیر جو حاکم مقرر ہوا ہے اس کے اور مقرر کرنے والے سرپرست کے خلاف ہنگامہ بپا کریں۔ ڈوپلے کے زمانے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جو سیاسی تحریری مناقشہ ہوا، اس کا خلاصہ یہی تھا۔ دہلی سے تقرر کے جعلی فرمان یا منظوریاں بھی منگائی جاتیں۔ مصنوعی سفیر کی دکھاوے کے لئے بہت آؤ بھگت کی جاتی اور ڈھٹائی سے یہ احکام ہر طرف پھرائے جاتے کہ سادہ لوحوں کو فریب، مذبذبوں کو اطمینان دلا دیا جائے اور غاصبانہ قبضے کو جعلسازی سے، جائز قرار دیا جائے۔ چنانچہ مذکورۂ بالا (فرنگیوں کے)

باب سوم

قضیئے میں بھی ایسا کیا گیا۔

بادشاہ کے اقتدار کی جن حد بندیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے، انھی کے ساتھ صوبہ دار کو اپنے محدود علاقے میں پورا اقتدار حاصل ہوتا تھا، اور اسی طرح نواب سرکاری خراج ادا کرنے کے بعد اپنے صوبے کا قریب قریب مطلق العنان حکمراں ہوتا تھا۔ ایسے نظام حکومت میں نافرمانی اور بالآخر شکستگی کے طبعی اسباب موجود تھے اگرچہ ابتدائی بادشاہوں کی ذاتی قابلیت مستعدی اور پختہ ارادی کے باعث یہ خطرہ بہت کچھ کم ہوگیا۔ یہ دیکھکر بھی تعجب ہوتا ہے کہ جس طرح ولیم فاتح نے حفظ ماتقدم کے طریق پر اپنے بڑے بڑے سرداروں کو ایک دوسرے سے دور، یا ایسے علاقوں میں جہاں جاگیردار کے سوا کسی دوسرے امیر کی حکومت تھی منتشر کر دیا تھا، اسی قسم کی احتیاط مغل شہنشاہ بھی کیا کرتے تھے۔ کسی صوبہ داری میں ایسے ہی امیروں وزیروں فوجی سپہ سالاروں کو جاگیریں عطا ہوتی تھیں، جن کا صوبہ دار سے کوئی تعلق نہ ہوا اور اس کی اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی اغراض جداگانہ رکھی جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی، کسی حد تک، روک تھام کر سکیں۔ بلکہ اورم تو یہاں تک بڑھا کہ یقین دلاتا ہے کہ بادشاہ اس اختلاف کو عمداً قائم رکھتے اور اپنے اقتدار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ عجب نہیں کہ یہ فائدہ بعد میں ان کو نظر آیا ہو۔ باقی یہ یقینی ہے کہ آخر کے نکمے بادشاہ اس حد سے بھی گزر گئے تھے اور اپنی رہی سہی قوت کو کچھ روز ہی کے لئے بچانے کی خاطر عادتاً اپنے حکام اور سپہ داروں کو باہم لڑاتے اور مخفی طور سے ان میں باہمی حسد و رقابت کی آگ بھڑکاتے تھے اگرچہ اس طریق عمل میں جتنی ترقی ہوئی اسی قدر پورے سیاسی نظام کی تباہی قریب تر آتی گئی۔ مگر عبرت کا مقام ہے کہ ان زوال رسیدہ بادشاہوں کو خود اپنے نائبوں کی جبری غلامی سے بچنے کی اور کوئی تدبیر ہی بجز اس کے جو اوپر مذکور ہوئی، نظر نہ آتی تھی۔

سلطنت کے عہد عروج میں صوبہ دار اور ماتحت عمال بہت احتیاط سے منتخب کئے جاتے اور ان میں اکثر اپنے آقا کے اوصاف حمیدہ کا پرتو نظر آتا تھا۔ ان دنوں بھی بارہا برے آدمی کا انتخاب ہو جاتا اور اس صورت میں اہل ملک پر بہت بری بن جاتی تھی سلطنت کے اکثر اقطاع دارالسلطنت سے فاصلۂ دراز پر

واقع تھے۔ آمد ورفت کے وسائل دشوار اور نہایت سست تھے۔ بادشاہی ناظروں کو رشوت دے کر خاموش کر دیا جاتا۔ مقامی حکام کے جبر وجور کی دہشت دلوں پر بیٹھی ہوتی تھی اور ادھر چونکہ حاکم کو مدت ملازمت کا یقین نہ تھا اور بہت ممکن تھا کہ تھوڑے ہی دن میں وہ برطرف کر دیا جائے لہٰذا جو موقع ملتا، اس سے وہ پورا فائدہ اٹھانے کا مشتاق ہوتا۔ اس میں اسراف پسندی اور خرچ طلب خدم وحشم رکھنے کا شوق ملکر اس شخص کو جس کا کام رعایا کی حفاظت وسرپرستی تھا، بدنصیب باشندوں کے حق میں سخت گیر جابر اور بلائے بے درماں بنا دیتے تھے۔

جس وقت بادشاہ کے شخصی اقتدار کی بجائے یہ اختیارات ہوسناک وبے اصول وزیروں، کامیاب فوجی آفاقیوں اور حریص وغیر ذمہ دار منہ چڑھوں کے ہاتھ میں آئے تو مذکورہ بالا آفت اور بھی عام اور ناگوار ہوگئی۔ کیونکہ پھر تو مقامی صوبہ دار انھی اثرات بلکہ اکثر محض رشوت کے زور سے مقرر کئے جانے لگے اور اپنے سرپرستوں ہی کے اصول اور اپنی اسی سیرت کے مطابق کام کرتے تھے۔ برنیر تو یہاں تک یقین دلاتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی حصے ہی میں صوبہ داریاں عادتاً ٹھیکے پر اٹھا دی جاتی تھیں۔ مگر کرنل ڈاو وغیرہ دوسرے مصنفین کی یہ رائے نہیں ہے اور مجھے برنیر سے بدگمانی ہے کہ بعض دوسرے معاملات کی طرح اس بارے میں بھی یہ زندہ دل اور فلسفی مزاج فرانسیسی عام نتیجہ نکالنے میں جلدی کر گیا ہے۔

عموماً اپنے اپنے بتدریج کمتر پیمانے پر، صوبہ دار کے ظلم وزیادہ ستانی کی نقل نواب، فوجدار، زمیندار اور پولی اکار کیا کرتے تھے۔ اگرچہ گاؤں کی آبادی کا نظام اور برادری والوں کے جذبات کی اپنے مقدم یا چودھری کے طرز عمل پر کافی روک تھام رہتی تھی۔ راجپوت ریاستوں میں ان کا اپنا انتظام ہوتا اور آخر زمانے میں تو وہ عملاً خود مختار ہوگئی تھیں لہٰذا وہاں کے باشندے ان آفتوں کا اتنا شکار نہ تھے۔

ہوس جاہ کے تین مطمح نظر ہوتے: وزارت، صوبہ داری، اور سپہ سالاری۔ یہ اکثر بار بار یا طویل مدت کے لئے ہاتھ آجاتے اور بارہا ایک شخص عمر بھر ان میں کسی نہ کسی مرتبے سے متمتع بھی ہوتا رہتا، تاہم یہ ہنگامی ملازمتیں تھیں اور اسی لئے ان میں اور اس امارت میں جسے میں نے کھینچ تان کر مستقل قرار دیا ہے، فرق تھا۔

یہ مستقل مرتبے، امیری) اور منصبداری کے تھے۔ ان دو کو بعض اوقات یکجا اور بعض اوقات ان کا علیٰحدہ علیٰحدہ ذکر آتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہنا قرین صحت ہوگا کہ اُمرا میں وہ لوگ داخل تھے جو مستقل طور پر اونچے طبقے میں لے لئے جاتے تھے۔ اور منصبداری ایک فوجی اعزاز تھا جسے حکومت کی فوجی نوعیت کے مناسبِ حال، سواروں کی مقررہ تعداد کے ساتھ منسوب کر دیا جاتا تھا۔ اس کے سوار یا پیادہ سپاہیوں کی اصلی تعداد اُس تعداد سے ہمیشہ کم ہوتی تھی جو اس کے نام سے منسوب ہوتی اور جن کی تنخواہ حکومت کی طرف سے اسے مل جاتی تھی۔ اس موضوع پر میں فوج کی بحث میں دوبارہ عود کروں گا۔

ایک اور خطاب بہادر یا سپہ دار کا تھا جو ہمارے "نائٹ" کے خطاب کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ اُمرا اور بہادروں کو براہ راست تنخواہ ملتی تھی یا نہیں؟ اس کے متعلق میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میرا گمان ہے کہ عام طور سے دستور یہ تھا کہ انھیں اپنی حیثیت قائم رکھنے کی غرض سے جاگیریں دے دی جاتی تھیں۔ یہ لکھنا ضروری نہیں کہ یہی لوگ کبھی ایک اور کبھی دوسری قسم کی، سرکاری خدمات انجام دیتے رہتے تھے۔ خاندان شاہی کے شہزادوں کو باضابطہ سب سے بلند رتبے کا منصبدار مقرر کیا جاتا تھا۔ فوجی سرلشکروں کو خطابِ خانی کی بھی بڑی مسرت ہوتی تھی اور راجپوتوں کو عموماً سنگھ کے خطاب سے سرفراز کیا جاتا تھا۔

بادشاہ کی مسلّمہ طور پر کثیر آمدنی کے ذریعے حسبِ ذیل تھے:۔ اول تو وہ سب شاہی اراضی جو مستقل طور پر انعام یا نصف معافی کے ساتھ جاگیر میں نہ دی گئی ہوں۔ دوسرے خاص خاص عہدہ داروں (اور بعض مصنفوں کی تحریر کے مطابق) عام ذی ثروت افراد کے متروکے پر بھی بادشاہ کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ مگر مجھے اس میں بہت شبہہ ہے کہ آخر زمانے میں بھی کبھی ایسا ہوا ہو کہ ایسے مرنے والوں کے جیسے زمیندار، مال تومال، زمین کی آمدنی پر بھی بادشاہی قبضہ ہو گیا ہو۔ اگرچہ متروکہ لاوارث پر بے شبہہ معقول تاوان وصول کیا جاتا تھا۔ رہے سرکاری عہدہ دار تو وہ اپنی زندگی ہی میں مال متاع کا بہت کچھ حصہ اپنی اولاد کے حوالے کر سکتے تھے۔ دیہات والوں کی وہ اراضی جن پر ان کا مالکانہ قبضہ ہوتا، ان سے کتنی ہی مالگزاری وصول کی جائے،

وہ بادشاہ کے قبضے میں کبھی نہیں منتقل ہوتی تھیں، یہ تو (زمانۂ حاضرہ کی اصطلاح میں) باضابطہ صوبوں کا حال تھا، راجپوتانے یا دوسری باج گزار ریاستوں میں اس قسم کا اندیشہ اور بھی کم تھا۔

بادشاہی آمدنی کا تیسرا ذریعہ ضبطیاں تھیں جو بعض اوقات بالکل خودرائی سے کی جاتیں۔ جہانگیر نے ایسی سزا کا اپنی تزک میں ایک عجیب اور تاسف انگیز قصہ لکھا ہے کہ ایک حریص و پرجوش کاروباری نے غیرمسلموں پر دوبارہ جزیہ لگانے کی صلاح دی اور اس کا اجارہ لیکر خود بھی کیسہ بھرنے کی تدبیر کی۔ جہانگیر کو پیغمبرِ اسلام کے احکام سے زیادہ اکبر کی حکمت عملی کا خیال تھا کہ اس نے جزیے کا اجارہ دے کر روپیہ تو دہیں وصول کر لیا، مگر اس بدنصیب شخص کا، ایسا متعصبانہ مشورہ اور شرانگیز ترغیب دینے کے جرم میں سر قلم کرا دیا۔ پھر اس کی بھی مختصر طور پر تاویل کرتا ہے کہ میں نے مقتول کا باقی مال ضبط نہیں کیا کہ اس کی اولاد محروم ہو جاتی۔ (۴) اندرونی اور بیرونی تجارت اور کاروبار سے بھی بادشاہ کو باقاعدہ محاصل کی صورت میں معقول نفع اور کبھی کبھی ان مواقع پر نہایت بیش بہا تحائف حاصل ہوتے جب کہ وہ تجارتی یا (میرا خیال ہے) صنعتی اجاروں کی منظوری دیتا یا ان کی تصدیق کرتا۔ (۵) آخری مد سب سے پُرنفع ذریعۂ آمدنی سے تعلق رکھتی ہے۔ قدیم زمانے کا یہ دستور کہ بڑے آدمی کے پاس جاتے وقت (خصوصاً جب کہ کوئی غرض یا کام نکلنے کی امید ہو) خالی ہاتھ نہ جاتے تھے، دربارِ مغلیہ میں بھی پوری شدت سے جاری تھا۔ اکبر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دانستہ کم نذرانے قبول کرتا تھا۔ ممکن ہے وہ یہ خیال رکھتا ہو کہ جو کچھ لیا جائے، اس کے برابر یا بڑھ کر عوض دے دیا جائے۔ ابوالفضل نے مستحقین و مساکین کے ساتھ اس کی عنایات و فیاضی۔ آڑے وقت میں لوگوں کی قرض وغیرہ سے دستگیری۔ شرفا کی، جو اپنی وضع نباہنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے اور آن بان کی وجہ سے کسی سے سوال بھی نہ کر سکتے تھے، مخفی اور لطیف پیرائے میں امداد کے حالات پوری تفصیل سے تحریر کئے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر دیکھئے تو نذور و تحائف کے جواب میں بہت کچھ دینے دلانے کے باوجود فائدہ بادشاہوں ہی کو رہتا تھا۔ درگاہِ حکومت پر برابر یہ نذریں چڑھتی رہتی تھیں اور خاص خاص تقریبات میں تو ان کی ہر طرف سے خوب ہی بارش ہوتی تھی۔ ان میں کثرت سے طرح طرح کی چیزیں

شامل ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں بادشاہی جواہر خانے کا بیش بہا ذخیرہ اور وہ نفیس جواہرات جن سے تخت طاؤس مزین تھا، اسی طریقے پر فراہم ہوئے تھے۔

(۶) بایں ہمہ سلطنت کی آمدنی کی سب سے بڑی مستقل مد زمین کی مالگزاری تھی۔ یہ پیداوار کی ایک تہائی تشخیص کی جاتی اور اکبری بندوبست میں نہایت معقول و منصفانہ اصول پر عاند کی گئی تھی۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہوگا کہ یہ بندوبست دہ سالہ مقرر کیا گیا تھا تاکہ گذشتہ دس سال کی پیداوار کا اوسط، زمین کی کمزوری، زراعت کی پسماندگی، خشک سالی اور آفات ارضی و سماوی کی احتیاط سے رعایت رکھی جائے اور پھر اگر کاشتکار چاہے تو مقررہ مالگزاری کو جنس میں ادا کرے (اور اس اعتبار سے ہم اسے رعیت واری بندوبست کہہ سکتے ہیں)۔ اس بندوبست کو اکبر کے جانشینوں نے بھی قائم رکھا اور دکن میں اس کی توسیع کی اگرچہ مقامی جور و استبداد کی بدولت، جس کا میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور مالگزاری پر دست برد کرنے سے پہلے بھی بارہا کاشتکار اس بندوبست کے فوائد سے محروم رہ جاتے تھے۔

اس پرعظمت سیاسی تنظیم کا جس کا اُنھی لٹیروں نے بالآخر تار و پود بکھیر دیا جن کو شروع شروع میں حقارت سے دیکھا جاتا تھا) یہ تبصرہ تشنہ رہ جائے گا اگر سلطنت کی افواج کا تذکرہ نہ کر دیا جائے۔

مختلف زمانوں میں سپاہ کی ترتیب مختلف رہی اور سرداروں اور سپاہیوں کی بھی بہت سی اقسام پر مشتمل تھی۔ بادشاہ کا مزاج اور اسی کے اثر سے حکومت کی روش، سلطنت کا مختلف بادشاہوں کے عہد میں وسیع تر ہونا اور نیز تمدنی حالات کا زمانے کے ڈھنگی نظام اور اس کی ارتقائی کیفیات میں جلوہ نظر آتا ہے۔ بابر کی کشورکشا سپاہ کم و بیش بارہ ہزار سپاہیوں کی مختصر گھٹی ہوئی جمعیت تھی جس کی ترتیب عمدہ اور نقل و حرکت کا پورا انتظام تھا۔ اس میں بیشتر سوار، بندوقچی اور تیرانداز تھے مگر بھاری توپیں بھی موجود تھیں اور انھیں چلاتے وقت وہ زنجیروں سے بندھوا دیا کرتا تھا کہ اس کی قطار جو بہت چھوٹی ہونے کی وجہ ہی سے خطرے میں رہتی تھی، اسے کچھ نہ کچھ قوت پہنچ جائے چنانچہ اس نے دو بڑے معرکے اسی طرح جیتے کہ دشمنوں کے دونوں بازوؤں پر اپنے سواروں کے چست و چالاک دستے بھیج دیئے اور دشمن کے کثیر لشکر کو اندر کی طرف اتنا دبایا کہ

باب دوم

ان کی ترتیب بگڑ گئی اور وہ ایک سراسیمہ و خائف بھیڑ بن گئے۔ اس خاص موقع پر توپوں کی زنجیر کھلوا دی گئی اور ان کے عقب سے نکل کر تازہ دم سپاہ نے سامنے سے حملہ کیا کہ غنیم کی کامل ہزیمت میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ پوری ہو جائے۔ اس طرح بابر کی جنگی تدبیر کئی لحاظ سے ہنری پنجم کی کامیاب جدتوں سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں جو ہنری نے آژاں کور کے میدان میں اور اسی قسم کے حالات میں اختیار کی تھیں۔

ظاہر ہے کہ اوّل اوّل بابر کی سپاہ میں تمام تر بیرون ہند کے عناصر شریک تھے لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ صورت نہ رہی۔ البتہ ہمایوں جب دوبارہ ہندوستان آیا تو شمالی صوبوں کو اس نے زیادہ تر اسی پردیسی جمعیت سے دوبارہ فتح کیا جو شاہ ایران نے مستعار دی تھی۔ مزید براں، مغلوں کے پورے دورِ اقتدار میں وسط ایشیا اور نیز افغانستان کے (جو بہت کچھ مغل علاقہ بن گیا تھا) سپاہی، سردار اور سپہ دار کثیر تعداد میں بھرتی ہوتے رہے۔ انھیں ہندوستان کے دیسی باشندوں سے زیادہ تنخواہیں ملتی تھیں اور مغلوں کی افواج باقاعدہ کے سب سے زیادہ مستعد سپاہی یہی ہوتے تھے۔

اکبر کی فتوحات اور تنظیم پسندی نے دوسرے شعبوں کی طرح، فوج کی تاریخ اور نوعیت میں بھی بالکل ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ آیندہ سے ہندو، خصوصاً راجپوت سردار بھی بڑی بڑی سپہ داریوں پر نظر آنے لگے۔ برادری کے خاندانی مکھیا اپنے قبیلے کے لوگوں کو شاہی جھنڈے کے نیچے فراہم کرنے لگے اگرچہ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ قلعوں وغیرہ کی پاسبانی کی بجائے میدان کی خدمت کو ترجیح دیتے تھے اور انھیں اسکی اجازت بھی مل جاتی تھی کیونکہ پاسبانی کا کام ایسی فوجیں اُن سے بہتر انجام دے سکتی تھیں جو دوسرے اعتبار سے اتنی اعلیٰ درجے کی نہ ہوتی تھیں۔ سلطنت کی وسعت کی وجہ سے بادشاہ (اکبر) کو یہ موقع بھی مل گیا کہ کثیر التعداد دیسی سپاہیوں میں سے اپنے کام کے آدمی چُن لے۔ پھر اُس نے سخت قواعد نافذ کیے جن کا منشا یہ تھا کہ فوج میں پورا ضبط قائم رہے۔ جاگیرداری کے طریقے میں جبر و زیادہ ستانی کے جو موقع ملتے تھے، ان کا سدّباب ہو (چنانچہ جہاں تک ممکن تھا، اہل فوج کو خزانے سے نقد تنخواہ ملجاتی تھی) اور فوجی اجتماعات میں اس قسم کی ملی بھگت نہ چل سکے جس سے سپہ دار مصنوعی سپاہیوں کو لاکر سرکاری روپیہ اینٹھ لیتے تھے اور فوج کی اصلی قابلیت جنگ کا ستیاناس ہو جاتا تھا۔

اُسی فراست سے جس کی بدولت اس نے اپنے زمانے اور مقام کے مختلف شعبوں میں مرّوجہ عادات و افکار میں حیرت انگیز تغیّر پیدا کیا، اکبر نے پیادہ فوج کی ضرورت کا بھی اندازہ کر لیا اور قاعدہ مقرر کیا کہ ہر منصبدار مساوی تعداد میں پیادہ و سوار رکھے اور پیادوں میں ایک چوتھائی بندوقچی ہوں۔ باقی تیر کمان ہی سے مسلح کر دئے جائیں۔ اسی کے ساتھ اس نے ایسی اعلیٰ درجے کی کثیر سوار فوج قائم رکھنے میں کوتاہی نہ کی جس کو ہم نے اپنے زمانے تک بہت کچھ کارآمد پایا ہے۔

وہ سندھی رسالہ جس میں مسلمان شرفا بھرتی کئے جاتے تھے اور اس کا ہر سوار اصالتاً میدان میں آتا اور میدان میں بھی کافی آزاد ہوتا، اسی لئے زیادہ سواروں کی ضرورت نہ پیش آتی یا کہنا چاہیئے کہ وہ زیادہ سرداروں کی ماتحتی گوارا نہ کرتا تھا، مگر سرفروش، عالی ہمت اور ان فرنگی سرداروں تک کا سچا جاں نثار ہوتا تھا جو اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں اور وہ بھی دل سے ان کی عزت کرتا ہو۔ ایسی بے قاعدہ سوار فوج نے پیپر کی ذہانت نے برمحل بھرتی کی اور جیکب کی اخلاقی فوقیت نے اسے ہر طرح مکمل کر دیا تھا۔ یہ رسالہ گویا اکبر کے مستعد احدیوں کی جمعیت کا بہت اچھا مثنیٰ تھا۔ احدیوں کو آگے چل کر "سلح دار" کہنے لگے تھے۔

ادھر باقاعدہ سپاہ کسی قدر بے پروائی اور غیر ماہرانہ طریق پر منصبداروں کے تحت میں جمع ہوتی تھی۔ یہ منصبدار محض خطاب یافتہ عمائد نہ ہوتے تھے بلکہ اس دور میں قدیم زمانے کے فرنگی امرا کی طرح، فی الواقع ایسے فوجی سردار ہوتے جن کا قریب قریب سارا کام ہی فوج سے متعلق ہوتا تھا۔

سب سے چھوٹے درجے والوں کو چھوڑ کر، دوسرے منصبداروں کے سپاہیوں کی اصلی تعداد، بعد کے عہدوں کی طرح اکبری عہد میں بھی اتنی نہ ہوتی تھی جتنی ان سے رسماً منسوب کر دی جاتی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ اسے اپنی مقررہ جمعیت کا سردار بنکر خود لڑنا ضرور پڑتا تھا گو بادشاہ اسے کبھی بڑے بڑے لشکروں کی سپہ داری بھی تفویض کرنے کا قصد رکھتا ہو۔

اس انتظام کا بڑا نقص یہ تھا کہ اس عظیم لشکر میں باقاعدہ کوئی درجہ بندی نہ تھی۔ بادشاہ، سردار و نائب سردار کو نامزد کر دیتا تھا۔ مختلف جمعیتیں اپنے اپنے منصبدار کے

زیر علم ہوتی تھیں لیکن الفنسٹن کی رائے ہے کہ "یہ داروں کے بعد پھر ماتحت سرداروں کا غالباً کوئی سلسلہ نہ ہوتا تھا اور بجز اپنی اپنی بھرتی کے آدمیوں کے وہ اور کسی پر کوئی اقتدار نہ رکھتے تھے۔" لڑائیوں کے ویسی اور ہمعصر بیانات پڑھنے سے بھی بظاہر اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے اور جب یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ ہر بھرتی کی تنظیم ناقص ہوتی تھی، تو پھر اس امر کی توجیہ سمجھ میں آجائے گی کہ سالار لشکر کے مرتے ہی ہندی فوج عموماً برف کے کھلونے کی طرح گھل کر غائب ہوجاتی تھی (کیونکہ بعد میں لشکر کو سنبھالنے والا کوئی سلسلہ سردار نہ رہتا تھا)

اکبر کا توپ خانہ، جمعیت بار برداری، ساز و یراق، اسلحہ کا انتخاب اور دوسرے جنگی آلات سب غور و توجہ کے قابل ہیں لیکن یہاں ان پر کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ البتہ آخر میں یہ لکھنا خلاف محل نہ ہوگا کہ فوجی استحکامات کے بنانے میں بھی وہ بہت عرق ریزی اور ہنر مندی سے کام لیتا تھا اور اس کا پائے تخت آگرہ وہ نمونہ پیش کرتا ہے جو اس زمانے میں قلعہ بندی کا بہترین معیار سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ آئین اکبری کے بیان کے مطابق اس کے صوبوں کی بے قاعدہ فوج کی تعداد چالیس لاکھ سے بھی زیادہ تھی، اگرچہ اس کثیر تخمینے میں غالباً وہ لوگ داخل ہیں جو صرف خاص خاص مواقع پر نیم فوجی قسم کے کام انجام دیتے تھے۔ اور جنگ میں ہمیشہ گیا، واقعتہً کبھی بھی شریک نہ کئے جاتے تھے۔

اس فرماں روائے اعظم کے فوجی نظام کا اپنے عروج کے زمانے میں یہ نقشہ تھا جو مختصر طور پر یہاں بیان ہوا۔ زمانۂ حال کے یورپی معیار سے یہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو، خود اس شخص کی نگرانی اور ولولہ انگیز تاثر سے جو ان دنوں مشرق کا اول درجے کا ماہر جنگ تھا، اسی نظام کی بدولت وہ زبردست ناقابل مزاحمت آلۂ کشور کشائی وجود میں آگیا جو اکبر کے جدّ امجد تیمور کے بعد سے ہندوستان والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

باب چہارم

اورنگ زیب اور شمالی ہند

وہ یادگار و پیچیدہ خانہ جنگی مشرق کی تاریخ میں ایک قابل مثال فصل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جہاں معزول اور قید کر دیا گیا۔ دارا اور مراد قانونی حیلوں سے اور ان کے بیٹے خفیہ طور پر قتل کرا دیئے گئے شجاع شکست کھا کے فرار ہوا اور پردیس میں گمنامی کی موت مرا اور آخر میں اورنگ زیب نے کامل فتح پائی اور اقتدار و سربلندی کے دعوے میں کوئی اس کا حریف نہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ برنیر سے لیکر سلی مین تک بہت سے مصنفوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ برنیر نے اسے اپنے فرنگی معاصرین سے ایسی زبان میں بیان کیا جو ہیرودوٹس کی سی رنگینی، فصاحت اور تخیل کی رنگ آمیزی سے آراستہ ہے۔ اور مسٹر ولیم سلی مین نے اس مضمون پر خاصی تفصیل سے لکھکر اپنی دلکش "ریمبلز" (Rambles) کی جامعیت میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔

لیکن اس قوت آزمائی کا جو ذیل کے ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے، اس جگہ بہت ہی مختصر تذکرہ لکھنا کافی ہوگا۔ یعنی ایک تو اس خانہ جنگی نے سب سے

طاقتور فرماں روا جو تخت مغلیہ کا وارث ہوا، یک بہ یک اور ہمیشہ کے لئے معزول کر دیا گیا۔ دوسرے بھائیوں کی رقابت نے انتہائی شدت اختیار کی۔ بادشاہ اور رعایا دونوں کے دل میں ان واقعات کی ناخوشگوار یاد رہی اور سب سے آخری بات یہ کہ اس خانہ جنگی میں اورنگ زیب کی کامیابی اور تخت نشینی کے بعد ہی شاہی حکمت عملی میں مہلک اور کلی تغیر واقع ہوا۔ اس طرح یہ یادگار قضیہ سلطنت کے خاتمے کا آغاز بن گیا اور خاندان تیموریہ کی تباہی میں اس نے جو حصہ لیا وہ کچھ بہت دور کا سبب نہیں ہے۔

اس فسانے کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ شاہ جہاں یکایک بیمار پڑتا ہے۔ دارا جسے باپ کا پورا اعتماد حاصل ہے، اور اس کے نام سے صدر حکومت کا کام کر رہا ہے، اس خبر کو اپنے بھائیوں سے جو صوبوں میں ہیں، ہر چند چھپانا چاہتا ہے، مگر وہ نہیں چھپتی (۱۶۵۷ء) شجاع، بنگالے میں اور مراد گجرات میں، صوبہ داری کی بجائے فوراً شہنشاہ کا لقب اختیار کرتے اور اپنے ادعائے بادشاہی کو تلوار سے منوانے کے لئے جنگی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ اورنگ زیب دکن میں ہے وہ فوج جمع کرتا ہے اور بلا تاخیر سادہ لوح مراد کی امداد پہ آمادہ ہوتا ہے جس کی ظاہری وجہ یہ، کہ مراد ہی تخت نشین ہو اور ملحد دارا کو مغلوب کیا جائے جو ایک مذہبی فرض ہے۔ اس طرح وہ ایک بھائی کی رقابت کا سدِ باب کر کے اس کی اعانت حاصل کر لیتا ہے اور ادھر شمالی ہند میں دوسرے دونوں بھائی آپس میں لڑ لڑ کر اپنی قوت برباد کرتے رہتے ہیں۔ چند ہی روز میں شجاع، دارا کے فرزند شہزادہ سلیمان سے شکست کھاتا اور بنگالے کی طرف ہٹ جاتا ہے۔

اب بادشاہ کو افاقہ ہو گیا مگر کلیتہً دارا کے ہاتھ میں ہے۔ اورنگ زیب کی نیت اس کے متعلق ابھی تک مذبذب ہے۔ البتہ مالوے میں مراد سے آملنے کے بعد وہ اس زود اعتقاد بھائی کی ہر ہر طرح چاپلوسی اور اس کی امیدِ خام کو قوی کرتا اور خود پسندی کو ترقی دیتا رہتا ہے۔[۱] ان کی مشترکہ سپاہ پہلی فتح جسونت سنگھ پر

---

[۱] یہ کہنا کہ اورنگ زیب نے مراد بخش کو دھوکے میں رکھا اور اس کو غلط امیدیں دلائیں، درست نہیں معلوم ہوتا

باب چہارم

حاصل کرتی ہے جسے دارا نے بھائیوں کی پیش قدمی روکنے کی غرض سے روانہ کیا تھا۔ (۱۶۵۸ء) پھر تھوڑی ہی مدت میں دونوں بھائی چنبل عبور کر لیتے ہیں۔ کمزور و پراگندہ حواس شہنشاہ خود لشکر لیکر جانا، اور مصالحت کی شکل نکالنی چاہتا ہے مگر اس کی پیش نہیں جاتی۔ وہ دارا کی ناعاقبت اندیشی اور تندخوئی کو نہیں روک سکتا اور دارا اس کمک کا بھی انتظار نہیں کرتا جو بیٹا لیکر آرہا ہے، بلکہ بھائیوں کی متحدہ فوج سے لڑتا اور سخت شکست کھاتا ہے۔ اس موقع پر تینوں شہزادوں کی مستعدی، دلیری اور استقلال مساوی طور پر ممتاز نظر آتے ہیں اور لڑائی کا فیصلہ محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ دارا کو ہاتھی سے اترنا پڑا حالانکہ فتح اس کے قدموں کے قریب آ لگی تھی۔ مگر سب سے پرمعنی واقعہ اورنگ زیب کی واقعی یا مصنوعی دینداری اور میدان میں نیز جنگ کے بعد، تائید الٰہی پر اس کا وثوق واعتماد ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ شاہ جہاں کی سخت علالت کی خبر پاکر جب اورنگ زیب دکن سے شمالی ہند روانہ ہوا تو اجین میں مراد بخش سے اس نے معاہدہ کیا تھا کہ داراشکوہ کو زیر کرنے کے بعد کابل، کشمیر، سندھ اور پنجاب کے علاقے مراد بخش کے حصے میں آئیں گے اور سلطنت مغلیہ کے باقیماندہ حصے پر اس کا (اورنگ زیب کا) اقتدار مسلم ہوگا۔ لیکن جنگ ساموگڑھ کے بعد جب اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دی اور آگرے پر قبضہ کر لیا تو اس وقت بعض ساتھیوں کے بہکانے سے مراد بخش نے اپنی بادشاہی کا دعویٰ کر دیا۔ مراد بخش کو یہ باور کرایا گیا کہ ابھی اورنگ زیب کی قوت اس قدر مستحکم نہیں ہوئی ہے کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جاسکے۔ اگر اورنگ زیب کو کچھ دنوں اور موقع ملگیا تو وہ اپنی فوج کی ایسی تنظیم کرے گا کہ پھر مراد اور شجاع دونوں کو آسانی سے نیچا دکھا دے گا۔ مراد بخش کا اعلان بادشاہی اجین کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ اب اورنگ زیب کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا تھا کہ وہ مراد بخش کو گرفتار کر کے نظر بند کر دے۔ اسی حالت نظر بندی میں گجرات کے دیوان علی نقی خاں کے بیٹے نے مراد بخش پر اپنے والد کے قتل کا الزام لگایا اور دادرسی چاہی۔ اورنگ زیب نے مقدمہ قاضی القضات کے سپرد کر دیا جس نے مراد بخش کے قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ یہ کہنا کہ اورنگ زیب کے اشارے پر قاضی القضات نے فتویٰ دیا اس وقت تک صحیح نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ اس کی تاریخی شہادت موجود نہ ہو۔ محض شبہے کی بنا پر کوئی قیاس تاریخی حقیقت نہیں قرار دیا جاسکتا۔

باب چہارم

بدقسمت دارا اس رتبۂ عالی سے نکبت کے غار میں گرنے کے بعد چند ہزار ساتھیوں کے ساتھ دہلی کی طرف فرار ہوتا ہے۔ اس پر یاس طاری ہے۔ اور ادھر فاتح بھائی آگرے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اورنگ زیب بہت کوشش اور طرح طرح کی تاویلیں کرتا ہے کہ شہنشاہ اس سے رضامند ہو جائے اور اسی محبت سے پیش آئے جو اب تک اس کے خلفِ اکبر کا حصہ تھی مگر کامیابی نہیں ہوتی اور اس سے مایوس ہو کر اورنگ زیب بوڑھے بادشاہ کو اپنے محل میں محصور کرنے کی کارروائی کرتا اور تھوڑے دن بعد معزول کر کے خود لقب بادشاہی اختیار کرتا ہے، مراد کے دعاوی کا خاتمہ ہو گیا۔ باپ معزول اور نظربند کر لیا گیا۔ بڑا بھائی شکست کھا کے فرار ہو گیا اور اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہ رہا۔ شجاع کی احمقانہ کوشش بادشاہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بنگالے کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ادھر اورنگ زیب کے حق پر جسے زیادہ سوچ سمجھ کر پیش کیا گیا تھا، جنگی کامیابیوں نے مُہر تصدیق ثبت کر دی اور آگرہ و دہلی کے دونوں مغلیہ پائے تخت قبضے میں آ گئے۔ پس اب وہ اس قابل ہے کہ ایک مسلّم الثبوت فرماں روا کا حاکمانہ لب ولہجہ اختیار کرے اور قضا و قدر کے ہرکارے چھوٹ گئے ہیں کہ ڈوبتے سورج کو چھوڑ کر چڑھتے سورج کی پوجا کریں۔

شہزادہ سلیمان کے پاس کثیر لشکر موجود اور وہ ابھی تک اورنگ زیب کے واسطے مخدوش ہے۔ لیکن تھوڑے دن کے بعد دونوں راجپوت راجا نئے شہنشاہ سے جا ملتے ہیں۔ سلیمان کی فوج دیکھتے دیکھتے منتشر ہونے لگتی ہے۔ وہ شمال کی طرف روانہ ہوتا ہے کہ اپنے باپ سے لاہور میں جا ملے لیکن سپاہیوں کی تعداد برابر گھٹ رہی ہے اور اورنگ زیب کی جنگی ندبیروں کے آگے پیش نہیں جانے پاتی۔ تب وہ سری نگر کے رئیس کی پناہ لیتا ہے اور یہ رئیس تذبذب کے مناسب وقفے اور زمانے کے تیور دیکھ کر رسمی سی خط کتابت کے بعد بدنصیب شہزادے کو اس کے چچا کے رحم و کرم کے حوالے کر دیتا ہے اورنگ زیب قیدی کو سونے چاندی کی زنجیروں میں سرِ دربار طلب اور حسن سلوک کا وعدہ کرتا ہے پھر اس کے بھائی سپہر شکوہ کے (جو خود بھی قید کر کے لایا گیا تھا)

نیز مرادؔ کے ایک فرزند کے ساتھ گوالیار بھیج دیا ہے جو سلاطین مغل کا وان سین (Vincennes) یعنی شاہی قید خانہ تھا۔ لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرتا کہ وہاں یہ تینوں پُراسرار طور پر فوت ہو جاتے ہیں۔

اس عرصے میں شہنشاہ کو جو بذات خود دارا کے تعاقب میں گیا تھا، پنجاب سے واپس آنا پڑتا ہے کہ اپنے پائے تخت اور بادشاہی کی شجاع سے مدافعت کرے جو دوبارہ بنگالے سے لشکر لیکر پیش قدمی کرتا ہے۔ الہ آباد کی نواح میں پھر ایک بار اورنگ زیب کا مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے کیونکہ جودھپور کا طاقتور راجہ جسونت سنگھ جس نے پہلے شکست کھائی اور حال میں مطیع نہیں تو ایک اتحادی کی حیثیت سے صلح کرلی تھی، عین میدانِ جنگ میں بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اس سردار نے اتنی دیر میں اورنگ زیب کی اطاعت قبول کی کہ پھر اس پر وہ توجہ مبذول نہ ہوئی جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا تھا۔ دوسرے آزاد مشرب دارا کے سابق دوست ہونے کی بنا پر وہ راسخ الاعتقاد اورنگ زیب سے بغض رکھتا ہے اور دربار میں آؤ بھگت نہیں ہوئی تو پھر اسے چھوڑ بیٹھتا اور دشمن سے جا ملتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ بادشاہ کے ساقہ پر زور شور سے حملہ کرتا ہے جب کہ شجاع سامنے سے حملہ کرنے والا ہے، لیکن شجاع کے تساہل و سست کاری اور اورنگ زیب کی درستیٔ ہوش، استقامت اور سلیقہ مندانہ ترتیب سے یہ تجویز خاک میں مل جاتی ہے۔ عام جنگ میں شجاع کو کامل شکست نصیب ہوتی ہے اور وہ پھر مشرق کی طرف پسپا ہوتا ہے (جنوری ۱۶۵۹ء) تاہم وہ بادشاہی سپہ سالار میر جملہ سے کچھ مدت تک اُلجھتا رہتا ہے بلکہ شہنشاہ کا بڑا بیٹا بھی چند روز کے لئے اُس سے آملتا ہے۔ بالآخر ہندوستان سے نکالا جاتا اور اہل وعیال سمیت ارکان کے علاقے میں ہٹ جاتا ہے جہاں ان سب کو مقامی حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے کی بنا پر قتل کرا دیا جاتا ہے۔

جس وقت شجاع شکست کھا کے پسپا ہوا، تو جسونت سنگھ نے اس کی مصیبتوں میں شریک ہونا یا اپنے وطن کے مستحکم مقامات سے بالکل علیحدہ ہو جانا پسند نہیں کیا بلکہ گھر کی راہ لی۔ وہ آگرے کے قریب پہنچا تو اس کی نسبت سخت شبہہ ہوا کہ وہ شاہ جہاں کو پھر بحال کرنے کی فکر میں ہے اگر وہ ایسا کرتا تو غالباً، زیادہ

نہیں تو چند روز کے واسطے ضرور کامیابی ہو جاتی، لیکن اورنگ زیب اسے اپنی تجویزیں پکانے کی مہلت یا ذاتی شکایتوں پر زیادہ پیچ و تاب کھانے کا زیادہ موقع ہی نہیں دیتا بلکہ عادت کے موافق خاص توجہات اور فیاضانہ مراعات کے ذریعے اس راجپوت کو دارا سے توڑ لیتا ہے۔ یہ کارروائی عین وقت پر ہوتی ہے کیونکہ اس عرصے میں دارا نے پھر فوج بہم پہنچالی اور گجرات کے صوبہ دار شاہ نواز خاں کو (اگرچہ وہ اورنگ زیب کا خسر تھا) اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ گجرات اور اس کے وسائل و مداخل دارا کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن نیا شہنشاہ جو کسی تکان کو نہیں مانتا دوبارہ بھائی کو شکست دے کر بھگا دیتا ہے۔ شاہ نواز خاں جنگ میں مارا جاتا ہے اور اب دارا کا مستقبل بالکل یاس انگیز رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگتے ہیں وہ ٹھیر ٹھیر کر چند اضطراری اور ناکام کوششیں کرتا اور آوارہ و سرگرداں پھر کر بالآخر پکڑا جاتا اور بے وفائی سے اپنے بے رحم بھائی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ عوام الناس اس کی ان مصیبتوں میں سخت رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں مگر بحال کرنا تو درکنار اسے چھڑانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ ادھر اورنگ زیب آخر تک دینِ متین کے حامی کی شان نباہتا اور دارا کا کفر و الحاد ثابت کر کے قید خانے میں قتل کرا دیتا ہے۔

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ شخص ان کارناموں کے ساتھ بابر اور اکبر و شاہ جہاں کا وارث بن کر کہاں تک پھلتا پھولتا ہے۔

اورنگ زیب کے نظم و نسق کی عام خوبیوں پر یہاں بحث کرنی غیر ضروری ہے۔ اس کی سیرت کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے یہ اوصاف بہت ممتاز و بلند تھے اور انھی کی بدولت، معائب کے باوجود وہ بجا طور پر اپنی رعایا اور پردیسیوں کی تحسین کا مستحق بنا۔ لیکن میرا مقصد تو اس وقت زیادہ تر یہ ہے کہ نظام سلطنت کے شکستہ و برباد کرنے میں اس کی حکمت عملی نے جو حصہ لیا اور بہ سرعت اس تخریب کی تکمیل کی، ان اثرات کا سراغ لگایا جائے۔ اس راستے میں اس کے ابتدائی افعال صریحاً ظالمانہ نہ تھے بلکہ لوگوں کو تنگ و پریشان کرنے والے تھے۔ الفنسٹن کے الفاظ میں "ان سے تفریق و احتساب کا میلان پیدا اور ہر دو مذاہب کے درمیان امتیاز نمایاں ہوتا تھا جسے سابقہ بادشاہوں کی حکمت عملی محو کر رہی تھی"۔

انھی احکام میں ایک ملا کا تقرر تھا کہ سواروں کے ایک جوق کے ساتھ شرمناک بُت پرستی کے آزادانہ مظاہروں کا سدِباب کرے اور میلے تماشوں، راگ رنگ کے جلسوں، ناچ گانے اور سوانگوں کو روکے حالانکہ یہ عوام کی معاشرت کا خاص جزو تھے۔ اسی طرح نجوم ورمل کی ممانعت اگر واقعی جبر نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور تھی۔ آگے چل کر اس نے مسلمانوں پر کروڑگیری کے محاصل آدھے کر دیے اور یہ بات ہندوؤں کو سخت شاق گزری[1]۔ دربار کا وہ پہلا سا دلچسپی کا رنگ نہ رہا بلکہ تقشّف کی شان آگئی جو ان لوگوں کو کسی طرح پسند نہ آسکتی تھی جنھیں پہلے بادشاہوں نے دھوم دھام کے جلسوں اور ہنگامہ خیز تماشوں کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

اس کے بعد اور بھی احکام نافذ ہوئے۔ بادشاہ نے سلاطین تیموریہ اور ان کی کثیر رعایا کے درمیان جو رشتۂ ارتباط قائم ہوا تھا، اسے توڑ دیا اور اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا کہ یہ انقطاع خاندان شاہی کی سلامتی کے حق میں کس حد تک مساعد ہو سکتا ہے۔ مغل اعظم نے علانیہ اپنا سبب سے اعلیٰ منصب، یعنی جملہ اقوام وملل کی ابوت، ترک کر دیا جو اب تک بلا رورعایت شخصی بادشاہوں کا وصف ہوتا اور مذہب وملت کی تفریق کے بغیر اس کی طرف سے ہر شخص کو عہدے عطا ہو جاتے تھے۔ تاتاری فاتح اپنی دیسی اور بادفا رعایا سے بدگمان ہو گیا۔ وہ لوگوں کے قدیم مراسم، فنون اور اسبابِ تفنّن کو روکنے لگا جن کو اس کے اجداد اپنا نہ بنانے کی وہ کچھ سعی کرتے رہے تھے۔ یہ اور اسی قسم کے اسباب تھے جن کی بدولت ہندو رعایا کے گہرے تعصبات اور زود اثر تخیل کے سامنے نعل شہنشاہی کے بعض پہلو نمایاں ہو گئے۔

---

[1] اورنگ زیب کے عہد کی تاریخوں سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کروڑگیری کے محاصل مسلمانوں کیلئے نصف کر دیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے اپنے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی اپنے تخیل سے کام لیکر پیش کیا ہے۔ بعض انگریز مصنفین نے یہ بے بنیاد خیال پھیلا دیا کہ اورنگ زیب ہندوؤں کے ساتھ تعصب برتتا تھا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ یقیناً اپنے مذہب کی حقانیت میں پورا یقین رکھتا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بلا وجہ دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کے ساتھ برے سلوک کو جائز تصور کرتا تھا۔ اسنے ہندو افسروں پر پورا اعتماد کیا اور فوجی اور ملکی انتظام میں انھیں ذمہ داری کی اہم خدمات پر سرفراز کیا۔

شاہی مخالف سرگروہ راجپوت راجہ تھے جن میں مارواڑ یا جودھپور کا رئیس جسونت سنگھ کچھ کم معزز نہ تھا۔ یاد ہوگا کہ وہ شہنشاہ کی کبھی ملازمت اور کبھی مخالفت کرتا رہا تھا، مگر غالباً اورنگ زیب نے اس کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اور تکلیف وہ جزیے کے اجرا کے کچھ روز بعد وہ مرا تو اس کے اہل و عیال کے ساتھ وہ برتاو کیا گیا جس کی سختی کا نتیجہ خطرناک قضیے کی صورت اختیار کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جسونت سنگھ کا نوعمر بیٹا اجیت سنگھ اپنے نوکروں کی جاں نثاری کی بدولت، جن کا سرخیل ورگا داس تھا، بچ کر نکل گیا اور کیاّ دمغل کے خلاف جس نے اسے اپنے دام میں پھنسانا چاہا تھا، پیہم جنگ کرنے کے لئے بہت دن زندہ رہا۔

وہ طوفان جو بہت دن سے سر پر تلا ہوا تھا، آخر شہنشاہ کی عام حکمت عملی کے باعث پھوٹ پڑا۔ جے پور کا رئیس مقامی اور خاندانی اعتبار سے دربار سے اس قدر وابستہ تھا کہ علانیہ مزاحمت نہ کر سکتا تھا لیکن اودے پور کے رانا راج سنگھ نے جسونت سنگھ کے بچوّں کے ساتھ مل کر طوق اطاعت اتار کر جنگ کے میدان میں کود پڑا۔

اورنگ زیب نے خود لشکر کشی کی (۱۶۷۹ء) مگر چند مہینے کی لڑائیوں کے بعد راج سنگھ سے صلح کر لی جس میں ہر چند اسے مارواڑ کے حلیفوں سے علیحدگی اختیار کرنے کا پابند بنالیا گیا تھا، لیکن جنگ کی اصلی اور گہری نزاع کے معاملے میں وہ عملاً شہنشاہ کی ناکامی کا اعتراف تھی۔ جزیہ منسوخ ہوگیا یا حکومت کے الفاظ میں اس کے عوض میں رانا نے ایک چھوٹے سے ضلع کو اس طریق پر حوالے کیا کہ اس راجہ کی آبرو میں جو عالی نژاد ہونے کے باوجود صرف چھوٹی سی ریاست کا مالک تھا اور مغل اعظم کے مقابلے میں لڑا تھا، کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اورنگ زیب کی مشکوک سی کامیابی بھی دیرپا نہ تھی مارواڑ کے باشندے ہنوز برسر جنگ تھے اور اجیت سنگھ نے انھیں مدد دینے میں ذرا لیت و لعل نہ کی۔

شہنشاہ نے دوبارہ بذات خود میدان جنگ کا رُخ کیا۔ اپنے بیٹوں اور گجرات کے والی کے ماتحت متعدد لشکر جمع کئے کہ اس ہٹیلی بغاوت کا قلع قمع کر دیا جائے۔ ایک متمردانہ، ظالمانہ اور طویل جنگ شروع ہوگئی۔ راج سنگھ پر ہر طرف سے حملہ ہوا تو وہ اراولی کے پہاڑوں میں بھاگ گیا اور شہزادۂ اعظم عجلت سے

تعاقب میں روانہ ہوا۔ میدانی علاقہ شہنشاہ کے صریحی احکام کے بموجب تاراج وپامال کر دیا گیا۔ ہر طرف دہشت انگیز حکومت کا دَور دَورہ ہوگیا۔ دوسری طرف راجپوتوں نے سواروں کا ایک معقول لشکر میدانوں میں لگائے رکھا۔ پہاڑوں کے مفرور اپنی فطری گرم جوشی سے انھیں مدد پہنچاتے رہے اور ذیل میں جنگ کا جو خلاصہ آتا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ گویا ہم ابھی سے اورنگ زیب کی جنوبی ہند کی ہزیمت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یعنی الفنسٹن لکھتا ہے کہ "وہ (= راجپوت) رسد لانے والوں کو مار ڈالتے، چھوٹی جمعیتوں پر حملہ کرتے، عمدہ مواقع کی مدافعت کرتے، اور بعض اوقات ناگہانی تاختوں اور شبخونوں میں اہم فتوحات حاصل کرتے تھے۔

اورنگ زیب کو انسانی مصائب کی مطلق پروانہ تھی اور اب تک جو لڑائی ہوئی، اس کے نتائج سے وہ آنکھیں بند کر سکتا تھا لیکن اس کے لائق دشمن درگاداس نے آیندہ جو کارروائی کی، اس سے تجاہل ممکن نہ تھا اور اس سے بلاشبہ ظاہر ہوگیا کہ شہنشاہ کی ناروا داری اگر سلطنت کو نہیں تو خود اسے ہلاکت کے گڑھے میں گرا دینے کا میلان رکھتی ہے۔

درگاداس نے ایک حد تک ولی عہد سلطنت شہزادۂ معظم کی وفاداری کو متزلزل کر دیا، اور آگے چل کر شہزادۂ اکبر کو اپنا ہمنوا بنا لیا جس نے ہندوؤں کے اثر میں آکر باشاہی شان اختیار کی[1] اورنگ زیب کے مسلمان امرا منصوبے کی تائید وتحریک اور اس کی خدمت کے لئے مل گئے اور فوج والے بھی یا تو ان سرداروں کے

[1] ۔ درگاداس راٹھور کے بہکانے پر شہزادۂ اکبر نے اپنے والد اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اجمیر پر دھاوا بول دیا۔ اورنگ زیب کے افسر شہاب الدین خاں نے جنھیں بعد میں غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب ملا اور جو نواب نظام الملک آصفجاہ اول کے والد تھے، شہزادۂ اکبر کو سخت شکست دی۔ شہزادے نے بھاگ کر سمبھاجی کے پاس پناہ لی (۱۶۸۱ء) میں رانا اودے پور کے ساتھ جب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے معاہدہ کر لیا اور دکن کی طرف فوج کشی کی تو شہزادۂ اکبر سمندر کے راستہ سے ایران چلا گیا۔ مصنف کتاب نے جو یہ لکھا ہے کہ شہزادۂ اکبر نے اپنے والد اور بھائیوں کے خلاف جنگ کی بالکل غلط ہے۔ اجمیر کی شکست کے بعد شہزادے کو مقابلہ پر آنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔

ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے اور یا انھوں نے اس باغیانہ تجویز میں ساتھ دیا۔ لیکن واقعہ یہی ہے اور جس وقت یہ شہزادہ راجپوت حلیفوں کے ساتھ ستر ہزار سپاہی لیکر اپنے باپ کے خلاف بڑھا تو شہنشاہ اس ناگہانی صورت پیش آجانے سے انتہائی خطرے میں گھر گیا کیونکہ خود اس کے پاس محض مٹھی بھر سپاہی رہ گئے تھے، مگر ایسے ہی نازک موقعوں پر اس کی یہ بے نظیر قابلیت اپنے جوہر دکھاتی تھی کہ مخالفوں کے جتھے میں انتشار پیدا کر دیا جائے۔ صرف ایک وفادار سردار باغی لشکر میں بدگمانی اور نفاق پیدا کرا دینے میں کام کر گیا۔ اورنگ زیب کے قاصد کے ساتھ اس کا بھائی (جو شہزادۂ اکبر کی فوج کا ایک سردار تھا) شہنشاہ کے پاس چلا آیا۔ ایک اور آتے ہوئے مارا گیا۔ سپاہیوں نے حسب سابق اپنے سرگروہوں کی تقلید کی اور چند ہی روز میں مغل شہزادہ، درگا داس اور اس کے راجپوتوں کے ساتھ، تنہا رہ گیا۔ وہ جان سلامت لیکر نکل گیا اور اس کے ہندو دوست وفاداری سے معیت میں روانہ ہوے (۱۶۸۱ء) اور آیندہ ہم مرہٹہ راجا، سنبھاجی کے دربار میں اس کے پہنچنے کا حال پڑھیں گے۔

اس عرصے میں جنگ جاری رہی اور زیادہ زہریلی ہوتی گئی۔ مغلوں کی تاراجیوں پر راجپوتوں نے بھی بگڑ کر جواب میں مذہبی تشدّد اور وحشیانہ حرکتیں کیں لیکن جیساکہ کچھ مدت بعد، ایسی ہی مصیبت پڑنے پر، سکھوں نے کیا تھا، انھوں نے بھی مسجدیں لوٹ لیں۔ قرآن (شریف) کو جلایا اور مولویوں کی تذلیل کی۔

اس پریشان کن اور پُر فضیحت جنگ سے شہنشاہ بالکل مضمحل ہوگیا دوسرے اسے دکن میں درازدستی کی پر شکوہ تجویزوں پر عمل کرنے کی فکر تھی۔ لہذا راج سنگھ سے پہلے سے بھی زیادہ اُس کے موافق شرطوں پر صلح کر لی جو فی الواقع جنگ کے دونوں مقاصد میں اپنی ناکامی کا صریحی اقرار تھا۔ جزیہ صراحت کے ساتھ ترک کر دیا گیا۔ کم سے کم وہ ضلع جو پہلے اس نام سے لیا گیا تھا، اب اس کا مطالبہ شہزادۂ اکبر کی بغاوت کے جرمانے میں کیا گیا اور پُرنخوت مغل نے دب کر جسونت کے بیٹے کو جب وہ بلوغ کو پہنچ جائے۔ ریاست دینی منظور کی۔

باب چہارم

ان سب باتوں کے باوجود بھی اسے چند ہی روز آرام مل سکا۔ جنگ پھر چھڑ گئی اور اورنگ زیب کے تمام عہد حکومت میں رہ رہ کر جاری رہی جس سے دکن میں اس کی مشکلات بڑھ گئیں اور بالآخر اسی سے اس کی شہرت پر حرف آگیا، اس کے مداخل ختم ہو گئے اور اس کی بادشاہی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں [1]

---

[1] ۔ مصنف کتاب نے اس پورے باب میں غلط بیانی اور تعصب سے کام لیا ہے۔ اگر وہ تاریخی واقعات سے اپنے نتائج اخذ کرتا تو کوئی وجہ شکایت نہ تھی لیکن چونکہ سرے سے وہ واقعات ہی غلط ہیں جن سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں اس واسطے اس کے نتائج قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ کتاب آج سے تقریباً ۵، یا ۸۰ سال قبل لکھی گئی تھی جبکہ اسلامی ہند کے متعلق کافی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ اب جبکہ تمام ماخذ ہماری دسترس میں ہیں ہم اس زمانے میں زیادہ صحیح نتائج اپنی تحقیق سے نکال سکتے ہیں۔

باب پنجم

مرہٹہ قوّت کا بانی، سیواجی

اس باب میں جو واقعات بیان کئے جائیں گے، ان کا محلّ وقوع، قطعی طور پر ہندوستان کا جنوبی علاقہ یا کہنا چاہئے کہ نربدا اور مہاندی کے جنوب کا جزیرہ نما ہے۔ اسی کو عام اور وسیع معنی میں دکن کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں نربدا اور مہاندی کے اوپر کا ملک "ہندوستان" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اہل ہند نے دکن کی بھی پانچ خطوں میں ایک غیر معیّن سی تقسیم کر دی ہے، دراوڑا۔ کرناٹک۔ تلنگانہ۔ گونڈوانہ اور مہاراشٹر۔ ان میں وین گنگا کے مشرق کے ٹکڑے، یعنی گونڈوانہ کے جنگلی علاقے اور قدیم قوموں سے ہمیں کچھ سروکار نہیں ہے۔ دراوڑا مشرقی گھاٹوں کے شمال جنوب اور مغرب میں، راس کماری سے لیکر پالی کٹ کی جھیل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں تلنگانہ اور شمال مغرب میں کرناٹک واقع ہے اور ان دونوں کی سرحدیں مہاراشٹر سے مل گئی ہیں۔ یہی مرہٹہ قوم کا وطن اور سیواجی کے کارناموں کا اصلی مقام ہے۔ اس کی حدود یہ ہیں:۔ مغرب میں بحرِ ہند۔ شمالی سرحد نوم ڈوڈ سے وین گنگا تک ست پڑا کے

ساتھ ساتھ چلی گئی ہے اور مشرق میں بھی تھوڑی دور تک وین گنگا اس کی سرحد ہے جس کے بعد مانک ڈرگ اور ماہور تک ور دھا ندی اس کی حدّ فاصل بناتی ہے۔ تلنگانے سے مانجرا کی الیلی ندّی اسے جدا کرتی ہے اور سرسری طور پر، کرشنا، اور مال پڑوا کو اس کی جنوبی حدود کہہ سکتے ہیں۔

مہاراشٹر کے کل رقبے کا تخمینہ ایک لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔ اس میں ایک نمایاں شے مغربی گھاٹ یا سہاوری کے پہاڑوں کا بلند و سلامی وار سلسلہ ہے جو اس کی جنوبی سرحد سے بہت آگے تک پھیلتا ہے اور خود مہاراشٹر کو تین قدرتی اضلاع میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اوّل، کوکن جو پہاڑوں اور سمندر کے درمیان کا علاقہ ہے۔ گھاٹ مٹھا، یا خود ان پہاڑوں کے اوپر کا علاقہ جو بعض مقامات پر نہایت عریض ہے۔ تیسرے، دیش یعنی سہادری کے مشرق کی سطح مرتفع، یوں بھی پورا ملک پہاڑی ہے اور چار متقاطع اور کافی بلند پہاڑ اس کی پوری سطح پر پھیلے ہوئے ہیں یعنی (۱) چاندور کے پہاڑ، جنھیں اب شمالی گھاٹ کہتے ہیں۔ (۲) احمد نگر کا سلسلہ۔ (۳) پونا کے بالکل قریب جنوب کے پہاڑ اور پھر (۴) اور جنوب میں ستارا کے قریب مہادیو کی پہاڑیاں مہاراشٹر کی سطح مرتفع سے گھاٹ کے اصلی پہاڑ اور بھی اونچے اٹھے ہوئے ہیں اور ان کی چوٹیوں پر سلامی دار و پر شکوہ چٹانوں کے انبار ہیں جن سے قدرتی قلعے بن گئے ہیں کہ اندر سے بہت وسیع اور باہر سے سخت دشوار رس اور دیکھنے میں بارعب ہیں۔ ان تک پہنچنا اس جگہ اور بھی مشکل ہو گیا ہے جہاں وسیوں نے اپنی بُری بھلی دہقانی ہی صنعت صرف کی اور مورچے وغیرہ بنا دیے ہیں۔ مشرقی ضلع قدرتاً بلند ہے اور اس کے اوپر پہاڑوں کی طویل و متوازی شاخیں یا جداگانہ سلسلے اندرونی علاقے میں دور تک چلے جاتے ہیں۔ انھی کے اندر گہری اور خوب سیراب وادیاں آگئی ہیں اور مجموعی طور پر اس خطے (گھاٹ مٹھا) کا عرض اوسطاً بیس میل سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ان پہاڑی شاخوں اور ٹیکروں پر بھی، ان چار بڑے سلسلوں کی طرح، جن کا اوپر ذکر ہوا، بہت سی گڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کوکن کے علاقے کی حالت مختلف ہے لیکن بمبئی کے قریب، یہ سرزمین خصوصیت کے ساتھ بہت ناہموار، سنگستانی، اور ناقابلِ کار ہو گئی ہے کیونکہ سہادری کے فلک آسا پہاڑوں کے دامن گویا اس کی

زیر مشق ہے اور یہ پہاڑ کہیں بتدریج اور کہیں یک۔ بہ یک سمندر تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے پہلو سے جو ندی نالے بہتے ہیں وہ برسات میں تیز و تند رو بن جاتے ہیں جن سے زمین کی سطح جابہ جا شکستہ اور ایسی پست و بلند ہو گئی ہے کہ اس میں سڑک بنانا اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ کوکن اور گھاٹ مٹھا کے دونوں علاقوں میں درختوں کی کثرت ہے خصوصاً ان دونوں کی گھاٹیوں اور دروں میں گھنے جنگل کھڑے ہیں۔ پھر بارش کی طغیانی اور تواتر۔ کراڑوں کی بلندیاں۔ جنگلوں کی مرطوب اور وبائی ہوا۔ رعد و برق کے پیہم خطرناک و پرشکوہ طوفان، یہ سب وہ اسباب تھے کہ سال کے چند مہینے اس خطے میں جنگ آرائی قریب قریب ناممکن تھی۔ مرہٹوں کا مورّخ جو خود بھی سپاہی ہے، بیان کرتا ہے نہ جنگی اعتبار سے غالباً دنیا کا کوئی ملک اتنا مستحکم نہیں ہے۔

نربدا اور تاپتی کو چھوڑ کر جو دور مشرق سے نکلتے اور خلیج کھمبائت میں جا گرتے ہیں، دکن کے باقی تینوں بڑے دریا (یعنی گوداوری، کرشنا اور بھیما) اور ان کے بیشمار معاونوں کا منبع سہادری کے پہاڑوں میں ہے اور انھی ندیوں سے دکن کی سطح مرتفع میں ہر طرف سرسبزی پھیل گئی ہے۔ اگرچہ گزرگاہ کے گہرے کٹاؤ کے باعث اور پانی کے زیادہ مسلسل نہ ہونے سے یہ کثرت روئیدگی اتنی نہیں ہے جتنی بنگالے یا مشرقی ساحل کے زیادہ جنوبی اضلاع میں نظر آتی ہے۔ گوداوری اور اس کے معاونوں، نیرا اور مون کے کناروں پر گھوڑوں کی بھی ایک قسم تیار ہوتی تھی جو اپنی سرعت اور قوت کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے گھوڑوں میں جواب نہ رکھتے تھے۔

مہاراشٹر کی آبادی بیشتر ہندو تھی۔ مگر مسلمان بادشاہوں کی وجہ سے ایک معقول گروہ ان لوگوں کا بھی آباد ہو گیا تھا جو نسل و مذہب کے اعتبار سے مختلف تھے۔ پہاڑوں میں، علی الخصوص شمال کی طرف، بھیل، کولی وغیرہ قدیم جنگلی قومیں بھی کثیر تعداد میں آباد تھیں، ہندوؤں میں، دوسرے اقطاع کی طرح یہاں بھی منو کی صرف چار معین و مسلّم ذاتوں کی بجائے صدہا ذیلی ذاتیں بن گئی تھیں یہ کسی معقول اصول پر مبنی نہ تھیں لیکن اس نقص سے ان کی شدت و پختگی میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔ برہمن کا نام، نسب کا اہتمام اور دماغی تفوق بہرحال قائم تھا اور آگے چل کر

(پیشوا کی بدولت) عملاً شاہی اقتدار بھی اسی کے قبضے میں آنے والا تھا۔ لیکن نسل بانسل سے وہ دنیوی معاملات میں منہمک تھا جس نے عوام الناس کا حسن اعتقاد کھو دیا اور اکثر صورتوں میں خود اس نے اپنا کوئی تقدس باقی نہ رکھا تھا، حتیٰ کہ مرہٹوں کے روحانی مقتدیٰ اکثر نیچ ذات کے لوگ، اور طرفہ تر یہ کہ (بعض اوقات) مسلمان ہوا کرتے تھے اسی طرح مرہٹوں میں جو لوگ ولی اللہ مانے جاتے تھے، ان میں ہر مذہب و درجے کے اشخاص شامل تھے۔ اسلام کے پیرو، جین مت کے پرستار، نیچ ذات کے اچھوت اور قدیم وحشی، غرض ہر قوم و قسم کا آدمی وسیع مشرب اور اصولاً بت پرست ہندوؤں کی عقیدت و پرستش کا حقدار بن سکتا تھا۔ دوسرے علاقے کے ہندوؤں کی طرح یہاں بھی صحیح النسب راجپوت قدیم جنگی ذات کے اخلاف اور دو جنمے ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ اسی لئے اونچے رتبے کے جنگجو مرہٹوں کا راجپوت ہونے کا دعویٰ بظاہر بالکل بے بنیاد نہ تھا اور اسی بنیاد پر انھوں نے مسلمانوں کی مثل، اپنی عورتوں کو پردے میں رکھنا جائز کر لیا تھا، بجز اس صورت کے کہ کوئی بیوی سرکاری خدمات خود انجام دیتی ہو۔ آگے ہم پڑھیں گے کہ سیواجی ماں کی طرف سے شاہی خاندان میں ہونے کا فخر کرتا تھا۔ تعلیم و تعلّم صرف برہمنوں تک محدود تھا مگر خود برہمنوں میں بہت سے لوگ سخت جاہل تھے۔ سیواجی، حیدر علی کی طرح بالکل لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ مرہٹوں کا عام دیوتا مہادیو یا شو تھا جیسا کہ ان کے مشہور نعرۂ جنگ "ہر ہر مہادیو" سے ظاہر ہے۔

جس زمانے سے ہماری داستان شروع ہوتی ہے، اس وقت میں دکن معمول سے بڑھکر خلفشار کی حالت میں گرفتار تھا۔ قدیم سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھرا تو (چودھویں صدی ہجری کے اواخر میں مہاراشٹر میں ایک زبردست اسلامی خاندان شاہی جو بہمنی کہلاتا ہے، حکمرانی کرنے لگا۔ اس کے آگے جنوب میں ہندوؤں کی ایک حریف حکومت اپنے پائے تخت بیجانگر کے نام سے مشہور ہوئی۔ سلطنت بہمنی کی آگے چلکر پانچ جداگانہ بادشاہیاں بن گئیں اور پھر ان میں سے دو کو باقی تین نے ضم کر لیا۔ یہ تین بڑی بادشاہیاں احمد نگر، بیجاپور، اور گولکنڈہ تھیں۔ کچھ مدت بعد، احمد نگر نے مغل شہنشاہ اکبر کے جذبۂ کشورستانی کو

باب پنجم

تحریک دی اور اس مملکت کے الحاق کی اس نے ابتدا اور اس کے جانشینوں نے تکمیل کر دی۔ جن دنوں یہ سلطنت زوال کی منزلیں طے کر رہی تھی، ایک مرہٹہ سپاہی شاہ جی نے بہت شہرت پائی۔ یہ ادنیٰ نسب کا قسمت آزما شخص تھا مگر مغل فوجوں کے مقابلے میں احمد نگر کی رہی سہی سلطنت کو کچھ روز اور بچانے میں، اس نے بھی حصّہ لیا۔ پھر فاتحین سے صلح کر لی (۱۶۳۶ء) اور بعد ازاں بیجاپور کی سلک ملازمت میں داخل ہو گیا۔ جس زمانے میں شاہ جہاں کا بیٹا شہزادہ اورنگ زیب دکن کی باقی دو اسلامی ریاستوں کو بھی فتح کر لینے کی فکر میں تھا۔ شاہ جی نے اپنے آقا (شاہ بیجاپور) کو کرناٹک کی لڑائی اور تازہ علاقے فتح کرنے میں مدد دی حالانکہ یہ فتوحات پائدار نہ تھیں اور اس وقت قابو طلب، طاقتور اور بڑھتے ہوئے مغلوں کے مقابلے میں سلطنت کے وسائل کو محفوظ و یکجا کرنے اور اس کے علاقے محدود کرنے کی ضرورت تھی نہ کہ ان میں اضافہ کرنے کی۔

بہر حال، یہی شاہ جی اس غیر معمولی شخص کا باپ تھا جس کے حالات زندگی یہاں لکھنے مقصود ہیں۔

دنیا کے ہر بڑے آدمی میں فطری طور پر ایک اُپج ہوا کرتی ہے لیکن اس کے خصائل کے بنانے اور مقاصد حیات کو اختیار کرنے میں گرد و پیش کے حالات کا دخل اسی قدر ہوتا ہے جتنا معمولی اشخاص کے خصائل و کردار کی ساخت میں یہی حال سیواجی کا ہے۔ وہ (۱۶۲۷ء میں) سیونری کے قلعے میں پیدا ہوا جب کہ پرانی سیاسی تنظیم میں انتشار اور گرد و پیش کے شاہی خاندان معرضِ زوال و تباہی میں تھے۔ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوا جو تین مختلف بادشاہوں کی ملازمت کر کے جو تھے کی تخریب میں ممد و مددگار تھا۔ باپ سے الگ ایسی چاہنے والی ماں کے آغوش میں پلا جو از رہ فخر اپنا نسب مہاراشٹر کے راجپوت راجاؤں سے ملاتی تھی پھر کئی بار اس کی ماں مغل سپاہیوں سے بچ کر فرار ہوئی، تو سیواجی بچپن میں اس کے ساتھ تھا اور آخر میں جب وہ گرفتار ہوئی تو کسی نامعلوم دوست نے سیواجی کو پہاڑیوں میں لے جا کر چھپا دیا۔ انجام کار وہ ایک دانشمند، وفادار، محبّ وطن اور دیں دار برہمن داداجی کونڈ دیو کی تربیت میں دے دیا گیا، جو اس کے باپ کی پونا کی جاگیر کا

کارندہ تھا، اور جس کی تربیت میں سیواجی نے گھوڑے کی سواری اور دوسری جنگی ورزشوں میں بڑی مہارت حاصل کی۔ مذہب کی ریت رسم پابندی سے ادا کرنی سیکھی اور دیوتاؤں اور سورماؤں کے بھجن سن سن کر عقیدت و ہمدردی سے جوش میں آنے کا سبق لیا۔ اسی زمانے میں دلیر و جفاکش پہاڑی باشندوں کے معیت میں اونچے کراڑوں سے جست لگانا، تیز نالوں کو پھلانگنا، خونخوار شیر کا بھٹ تک کھوج لگانا سیکھا۔ اور ان سیدھے سادے لوگوں سے اپنی ہوشیاری، بے تکلفی، ظرافت ہٹیلے پن اور طبعی شانِ تحکم پر تحسین و آفریں حاصل کی۔ انھی سیر سپاٹوں میں وہ اس علاقے کے چھوٹے بڑے راستوں اور قلعوں سے بخوبی واقف ہوگیا کہ ان کی حالت کیا ہے اور کس موقع سے ان پر حملہ یا مدافعت ہو سکتی ہے۔ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بدچلن رفیقوں نے اسے اور بھی مشتبہ نوعیت کے کاموں پر لگا دیا اور آخر وفادار استاد کی تنبیہ اور جاگیر کے انتظامی کاموں کی تفویض سے وہ ان حرکتوں کو چھوڑ کر زیادہ سنجیدہ اور معزز مشاغل کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے حسن اخلاق اور مصالحانہ روش سے عزت دار طبقے کے افراد میں بھی وہی قبولیت پائی جو پہلے جنگلی پہاڑیوں میں حاصل ہو چکی تھی سیواجی کے ابتدائی حالات اور مشاغل کا یہ خلاصہ تھا۔ انھی سے اس کے آیندہ طرز زندگی میں بہت بڑی مدد ملی اور یہ اس کا بہت اچھا قدرتی آغاز ہو گئے۔

مشرق کے بڑے بڑے لوگ اکثر لڑکپن ہی میں حیرت انگیز ذہانت و ہمت کا ثبوت دیتے ہیں سیواجی سولہ برس کا تھا جب اسے آزاد حکومت کے ارمان آنے لگے۔ اس کی تیز نگاہ نے بہت جلد تاڑ لیا کہ بیجاپور کی حکومت جنوبی فتوحات میں منہمک ہے اور بہت سے بُری آب ہوا کے قلعوں میں فوج متعین کرنے سے غفلت برت رہی ہے اور یہ قلعے وہیں کے موروثی زمینداروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے ہیں۔ پُونا کے جنوب میں تُورنا کا قلعہ بہت مستحکم مقام پر واقع تھا، سیواجی نے اپنے تئیں سب سے ابتدائی رفیقوں کی مدد سے قلعہ دار کو آمادہ کر لیا کہ وہ یہ قلعہ سیواجی کے حوالے کر دے (۱۶۴۶ء) پھر بادشاہِ بیجاپور کی خدمت میں اپنے آدمی روانہ کئے اور نہایت جوش و خروش سے اپنی خدمت و عبودیت اور پہلے حاکم سے زیادہ مالگزاری ادا کرنے کا اقرار کیا۔ ساتھ ہی بااثر

لوگوں کو معقول رشوتیں پیش کیں جس سے اس کی کارروائی کی کوئی باضابطہ تحقیقات ہونے نہ پائی اس عرصے میں اُس نے لوُرنا کو مدافعت کے لئے زیادہ مستحکم بنالیا وہاں ایک دفینہ بھی ہاتھ آیا جسے سیواجی نے خوش اعتقادی یا ہوشیاری سے بھوانی دیوی کا عطیہ ظاہر کیا اور اپنے ساتھیوں کی اسلحہ بندی کے علاوہ اسی روپے سے ایک قلعہ راج گڑھ نامی تیار کرایا۔

باپ ہی کی طرف سے بوڑھے اتالیق نے ہرچند منع کیا مگر سیواجی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر یہ برہمن بھی سیواجی کا ہمخیال ہوگیا اور ان کوششوں کو مذہب اور وطن کیلئے کام میں لگانے کے خیال سے، مرتے وقت پسندیدگی ظاہر کی اور نوجوان قسمت آزما کو وصیت کی کہ "برہمن، گائے اور کسان کی حفاظت کرے۔ مندروں کو خراب ہونے سے بچائے اور جو دولت سامنے ہے، اسی طرف قدم بڑھائے۔" سیواجی یہ حکم نہ بھولا اور ان وصیتوں کی بدولت آیندہ سے اپنی اور نیز دوسروں کی نظر میں قزاقوں کا سرگروہ ہونے کی بجائے ہند و آزادی قومیت اور مذہب کا حامی اور مددگار بن گیا۔

اب اس نے باپ کی جاگیر کا کام سنبھالا اور مصارف دائرہ کی زیادتی کے معقول نما عذر پر مالگزاری ادا کرنے سے بچتا رہا۔ پھر اس نے پُونا کے شمال میں ایک خاصے بڑے قلعے، چاکن، پر چپکے سے قبضہ کر لیا اور قلعہ دار کو اپنی یا اپنے باپ کی ملازمت میں اُسی جگہ رہنے دیا اور اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ نواح کے لوگوں سے اچھا برتاو کیا جائے۔ اس سے بھی بڑھکر قابلِ ذکر کندانہ کا قبضہ تھا جہاں کہ قلعہ دار کو اس نے رشوت دی اور قلعے کا نام بدل کر سن گڑھ (یا شیر کا بھٹ) قرار دیا۔ اس کی ساس کا بھائی باجی موہیتے شاہ جی کی طرف سے سوپا کا حاکم تھا اور سیواجی کے مطالبات پر متوجہ نہ ہوا۔ اس پر سیواجی نے رات کو چھاپا مارا اور موہیتے اور اس کے آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں سے بعض سیواجی کی ملازمت میں داخل ہوگئے اور بعض کو موہیتے سمیت شاہ جی کے پاس کرناٹک روانہ کر دیا گیا۔ ایک اور بڑے قلعے یعنی پورندھر کا حاکم یکایک فوت ہوگیا اور اس کے تین بیٹوں میں جانشینی کے لئے جھگڑا ہوا۔ سیواجی نے ان میں صلح کرانے کے بہانے اندر پہنچکر

سب کو گرفتار کر لیا اور پھر اپنی شیوا بیانی سے انھیں ایسا شیفتہ بنایا کہ وہ اس کے وفادار ملازم ہو گئے۔

دلیری اور مکر و فریب کے ان کاموں میں خون کا ایک قطرہ تک نہیں گرا۔ مرہٹہ قوم بد نماز دوکوب پر کام نکال لینے کو ترجیح دیتی ہے۔ اب باپ کی جاگیر کے علاوہ چاکن سے تیرا تک بہت مستحکم علاقہ سیواجی کے قبضے میں تھا جس میں لوٹ مار کا مال حفاظت سے جمع کیا جا سکتا تھا لہٰذا اس کو مستقر بنا کے اب اس نے میدانی علاقے میں اترنے اور حکومت بیجاپور سے دوبدو مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

گھاٹ مٹھا کی گھاٹیوں کو ماول اور اسی لئے وہاں کے باشندوں کو ماولی کہتے ہیں اور اسی کے معنی پیادہ سپاہی کے بھی ہو گئے ہیں۔ سیواجی نے ان کی تعداد میں اضافہ کیا اور سوپا میں جو گھوڑے ہاتھ آئے تھے، انھی سے تین سو سواروں کا رسالہ بنا کر ایک شاہی بدرقے پر جو مال و زر کے ہمراہ تھا، بے خبری میں حملہ کر دیا۔ یہ مال غنیمت راج گڑھ میں محفوظ کر دینے کے بعد اس نے پونا کے شمال مغرب میں تیز تواتر کے ساتھ ایک نہ دو پورے چھ پہاڑی گڑھ لے لئے اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ تالا، گوسالا اور ایری کی سلامی دار ٹیکری، یہ تینوں گڑھ مسخر ہو گئے۔ کوکن پر تاخت کر کے بہت سے مالدار مقامات کو لوٹا اور آخر میں اس کے ایک برہمن ملازم نے کلیان کو ساتھ کی چند گڑھیوں سمیت حاصل کر لیا۔ اس کامیابی سے سیواجی پھولا نہ سمایا۔ اس نے یہ ضلع اسی برہمن کی فوجی تحویل میں دے دیا۔ معتدل اور عام پسند ضوابط جاری کئے۔ قلعہ دار کلیان سے بہ اخلاق پیش آیا اور بیجاپور جانے اور اس کھلی ہوئی بغاوت کی خبر سنانے کی اجازت دی۔ بیجاپور کا امیر البحر سیدی جنوبی ساحل پر قابض تھا اس کی روک تھام کی غرض سے سیواجی نے دو نئے قلعے تیار کئے۔

شاہ بیجاپور کو سخت غصہ آیا۔ اس نے شاہ جی کو دھوکے سے اسی کے ہم وطن باجی گھوڑپرے کے ہاتھ سے پکڑوا بلایا اور دھمکی دی کہ سیواجی نے اطاعت نہیں قبول کی تو شاہ جی کو قتل کرا دیا جائے گا (۱۶۴۹ء) لیکن سیواجی نے جواب تک مغل شہنشاہ کو چھیڑنے سے پورا اجتناب کرتا رہا تھا، اسی کی وساطت سے باپ کو رہائی دلوائی۔ پھر بھی شاہ جی کو چار برس تک بیجاپور سے باہر جانے کی اجازت نہ ملی

تاآنکہ کرناٹک کا فساد رفع دفع ہوگیا اور سیواجی کو خاموش دیکھکر بادشاہ نے شاہ جی کے چھوڑ دینے میں کچھ مضائقہ نہ سمجھا۔ خود اس سے قول و قرار لے لئے گئے کہ اپنے گرفتار کرانے والے سے کوئی جھگڑا نہ کرے گا مگر اس نے اپنا انتقام بیٹے کے تفویض کیا جس نے آیندہ بھاری سود کے ساتھ اصل ادا کیا۔ سیواجی کو بھی پھانسنے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ ہمیشہ چوکس رہتا تھا اس نے دشمنوں پر انھی کا وار اُلٹ دیا اور انھیں جنگلوں میں مار بھگایا۔ شاہ جی کی رہائی بیٹے کی دست درازی تازہ کرنے کا اعلان تھی۔

جاولی کا راجہ ورنا اور کرشنا کے درمیان خاصے بڑے علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ وہ سیواجی کا ہمقوم اور اس سے دوستانہ تعلقات رکھنے چاہتا تھا مگر سیوا کی اطاعت یا بیجاپور سے بغاوت اسے منظور نہ تھی وہ طاقتور، دلیر، ایک جنگجو برادری کا سرگروہ اور صاحب فوج و سپاہ تھا۔ سیواجی کو شکایت تھی کہ اس راجہ نے سیواجی کا پیچھا کرنے والوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دی تھی۔ مگر وہ اپنا کام خفیہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دو قاصد چند رراؤ کے دربار میں حاضر ہوئے اور سیواجی کیلئے راجہ کی بیٹی سے شادی کا پیام دیا۔ تجویز یہ تھی کہ یہ قاصد اسی گفتگو کے دوران میں موقع پاکر چند رراؤ کا کام تمام کردیں اور سیواجی نے بھی اس مجرمانہ ارادے کو پسند کیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سپاہی چپکے سے ایسے موقع پر لے آیا کہ قتل کے بعد جو ہنگامہ مچے اس وقت چھاپا مار سکیں۔ غرض راجہ اور اس کا بھائی مارے گئے۔ قاتل بچ کر نکل گئے اور بستی والے شدید مزاحمت کرنے کے بعد مغلوب کر لئے گئے۔ اس کے دیہات پر بھی سیواجی قابض ہوگیا لیکن عام طور پر ہندو آبادی کو اپنے ایک رئیس کے ساتھ ایسی دغا اور ظلم کا برتاؤ ناگوار گزرا۔ کرشنا اور نیرا کے درمیان ایک اور بڑی بستی روہرا تھی اس میں بھی رات کے وقت کمند ڈال کے داخل ہوا اور وہاں کا حاکم مارا گیا۔ یہ اس کی ریاست سازی میں دوسری منزل تھی جس کی یادگار میں پرتاب گڑھ تعمیر ہوا اور پہلا پیشوا شامراج پنت مقرر کیا گیا۔

اب تک سیواجی مغلوں کے علاقے سے ہمیشہ احتراز کرتا رہا تھا۔ اس نے شہنشاہی ملازمت میں داخل ہونے کی درخواستیں بھی دی تھیں اور شہزادہ اورنگ زیب جوان دنوں باپ کی طرف سے دکن کا والی تھا، ایسے آدمی سے

دوستانہ معاملہ کرنے کی فکر میں تھا جس سے بیجاپور وگولکنڈہ کی تسخیر کا منصوبہ پورا کرنے میں بیش قیمت مدد مل سکتی تھی، مگر جب یہ شہزادہ بیجاپور پر فوج کشی کر رہا تھا، تو سیواجی نے اچھے برے پہلوؤں پر نظر ڈال کر خود غرضی سے یہی فیصلہ کیا کہ اس وقت خود شہنشاہی علاقے میں ڈاکہ ڈالنا زیادہ نفع بخش ہوگا۔ چنانچہ وہ رات کے وقت جنیر کے آباد قصبے پر جا پڑا اور وہاں سے بہت کچھ مال اور سامان لوٹ کر لے گیا جس میں دو سو گھوڑے بھی تھے۔ اس دلیری سے بڑھکر یہ کہ چند ہی روز بعد اس نے احمد نگر پر چھاپا مارا اور سات سو گھوڑے اور چار ہاتھی اڑالایا (۱۶۵۷ء) آیندہ سے اس کے طریق جنگ میں بھی کافی تبدیلی ہوگئی۔ ہر چند ماولی اور مرہٹہ پیادے اب بھی ویسے ہی تیز کار و مفید مطلب تھے لیکن ان کے علاوہ اس نے معقول سوار فوج مرتب کی اور بہت کچھ تامل و تردد کے بعد افغان یا پٹھان سپاہیوں کو بھی پیادوں میں بھرتی کرنے پر رضامند ہوگیا جو اس کی ابتدائی تاخت تاراج میں تو چنداں کارآمد نہ ہو سکتے تھے لیکن اب جب کہ وہ مستقل ریاست کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور باقاعدہ فوجوں سے بھی کبھی کبھی میدان میں جم کر مقابلہ کرنے لگا تھا، ان سپاہیوں کی ضرورت تھی۔

مگر اُس کا اندازہ اِس بار غلط نکلا۔ اورنگ زیب کی فوج اور چالوں نے اتنی جلد کامیابی پائی کہ بیجاپور محصور ہوگیا اور قریب تھا کہ فتح ہو جائے۔ یہ دیکھکر سیواجی گھبرایا کہ فاتح اس کی دراز دستیوں کا بہت بُری طرح انتقام لیگا اور یہ وقت آنے سے پہلے بہت ذلت کے ساتھ منت سماجت کرنے لگا کہ اسنتے میں شاہجہاں کی سخت علالت کی اطلاع نے ہندوستان کی سیاسیات میں یک بہ یک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ اورنگ زیب بہ عجلت بیجاپور سے صلح کی شرطیں طے کرکے شمال کی طرف روانہ ہوگیا، اور بوڑھے شہنشاہ کی معزولی کے بعد خود سلطنت مغلیہ کا مالک بن بیٹھا۔ سیواجی نے اپنی اطاعت کے عہد و پیمان کی تجدید کی اور یہ قابل پذیرائی بات بنائی کہ فوج میں اضافہ کرنے کا اصلی منشا یہ تھا کہ شہنشاہ کی فوج کشی میں بہتر خدمت انجام دے سکے۔ اس کے معاوضے میں اس نے اپنے خاندان کے بعض موروثی حقوق جو بادشاہی اضلاع میں وصول مالگزاری کے جلد وہیں حاصل تھے، طلب کئے اور یہ بھی اشارہ کیا کہ بادشاہی قلعہ دار کی نسبت میں کوکن کا بہتر انتظام کر سکتا ہوں۔

اورنگ زیب کی اپنی قسمت کی بازی لگی ہوئی تھی اس وقت مصالحت سے پیش آیا۔ سیواجی کو معافی دی اور کوکن میں لڑنے کی اجازت بھی لیکن شرط کی کہ وہ پانچ سو سوار بھیجے۔ یہ سوار نہیں بھیجے گئے اور نہ آیندہ مالگزاری کے حقوق کا مطالبہ ہوا جس پر اورنگ زیب نے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہلا رہے تھے اور اس بازی میں باہم بہت اچھے حریف تھے لیکن زیادہ سنگین مقابلے میں التوا ضرور واقع ہوگیا۔

بہر حال ادھر کا اشارہ پاتے ہی سیواجی نے بلا تاخیر پیشوا کو بہت سی فوج کے ساتھ کوکن روانہ کیا مگر سیدی نے اس پر خونریز فتح حاصل کی۔ پیشوا کو واپس بلا کر عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور یہی پہلی بڑی زک زیادہ خطرناک مصائب کا پیش خیمہ نظر آئی کیونکہ بیجاپور کے حکام نے اورنگ زیب سے شکست کھانے، باہمی نفاق اور بادشاہ کی صغر سنی کے باوجود بغاوت وانقلاب کے مدّعی کی سرکوبی ضروری سمجھی، اس سے قبل کہ وہ آیندہ پھر مغلوں سے اشتراک واتحاد کے لائق بن جائے۔ دربار کے ایک ممتاز امیر افضل خاں کے تحت میں بارہ ہزار آدمی کی چیدہ اور مرتب فوج فراہم کی گئی۔ افضل خان جنرل نے کی طرح لاف وگزاف کرتا تھا کہ چند روز میں سیواجی کو پابجولاں دربار میں حاضر کر دوں گا۔ اس مرہٹے کو بھی نظر آگیا کہ علانیہ مقابلہ خارج از بحث ہے لہٰذا اپنی پرانی پسندِ خاطر کیا دیوں پر اتر آیا۔ پرتاب گڑھ میں بند ہوکر سخت خوف واضطراب کا اظہار کیا اور افضل خاں جیسے نامور امیر کی شفاعت حاصل ہو سکے تو جملہ املاک سے دست برداری پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ سنکر اس کی خود پسندی کو تحریک ہوئی اس نے ایک برہمن کارندے پنتوجی گوپی ناتھ کو گفتگو کے لئے روانہ کیا۔ سرکاری اور علانیہ ملاقات کے بعد سیواجی آدھی رات کو پنتو سے ملنے گیا اور اپنے بھوانی دیوی کے نظر کردہ ہونے کی توجیہ سے بڑھکر، مخاطب (یعنی پنتو) کی مسلّمہ خود غرضی سے کام لیا اور اسے پوری طرح اپنی طرف ملا لیا۔ (دیوی کے) مقصد عظمیٰ کی خاطر طے پاگیا کہ افضل خاں کی یادگار بھینٹ چڑھائی جائے۔ چنانچہ پنتو کی مدد سے اس کے ساتھ تخلئے کی ملاقات ٹھیری۔ صرف ایک نوکر خان کے ہمراہ تھا باقی فوج فاصلے پر رہی اور مرہٹوں کو چوری سے گھنے جنگل میں جا بہ جا

چھپا دیا گیا۔ ادھر، سیواجی کا مورخ لکھتا ہے کہ اس نے خاص طور پر اشنان وغیرہ کر کے اپنی ماتا کے قدموں میں سر رکھا اور اس کی برکت حاصل کی" پھر کپڑوں کے نیچے زرہ پہنی اور ایک خنجر چھپا لیا۔ وہ بائیں ہاتھ میں "واگ نگ" (= بچھوا) چھپائے ہوئے تھا جو ایک مہلک ہتھیار ہے اور شیر کے پنجے سے مشابہ اور اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس طرح تیار ہو کر وہ ظاہرا ڈرتا، لرزتا آہستہ آہستہ بے خبر سپہ سالار کی طرف بڑھا جو صرف ململ کا لباس پہنے ہوئے تھا اور دوستانہ رسم کے مطابق ہم آغوش ہوتے ہی اس کے جسم میں بچھوا بھونک دیا اور ساتھ ہی خنجر سے وار کیا۔ مرتے ہوئے سردار نے تلوار چلائی تھی مگر سیواجی کی زرہ نے اسے بچا لیا۔ وہ افضل خاں کا سر کاٹ کر پرتاب گڈھ لے گیا اور ساتھ ہی اس کی فوج پر عام حملہ کر دیا۔ یہ سب سپاہی بہت جلد یا قتل و گرفتار یا منتشر ہو گئے (۱۶۵۹ء) افضل خاں کے اہل و عیال کو ایک مرہٹے نے بچا لیا جسے انھوں نے رشوت دی تھی۔ اس کو نافرمانی کی پاداش میں سیواجی نے قتل کر دیا اگرچہ خود اکثر قیدیوں کو چھوڑ دیا اور اچھا برتاؤ کیا۔ اپنی برادری کے ایک معزز آدمی کو بھی جس نے بیجاپور کی نوکری چھوڑ کر سیواجی کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا۔ اس نے رہائی دی۔ مگر حریف کے اور بہت سے مرہٹہ سپاہی اس کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔

اس غدارانہ خونی فعل پر مہاراشٹر میں بہت تحسین و آفریں ہوئی خود سیواجی کو ہاتھی، اونٹ، جنگی ساز و سامان بندوقوں اور مال و زر کے علاوہ چار ہزار گھوڑے مل گئے پنالا کا عمدہ قلعہ بھی اسی ہنگامے کی پریشانی میں اس کے حوالے کر دیا گیا اور یہی پوان گڈھ پر گزری۔ دوسرے سیواجی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وسنت گڈھ وغیرہ کئی قلعے فتح کئے اور کرشنا کے کنارے جبراً نذرانے وصول کئے۔ پھر ایک سردار کو جو مقابلے میں بھیجا گیا تھا، شکست دے کر قریب قریب پائے تخت بیجاپور کے دروازوں تک لوٹ مار کشت و خون سے تمام دیہات میں خلفشار اور تاراجی پھیلا دی۔ پھر یکایک پہاڑوں کے نیچے کی طرف دوڑ گیا اور دابھول کو جا لیا۔ راجاپور سے بھاری تاوان وصول کیا اور لوگ یہی سمجھتے رہے کہ وہ ابھی پہاڑوں کے بالائی علاقے میں ہے۔ اس طرح وقت واحد میں نشیبی اور

بالائی علاقوں کی لوٹ سے راج گڈھ مالامال ہوگیا۔

اودھر بیجاپور کی پراگندہ حکومت افضل خاں کا یہ حشر سنکر سخت غضب ناک اور دہشت زدہ ہوئی حکام نے باہمی مخالفت کو تھوڑی دیر کے لئے بالائے طاق رکھکر، اتنی ہی بڑی دوسری فوج صلابت خاں کے ماتحت روانہ کی اور قرار پایا کہ واڑی کے ساونت اور سیدھی کوکن کی طرف سے حملہ کر کے اس مہم میں مدد دیں۔ سیواجی نے بھی ہر طرف مقابلے کا انتظام کیا مگر غلطی یہ کی کہ پنلّا کی مدافعت اپنے ذمے لی اور وہاں چار مہینے تک ایسا محصور رہا کہ اپنی فوجوں کی ذاتی نگرانی اور حسب عادت مستعدی سے کام نہ لے سکا۔ پھر خود پنلّا میں مقابلہ کرنا اور بچ کر نکلنا، دونوں ناممکن نظر آئے تو اس نے ہتھیار ڈال دینے کی تجویز کی اور صلابت خاں سے مل کر سب ضروری باتیں خود طے کیں۔ محاصرین کو بالکل اطمینان ہوگیا کہ اب ان کی محنت ٹھکانے لگی اور دوسرے دن قلعے کے دروازے کھل جائیں گے۔ وہ بے خبر سور ہے تھے کہ صبح ہوتے خبر ملی کہ رات کے اندھیرے میں سیواجی چند جمعیت کے ساتھ ان کے لشکر سے نکل گیا اور رنگنا جارہا ہے۔ فوراً تعاقب میں لوگ دوڑائے گئے اور رنگنا سے چھ میل کے فاصلے پر مفروریں کو جالیا۔ تب سیواجی نے باجی پورووے کو ایک تنگ درے پر غنیم کے روکنے کا کام سپرد کیا اور خود مارا مار آگے چلا۔ پوروو ے ایک زمانے میں سیواجی کا حریف اور اب وفادار خادم تھا اس کی جمعیت نے تین مرتبہ تعاقب کرنے والوں کو پسپا کیا لیکن چوتھی مرتبہ مقتول افضل خاں کا بیٹا اور باپ کے خون کا انتقام لینے والا، فاضل خاں انھیں لیکر بڑھا اور شدید مقابلے کے بعد درہ چھین لیا۔ آدھے مدافعین مارے گئے اور انھی میں ان کا بہادر سردار پوروو ے بھی تھا لیکن عین دم توڑتے وقت پنلّا سے ایک توپ سر ہوئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کا محبوب آقا محفوظ و سلامت ہے۔ باقی جماعت صحیح سلامت نکل گئی اور دشمن کی آنکھوں کے سامنے سے پوروو ے کی لاش لے گئی۔ (۱۶۶۰ء)۔

اب شاہ بیجاپور خود میدان میں آیا پنلّا اور پوان گڈھ وغیرہ سیواجی کے بہت سے جدید مقبوضات دوبارہ فتح کئے راجاپور پر کو یورش کر کے تاراج کیا۔

سرنگر پور کی تسخیر کی۔ یہ ایک مرہٹہ رئیس کا مستقر تھا جو لڑائی میں مارا گیا۔ اس واقعے پر بھی ہندوؤں کو صدمہ پہنچا اور سیواجی نے کچھ تو گناہ کی تلافی اور کچھ واقعی روز افزوں توہم پرستی کی بنا پر آیندہ سے مذہبی ریت رسم کی زیادہ پابندی شروع کی اور پرتاب گڑھ میں بھوانی دیوی کا ایک مندر بنایا۔ اس عرصے میں سیدی سے اس کی لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی جیت ہوئی کبھی ہار لیکن تھوڑے دن بعد وہ یکایک ایک زیادہ طمع انگیز شکار پر جھپٹا۔ یہ وہی باجی گھوڑپڑے تھا جس نے اس کے باپ کو پھانسا اور باپ نے سیواجی کو بدلہ لینے کی نصیحت کی تھی گھوڑپڑے اب خود باغی سیواجی کے خلاف کوچ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اچانک سیواجی نے اسے خود اس کے اہل و عیال میں جا لیا اور کنبے کے اکثر افراد سمیت، کام تمام کر کے ان کا مسکن لوٹ لیا اور بلا مزاحمت واپس ہو گیا۔

کرناٹک میں ہنگامہ و فساد کی وجہ سے حکومت کو وہ فوج واپس بلانی پڑی جو سیواجی کے واسطے نامزد ہوئی تھی۔ پس سیواجی کو فرصت مل گئی کہ واڑی کے ساونتوں کو مغلوب اور گھاٹ کے اوپر کے اکثر تازہ نقصانات کی تلافی کر لے۔ اب اس کے پاس کئی بندرگاہیں ہو گئیں۔ اس نے بیڑا بنانا شروع کیا اور گوآ سے توپیں منگوائیں۔ معلوم ہوتا ہے شاہ جی کی کوشش سے بالآخر بیجا پور کے ساتھ صلح ہو گئی (۱۶۶۲ء) بوڑھا باپ گھوڑپڑے کے قتل سے نہایت خوش ہوا اور بیٹے سے ملنے آیا جس نے باپ کی عقیدت مندی کے ساتھ خاطر تواضع کی۔

مرہٹوں کا مورخ لکھتا ہے کہ اب سیواجی پوری کوکن کی سرزمین پر کلیان سے گوآ تک، قابض تھا جو ساحل بحر پر طول بلد کے چار درجوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اور بھیما سے ورناتک گھاٹ مٹھا کا ایک سو ساٹھ میل عریض علاقہ بھی اس کے تصرف میں آگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج میں پچاس ہزار پیادہ اور سات ہزار سوار تھے۔ اس نے اپنا مستقر بھی بدل کر رائے ری میں منتقل کیا اسے رائے گڑھ موسوم کیا اور وسیع پیمانے پر مورچہ بندی کی۔ پھر مغلوں کے خلاف ہنگامہ آرائی کا آغاز کیا۔ چنانچہ اس کے ایک سردار نے دور تک شمال کی گڑھیاں تسخیر کیں تو دوسرے نے خاص اورنگ آباد کے مضافات تک تاخت کی اور تمام دیہات سے

روپیہ وصول کیا اور لوگوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔
شہنشاہ نے اپنے نائب شایستہ خاں کو حکم دیا کہ ان گستاخ باغیوں کی سرکوبی کرے۔ چاکنا کا محاصرہ کیا گیا مگر وہ دو مہینے تک اڑا رہا اور جب مجبور ہو کر اطاعت قبول کی تو اس کے بہادر سردار نے سیواجی کی ملازمت چھوڑ کر شہنشاہ کی نوکری قبول کرنے سے انکار کیا۔ شایستہ خاں نے پونا پر قبضہ کر لیا اور اسی حویلی میں قیام کیا جہاں پہلے سیواجی اور اس کی ماں رہتی تھی شہر کے سامنے اونچے پہاڑ پر سنگڈھ واقع تھا اور خود پونا کے گرد کوئی فصیل نہ تھی۔ سیواجی اسی محفوظ پہاڑی گڑھی میں آیا اور اپنی کثیر جمعیت کو پونا کے راستے پر مقرر کر کے چوری سے ایک برات کے ساتھ چیدہ جوق لیکر بستی میں داخل ہوا اور اندھیرے میں اپنی دیکھی بھالی حویلی میں کسی طرح گھس گیا حویلی میں جو لوگ تھے، اکثر مارے گئے۔ شایستہ خاں گھبرا کر کھڑکی کے راستے اتر رہا تھا اسی حال میں اس کی انگلی اڑا دی گئی اور پھر سیواجی اطمینان سے اپنی فوج میں آگیا اور مغل فوج دیکھتی رہ گئی کہ وہ مشعلوں کی روشنی میں پھر اپنے پہاڑی مامن میں جا رہا ہے۔ مغل سواروں کا ایک دستہ جوش تہوّر میں پہاڑی کے دامن تک بڑھ آیا تھا۔ اس پر مرہٹہ سواروں نے حملہ کیا اور پہلی مرتبہ شاہی فوج کو بھگا کر تعاقّب کیا۔
شایستہ خاں بددل ہو گیا اور واپس بلا لیا گیا۔ مگر اس کا جانشین کچھ کرنے نہ پایا تھا کہ سیواجی نے اپنی ترکتاز کا دائرہ وسیع کر لیا اور چار ہزار سواروں سے سورت پر تاخت کی۔ انگریز سوداگروں نے اس کا مقابلہ کیا مگر شہر کو اس نے چھ روز تک خوب لوٹا اور بہت سامال لیکر واپس ہوا تو باپ کے مرنے کی خبر سنی (۱۶۶۴ء) تب اس نے راجا کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا سکّہ ضرب کرایا۔
اب ایک طرف تو اس کی کشتیاں سمندر میں گھومتی پھرتی اور حجاز کے حاجیوں کو پکڑ کر فدیے وصول کر رہی تھیں اور دوسری طرف خشکی پر اس کی تاخت تاراج کا سلسلہ اورنگ آباد تک وسیع ہو گیا تھا۔ اسی میں ایک بار اس نے احمد نگر کی بستی لوٹ لی۔ بیجاپور سے دو سردار کوکن فتح کرنے آئے تھے ان کو سیواجی نے اچانک جا لیا اور سخت کشت و خون کے بعد شکست دی۔ پھر مغلوں کا رخ کیا اور عین اس وقت کہ مغلوں کے لشکر گاہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا یکایک پلٹ کر ساحل پر چلا آیا اور

کشتیوں میں بیٹھکر بارسی لور پہنچا جو گوآ سے ایک سو تیس میل جنوب میں ہے اور اسی کے ساتھ بہت سے مواضع لوٹ کر فوج کو خشکی کے راستے واپس روانہ کیا اور خود طوفان سے سخت تکلیف اٹھاتا ہوا، خلاف عادت سُست روی کے ساتھ اپنے مستقر تک پہنچ سکا۔ اس کے وہم پرست ہموطنوں نے اِس تکلیف بھرے بحری سفر کو بھوانی کی ناراضی پر محمول کیا کہ سیواجی نے ممنوعہ سمندر میں جانے کی جسارت کی تھی۔ اس نے خود بھی آئندہ یہ ناسازگار و تکلیف دہ بحری سفر کبھی نہیں کیا۔

اورنگ زیب کو اوّل تو اپنے ماتحتوں پر بھروسہ نہ تھا۔ دوسرے وہ سیواجی کو جیسے "موشِ کوہی" کہتا تھا، کچھ خاطر میں نہ لاتا تھا اور تیسرے بڑی فکر یہ تھی کہ شمال کے معاملات سے فرصت ملتے ہی خود جاکر ممالک دکن کی تسخیر کرے لہذا وہ یہاں کی لڑائیوں کو فوراً ختم کردینے کا چنداں خواہشمند نہ تھا۔ بایں ہمہ اس نے ایک بڑا لشکر روانہ کیا جس کے دو سپہ دار تھے ان دونوں سے شہنشاہ کو نفرت تھی مگر خیال تھا کہ وہ سیواجی کو اور آپس مین ایک دوسرے کو قابو میں رکھ سکیں گے۔ ان میں ایک تو مشہور راجپوت راجہ جے سنگھ تھا اور دوسرا ایک افغان سردار دلیر خاں۔ ممکن ہے کہ سیواجی اور اس کی قوم کو سب سے قدیم اور عالی نژاد سابقہ ہندو حکمراں خاندان کے مسلّمہ وارث کے خلاف لڑنے میں تامّل ہوا ہو کیونکہ وہ خود محض ایک نو دولت راجہ اور زیادہ سے زیادہ صرف ماں کی طرف سے اس قدیم نسل (راجپوت) میں داخل تھا۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ان کے آتے ہی سیواجی اور اس کے رفیق سردار ہمت ہار بیٹھے حالانکہ اس کے سپاہی پورندھر میں قلعہ بند ہو کر جے سنگھ کے خلاف بہادری سے لڑے مگر یہ قلعہ فتح ہونے نہ پایا تھا کہ سیواجی نے رسل و رسائل کے ذریعے اپنی سلامتی اور حصولِ معافی کا راستہ صاف کرلیا اور جے سنگھ سے مراسم خسروانہ کا اقرار لیکر اس راجپوت سپہ دار کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطاعت قبول کرلی جے سنگھ نے عنایت کا برتاؤ کیا اور سیواجی کو پہلے سے یقین تھا کہ وہ اس کے قول و قرار پر اعتماد کرسکتا ہے۔ دلیر خاں اتنی آسانی سے ماننے والا نہ تھا مگر سیواجی نے پورندھر کی کنجیاں خود جاکر اس کے سامنے پیش کیں تو وہ بھی رضامند ہو گیا۔ معافی کی شرطیں یہ قرار پائیں کہ اُس نے مغلوں کا جو علاقہ لیا تھا وہ سب واپس کیا اور اپنے باقی ماندہ علاقے پر شہنشاہ کا خراج گزار رئیس

بنکر رہنا قبول کیا۔ اس کے بیٹے کو اعزازی منصب کی تجویز ہوئی اور سیواجی نے درخواست کی کہ اسے بیجاپور میں اپنے خاص دعاوی منظور کرانے کے لئے کوشش کرنے کی اجازت دی جائے۔ اورنگ زیب نے یہ شرطیں منظور کرلیں اگرچہ ان آخرالذکر دعاوی کی کوئی صراحت نہ کی جن سے مشہور چوتھ اور سردیش مکھی کے حقوق مراد تھے، جن کی وصولی کے بہانے نہ صرف بیجاپور بلکہ آگے چلکر مرہٹوں نے تمام ہندوستان میں ہل چل اور لوٹ مار مچادی تھی۔ اس طرح مصالحت ہوگئی اور گو گھٹے ہوئے علاقے کا مگر باضابطہ رئیس تسلیم کرلیا گیا، تو سیواجی بیجاپور کے خلاف شہنشاہی لشکر کے ساتھ رہا اور شائستہ خدمات انجام دیں اور چند روز بعد بادشاہی بلاوے اور اسی جے سنگھ کے قول قرار کے بھروسے پر دہلی جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ دربار بادشاہی میں اپنے طرز عمل کی رہنمائی کے واسطے اس نے بہت کچھ احتیاطیں کیں اور عدم موجودگی میں اپنے لوگوں کی سلامتی اور انتظام کا بھی پورا بند وبست کردیا۔ پھر اپنے نوعمر بیٹے سنبھاجی، اور پانچ سو چیدہ سوار اور ایک ہزار ماولی ہمراہ لیکر وہ ادھر روانہ ہوا جہاں کی دنیا اس کے گذشتہ ماحول سے جس میں اس نے پرورش اور یہ کچھ شہرت پائی، بالکل مختلف تھی۔ اورنگ زیب سرد مہری اور حقارت سے پیش آیا۔ اس کامیاب قسمت آزما کو یہ رنگ دیکھکر بہت صدمہ ہوا جس کی غالباً ایک وجہ یہ ہوئی کہ بادشاہی ساز و سامان اور شان وطمطراق سے، جو اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی، اس پر از خود رعب پڑا اور گرد وپیش کے درباری آداب و اخلاق دیکھکر وہ چکرا سا گیا۔ اس نے منہ پھوڑ کر اپنی ناخوشی ظاہر کی تو تہذیب کے پیرائے میں ایسا ہوا کہ آپ کو دیکھکر حضرت جہاں پناہی کی آنکھ کو تراوت نہیں پہنچی۔ اس نے تحریری معروضہ پیش کیا جس میں دربار بادشاہی تک پہنچنے کے اسباب درج تھے اور اپنے بارے میں بادشاہ کے میلان کا گویا اندازہ کرنا مقصود تھا، تو اس سے بھی اختلاف بڑھا اور سیواجی کو چند ہی روز میں معلوم ہوگیا کہ آزاد ہونے کے باوجود وہ قریب قریب قیدی بنالیا گیا ہے۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس نامطبوع مقام سے نکل بھاگے اور پھر اپنے لشکر کو لیکر اس مغرور و متلون جابر سے دوبارہ انحراف وسرتابی کا نقارہ بجائے۔ اس غرض سے سیواجی نے اول تو اپنے سپاہیوں کے لئے نقل مکان کی اجازت لی کہ وہاں کی آب وہوا ان کے

باب پنجم

موافق نہیں آئی۔ یہ اجازت بے تامّل مل گئی مگر سیواجی پر نگرانی بڑھ گئی۔ پھر اس نے امرائے دربار سے راہ و رسم بڑھائی جو اسے تحفے بھیجتے اور سب سے بڑھکر جے سنگھ کے بیٹے کے اغماض پر تکیہ کیا کیونکہ اسے اپنے باپ کے قول و قرار کا اب تک پاس تھا۔ پھر یہ دیکھکر کہ وہ پوری طرح نظر بند ہو گیا ہے اس نے بیمار پڑنے کا حیلہ کیا۔ دوائیں کھائیں اور بہت ہی لاغر نظر آنے لگا۔ بستر علالت سے بھی اسے اپنے نئے دوستوں کے پاس یا شہر کے اندر اور باہر مساجد وغیرہ میں فقرا کو مٹھائیاں بھیجنے کی اجازت تھی اور یہ ہمہ وقت بڑے بڑے ٹوکروں میں بھیجی جاتی تھیں۔ ایک روز دن چڑھے سے معلوم ہوا کہ یہ مرد بیمار چھلاوا تھا۔ چھو نے پر اس کی بجائے ایک نوکر تھا اور سیواجی اپنے بیٹے سمیت انھی ٹوکروں کے غلاف میں بہت دور نکل چکا تھا۔ سنبھاجی کو متھرا میں ایک مرہٹہ برہمن کے پاس چھوڑ کر خود وہ اپنی جان چھپا کر بھاگا اور نو مہینے کے غیاب کے بعد پھر صحیح سلامت رائے گڑھ پہنچ گیا اور مغل ارباب سیاست کے خیالات و کردار کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات کا خزانہ لیکر آیا (۱۶۶۶ء) آتے ہی دست درازی کی جنگ شروع کی اور "صوبہ کلیان کے بڑے حصے کی دوبارہ تسخیر سے اس کے کوکن پہنچ جانے کا اعلان ہوا"[۱]

سیواجی کی فراری اور مسلسل کامیابیوں سے اورنگ زیب کو سخت قلق ہوا۔ جے سنگھ و دلیر خاں کی بجائے اس نے جسونت سنگھ اور شہزادہ معظم کو مقرر کیا۔ جسونت وہ ممتاز راجپوت راجہ تھا جس سے سیواجی بہت جھک کر دہلی میں ملا اور یہ بھی دریافت کر چکا تھا کہ یہ راجہ ایک تو رشوت قبول کر لیتا ہے دوسرے سیواجی کی جانب دوستانہ میلان رکھتا ہے۔ شہزادہ معظم زیادہ تر اسی راجپوت کی رائے پر چلتا تھا۔ بہر حال، یہ تو صاف طور پر معلوم نہیں کہ کس حد تک ان کے دوستانہ میلان سے، جسے رشوت نے تقویت پہنچائی اور کس حد تک اورنگ زیب کی اس نیت کی وجہ سے کہ حریف کو غفلت میں رکھے اور آئندہ اچانک پھانس لے، ایسا ہوا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگلے ہی سال اچھے تعلقات قائم ہو گئے (۱۶۶۷ء) شہنشاہ نے اس کی راجائی کا اعتراف کیا۔

---

[۱] گرانٹ ڈف۔

برار میں ایک جاگیر عطا کی اور سنبھاجی کو موعودہ منصب دے دیا۔ پونا، چاکنا اور سوپا واپس ملے مگر ایسے نامعتبر باج گزار کی متلون مزاجی کی روک تھام رکھنے کی غرض سے سنگڈھ اور پورندھر میں بادشاہی فوج متعین رہی۔ دو سال تک یہی کیفیت رہی مگر اس کے بعد دہلی سے بادشاہی فرمان آیا کہ سیواجی اور اس کے بڑے بڑے سرداروں کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر یہ اورنگ زیب کی دوسری غلط اندازی تھی۔ سیواجی کو خبر ہوگئی۔ اس کے سپاہی بہادری سے رات کو کمند ڈال کے سنگڈھ پر چڑھ گئے۔ اس کے خطرناک غاروں کے اوپر رسی کے زینے بنا لئے گئے۔ قلعے کے راجپوت سپاہیوں اور ماولی حملہ آوروں میں خوف انگیز مقابلہ ہوا۔ جس کا نتیجہ دیر تک مشتبہ تھا۔ سیواجی کا سب سے پرانا اور بکار رفیق مالوسرے حملہ آوروں کا سرخیل تھا وہ مارا گیا تو اس کے سپاہی خوفزدہ ہوکر غار کے کنارے تک پسپا ہو گئے لیکن مقتول کے بھائی نے انھیں پھر مرتب کیا اور لڑایا آخر اپنی ایک تہائی جمعیت کے کام آجانے اور دشمن کے دس گنے آدمی مارنے یا غار میں دھکیل دینے کے بعد، مرہٹے گڈھ پر قابض ہو گئے۔ ایک مہینے کے بعد پورندھر دوبارہ ہاتھ آگیا (۱۶۷۰ء) اس طرح سیواجی کے گھاٹ کے اوپر کے شمالی اور جنوبی علاقے میں آمد و رفت کا راستہ پھر کھل گیا اور ہر طرف تازہ کامیابیاں نصیب ہوئیں اگرچہ جنجیرے کو لینے میں وہ ناکام رہا اور یہ مقام مغلوں کے حوالے کر دیا گیا۔

سورت پر پندرہ ہزار سپاہی سے دوبارہ تاخت کی اور چلتے وقت باضابطہ پیام دے آیا کہ اگر اس حملے سے بچنا چاہتے ہو تو سالانہ بارہ لاکھ ادا کرتے رہو۔ واپسی پر دو مغل فوجوں نے ناسک کے درے کے قریب اُسے آلیا۔ اس نے اپنا لشکر دو حصوں میں تقسیم کیا اور غنیم کی بڑی جمعیت پر حملہ کر کے اسے اپنی طرف لگائے رکھا اور ایک چیدہ جماعت لوٹ کا مال لیکر نکل گئی۔ پھر عقب سے حملہ کرکے غنیم کو بھگا دیا اور پلٹ کر پوری فوج کو شکست دی۔ اسی میں ایک معزز مرہٹہ عورت بھی گرفتار ہوئی جو اپنا فوجی دستہ لیکر بادشاہ کی طرف سے لڑنے آئی تھی۔ سیواجی نے اس بہادر عورت کو رہائی دی اور اس کے گھر بھیج دیا۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد بادشاہی صوبہ خاندیس میں پہلی مرتبہ چوتھ

وصول کی گئی (دسمبر ۱۶۷۰ء) اور مغلوں کو سیواجی کی زندگی میں سب سے سخت شکست نصیب ہوئی۔ ان کی یہ کوشش کہ دروں کی ناکہ بندی کر کے مرہٹوں کو پہاڑوں سے باہر نہ نکلنے دیں، کامیاب نہ ہوئی بلکہ پہلے سے زیادہ دلیری اور باقاعدگی کے ساتھ چھاپے مارے جانے لگے۔

اسی زمانے میں شاہ بیجاپور کا انتقال ہوا اور سیواجی نے اس کے جانشین کے مقابلے میں فوراً ہتھیار سنبھالے۔ ہمیشہ سے زیادہ لوٹ کا مال حاصل کیا۔ بادشاہی سرداروں کو بظاہر رشوت دے کر خاموش کر لیا گیا۔ ستارا اور کئی بڑی بستیاں اس کے قبضے میں آگئیں۔ اب اس نے باضابطہ تخت پر جلوس کیا اور وہ شاہی شان بنائی جس کی اہلیت کا مدت سے اس کے کارنامے اور واقعی اقتدار نیز اہل ملک کی تحسین، اُسے مستحق بنا رہی تھی۔ بایں ہمہ ذاتی طرز عمل میں اس نے اپنے ابتدائی ایام کی مستعدی اور سادگی سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

آخر میں سلطنت مغلیہ اور بیجاپور دونوں سے کیونکر صلح ہوئی، سرحد پر مسلسل قلعے تعمیر ہوئے اور اپنے علاقے سے مطمئن اور دوسری طرف سے فرصت پا کر وہ کس طرح ستر ہزار سپاہ کے ساتھ مشرق کی جانب روانہ ہوا (۱۶۷۷ء) اور شاہ گولکنڈہ کو بیوقوف بنا کر اس کے علاقے فتح کئے۔ سوتیلے بھائی ونکاجی کو مجبور کیا کہ کرناٹک کی جاگیر میں سے اس کا واجبی حصہ حوالے کرے۔ واپسی میں مزید فتوحات حاصل کیں۔ مغل محاصرین کے لشکر سے اپنے پرانے اور اب دم توڑتے دشمن بیجاپور کو بیچ میں پڑ کر بچایا۔ کس طرح ان کے عقب پر حملہ کرنے، سامان رسد لوٹنے، تعاقب سے بچ نکلنے میں ایک مرتبہ پھر اپنے مخصوص طرز جنگ کا دوبارہ کمال دکھایا اور کس طرح یکا یک بخار سے ترپن سال کی عمر میں وفات پائی (اپریل ۱۶۸۰ء) اور ایک نااہل جانشین کو وارث تخت چھوڑ گیا جو بہت جلد اورنگ زیب کے انتقام کا لقمہ بنا، ان سب واقعات کو پوری تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بہر حال، سیواجی اس قسم کا آدمی تھا۔ ہم اس کا حال صرف اس کے کاموں سے بتا سکتے ہیں جن کو میں نے تا امکان سچائی سے اوپر پیش کر دیا ہے۔

یا اس کے اداروں سے جو اس سے زیادہ توجّہ کے مستحق ہیں جتنی عموماً ان پر کی جاتی ہے۔ گذشتہ اوراق میں میں نے اس کی اچھی اور بُری خصلتوں کو، اس کی کامیابی کے اسباب اور مدارج کو بالاختصار پیش کرنے کی کوشش کی اور ذیل میں ان کو پھر دہرانا جائز ہوگا۔

اس کی ترکتازی افسانہ آمیز نوعیت، اس کی زندگی کے اہم نتائج، اور یہ واقعہ کہ وہ آج تک مہاراشٹر میں سب سے مقبول اور نیم ربانی دیوتا سمجھا جاتا ہے، انگریزوں کو اس کے حالات میں دلچسپی لینے کی کافی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں اب ایسے شخص کا اُٹھنا بالکل محال، قریب قریب ناقابل تصوّر ہے۔ لیکن کیا یہ بات وہم سے خالی نہیں کہ ایک طرف تو بہت کم انگریز ہیں جو اُس کی یا دوسرے مشاہیر کی جنھوں نے تاج برطانیہ کے سب سے بڑے اور نازک مقبوضہ میں اپنے لافانی نشان چھوڑے، سرگذشت سننے پر بھی توجّہ کرتے ہوں۔ اور دوسری طرف سیواجی کی یاد اپنی قوم کے دل و دماغ میں اب تک ممتاز طور پر جاگزیں ہے؛ مرہٹہ نفرت کی دیرپا قوّت کی حال ہی میں، کانپور کے قیامت خیز واقعے سے، تصدیق ہو چکی ہے جب کہ معزول پیشوا کے متبنّیٰ نے، جسے حکومت انگریزی نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، انگریزوں سے خوفناک انتقام لیا۔

ایسے زمانے میں جب کہ روس پنجاب کی سرحد کے قریب ہے۔ امریکہ سے کچھ بہت دوستانہ تعلقات نہیں ہیں ہندوستانی مالئے کی حالت بھی کچھ بہت خوش آیند نہیں اور انگلستان کی فرماں روائی پر اس کے وائسرائے پر یکایک حملہ کر کے ضرب لگائی گئی ہے۔ خدا کرے کہ ایسے وقت میں ہماری کسی سہل انگاری اور اپنے ساتھ کی (ہندوستانی) رعایا کے احساسات سے غفلت، ان کے گہرے تعصبات سے حقارت آمیز بے پروائی اور واجبی مطالبات سے بربنائے تساہل بے توجّہی کا نتیجہ یہ نہ نکلے کہ وہ اس پُرانے افسانے پر پھر اتنا غور کرنے لگیں جو نہ ان کے لئے مفید ہے نہ ہمارے (یعنی انگریزوں کے) لئے کہ کس طرح مرہٹوں نے بیجاپور کا طوق حکومت اتار پھینکا اور طاقتور سلطنت مغلیہ کو برباد کر کے اس کے کھنڈروں پر اپنی حکومت تیار کی۔

سیواجی کی کامیابی کے عام اسباب صحت کے ساتھ بتا دیے گئے لیکن اس کی خاص ذہانت اور اپنے بڑے مقاصد کے مطابق احتیاط سے وسائل

اختیار کرنے کی قابلیت کا بہتر اندازہ اس وقت ہوگا کہ ہم اس کے جنگی نظام کا مختصر احوال بیان کردیں تاریخ میں کسی قوم کی علٰحدہ ہستی اور مستقل خصوصیات، دونوں کبھی غیر معمولی شخص واحد کی ایجاد وتنظیم کا ایسا نتیجہ نہ ہوی تھیں۔ اگر سیواجی یہ دعویٰ کرتا کہ "میں ہی مملکت ہوں" ("Letatc' est moil") تو یہ اسے اپنے معصر لوئی چہاردہم سے زیادہ زیب دیتا۔ مرہٹہ ریاست کا ابتدائی تخیل بعد کی ترمیم اور دیرپا قوت، مساوی طور پر حیرت انگیز ہیں۔ لیکن جملہ انقلابات میں ابتدائی نمونہ محو نہیں ہوا اور چونکہ اس قول میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے، لہذا اور بھی ضروری ہے کہ جمع ضدین کی تصریح کردی جائے۔

بڑے مدبروں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ پرشور زمانے میں وہ بدنظمی کو نظم سے تبدیل کردیتے ہیں۔ سیواجی نے بادی النظر میں اس سے بھی بڑھکر کام کیا کہ پریشان وآتش گیر قوتوں کو مقررہ خدمت انجام دینے پر مجبور کیا۔ وہ پوری شدت سے کام کرتی تھیں مگر بالکل اس کی مرضی کے مطابق اور ٹھیک اس سمت میں جو اس کے منشا کے موافق ہوتی۔ اس نے بدامنی کے طوفان کا بند کھول دیا اور جنگی بدعنوائی اور حرص وآز کا پورا سیلاب اندر آنے دیا لیکن خود وہ اس رو میں کبھی نہ پھنسا نہ غرق ہوا بلکہ اطمینان سے اس خود غرض اور کھاؤ قوت کو ایک نئے سیاسی نظام کی تیاری اور اپنی منظم آزادی کو جبراً منوانے کے کام میں لگا دیا۔ اس نے سپاہی اور سردار سب کے دل میں ناموری کی ہوس مشتعل کی مگر کبھی یہ خطرہ نہ ہوا کہ خود وہ اس آگ کی لپیٹ میں آجائے گا یا اس اقتدار کو کھو بیٹھے گا جسے ایسی کیادی اور حق ناشناسی سے حاصل کیا تھا۔ وہ فریب و دغا کی بدولت سرسبز ہوا مگر کبھی خود اس کے ساتھ دغابازی نہ ہوی۔ قانون شکنی اسے اور اس کی جماعت کو وجود میں لائی تھی بایں ہمہ وہ پکا قانون ساز تھا اور اس کے قوانین کی شاذ ونادر خلاف ورزی ہوئی اور وہ بھی دیدہ دلیری کے ساتھ کبھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ وہ "شاہ بدنظمی" (Lord of misrule) بھی تھا کہ جدھر سے گزرا، ملک کے ملک بدامنی اور ابتری میں مبتلا ہوگئے اور وہ ربّ التنوع بھی جو "بگولے کی سواری لیتی اور طوفان کو جدھر چاہتی، چلاتی ہے۔"

اس قسم کا دورنگا نقش ہے جو سیواجی کا افسانہ سنکر ایک انگریز طالب علم کے

دل پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس کے انتظامات پر نظر ڈالی جائے تو یہ ظاہری تباین دور ہوجاتا ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ کس طرح ایک قزاق سرگروہ نے نہ صرف ایک ایسی چیز کی بنیاد ڈالی جو ایک صدی تک ہندوستان کی سب سے زبردست اور پھیلی ہوی قوت تھی، بلکہ یہ بھی کہ اس زمانے اور تمدن میں اپنی اخلاقی کمزوریوں کے باوجود وہ کیونکر مستحق تھا کہ اس عظیم اور کسی نہ کسی حد تک غیر خود غرضانہ مقصد میں کامیابی پائے۔ چند اصولی خیالات کا یہاں اظہار کردینا بے محل نہ ہو گا۔

(۱) سیواجی اور اس کے ساتھیوں کا قزاقانہ پیشہ اور غدارانہ (بلکہ خونیوں کے) افعال سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اشخاص دوسرے اوصاف سے عاری تھے۔ مکالے نے بحث کی ہے کہ کوئی بداخلاقی جس کو رائے عامہ برا نہ کہے، کم سے کم ایک معمولی آدمی کو خود اپنی نظر میں سبک نہیں کردیتی لہذا وہ فی الواقع اتنا ذلیل و بداخلاق نہیں ہونے پاتا جتنا وہ شخص جس کے جرائم کو اس کی قوم صاف صاف اور زوردار الفاظ میں برا کہتی ہو۔ اور جن لوگوں کو یاد ہے کہ بڑے ڈیوک نے بھی وزیراعظم رہنے کے زمانے میں ڈوئیل لڑنا اپنا فرض سمجھا تھا، حالانکہ وہ اپنے مردانہ فرض کو کامل آزادی سے انجام دینے میں مجسم بے نیازی تھا، تو وہ مکالے کے اس فرق کی صداقت کو تسلیم کرنے پر مائل ہوجائیں گے۔ اب مرہٹہ قوم پر نظر کیجئے تو یہ لوگ کامیاب غارتگری کو ایسا محمود فعل سمجھتے تھے کہ ان کی زبان میں لفظ فتح کے لئے "دشمن کو لوٹنا" بولا جاتا تھا۔

ملکی معاملات میں مکر و فریب کو بھی ہمیشہ اچھا سمجھا تا بلکہ اس کی تعریف ہوتی اگرچہ ذاتی معاملات میں مَیں نے انھیں نمایاں طور پر وفادار و راستباز پایا۔ قتل و خون کی برائی حالات پر منحصر تھی۔ سیواجی کا اپنے ہاتھ سے مسلمان سپہ سالار افضل خاں کو قتل کرنا، بہت پسند کیا گیا۔ ہندو راجہ کا اس کے اشارے سے خون ہوا تو اسے لوگوں نے سخت مذموم ٹھیرایا۔ لیکن اس فرق کا ایک دوسرے خیال سے تعلق ہے:۔

(۲) جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، سیواجی اور اس کی قوم جنگ میں بھی محض قزاق ہرگز نہ تھے۔ لڑائی میں شجاعت، حب وطن اور مذہبی جوش کا عنصر شریک رہتا اور اسی سے وہ شاہ جی کے بیٹے کو خدا کا منظور نظر بلکہ مامور من اللہ ناجی سمجھنے پر آمادہ ہوں۔

نسل و مذہب اور ایک معقول حد تک جغرافی اختلاف نے ان میں اور بیجاپور و گولکنڈہ کے مسلمانوں میں تفریق کر دی تھی۔ ایسے اغیار سے اور ان سے بھی بڑھکر حملہ آور مغلوں اور جابر اورنگ زیب سے ان کی ایک پیچیدہ اور دینی نزاع تھی جس کا سلجھنا ممکن نہ تھا۔ ان کے پہاڑی دیوتا میدانی دیوتاؤں سے جدا تھے۔ ان کی ہر ذات کا آدمی یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کی قدیم فتوحات نے خود اسے محروم و بے نصیب کر دیا اور یہ خیال کچھ غلط نہ تھا۔ اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اب مغلوں کا فوجی اور ملکی نظام برابر بڑھتا چلا آتا تھا اور اس سے ان مرہٹوں کو اور بھی زیادہ تشویش انگیز خطرہ تھا۔ اس قسم کے حالات میں گھرے ہوئے پہاڑی قبیلے اکثر نیچے کے میدانی علاقوں کے خوشحال و عیش دوست باشندوں پر ہاتھ ڈالنا مباح کر لیا کرتے ہیں۔ پس سیواجی اور اس کے ابتدائی رفیق بجا طور پر یہ رائے قائم کر سکتے تھے اور حقیقت میں یہی رائے رکھتے تھے کہ ان کا اپنے خاص طرز میں لڑنا بندگان خدا کی خدمت ہے جس سے ناموری حاصل ہوتی ہے اور نہ صرف تحسین و آفریں بلکہ انتقامی مال وغنائم کا معقول صلہ بھی ہاتھ آجاتا ہے۔

(۳) گبن نے تیمور کے حالات میں اسی قسم کے ظاہری تضاد کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے زیر بحث ہے یہ ایشیا بھر کو پامال و تاراج کرنے والا اپنے تاتاری وطن اور خود اپنے لوگوں میں ایک فائدہ رساں واضع قانون تھا۔ یہی حال سیواجی کا ہے۔ حریف مسلمانوں کے سامنے وہ سخت گیر، زیادہ ستاں، بے رحم اور غدار تھا لیکن خود اپنے ساتھیوں اور مقبوضہ اضلاع یا اپنی قوم والوں سے جہاں تک اس کے شدید فوجی نظام کی وقتی ضروریات اجازت دیتیں، وہ اعتدال، انصاف، صبر و صداقت کا برتاؤ کرتا تھا۔

اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ ارباب حقوق، مذہبی تعصبات، رسمی خیالات اور پرانے رسم و رواج کی وہ عادتاً اور اہتمام کے ساتھ رعایت ملحوظ رکھتا اور اس طرح جہاں اسلامی اقتدار کو اس نے برباد کیا، وہاں ہندو قومیت کی حفاظت کی اور ایک نئے دیسی تمدن کی بنیاد ڈالی جس کو اس کے ساتھی پرانے ہندو تمدن کا احیا سمجھتے تھے اور جو مسلمانوں کی سیاسی سیادت میں کسی طرح قائم نہ رہ سکتا تھا خواہ اسلامی بادشاہ کتنے ہی روادار کیوں نہ ہوں۔ یہی سبب ہے کہ سیواجی کو اپنی پہاڑی بستیوں میں

ہر جگہ دلی اطاعت اور جوش عقیدت کرنے والے مل گئے اور وہ اپنے باموقع، محفوظ مقام سے اطمینان کے ساتھ وسطی میدانوں یا اور آگے بڑھکر دوسرے ساحل تک تاخت تاراج کرسکا۔

(۴) پھر بھی اعتراض ہوگا کہ ایسی بے اصول زندگی سے قانون شکنی کا عام مذاق پیدا ہوتا ہے اور ہر موقع پر مکر و غدر کو جائز کر دینا خود ان افعال کے بانیوں پر الٹ سکتا ہے۔ سیواجی ان خطروں سے بے خبر نہ تھا اور اس کے جانشینوں کی تاریخ سے ان کی معقولیت بھی بہت جلد ثابت ہوگئی، لیکن اپنے زمانے میں اُس نے حکومت کا اصول یہ رکھا کہ ہر چیز سے براہ راست تعلق اور مرکزیت قائم کی جس سے ذاتی حفاظت بھی مقصود تھی۔ چنانچہ بہت سے وزیر، قائم مقام، سردار اور ہر قسم کے عمّال مقرر کئے مگر ان کی یہ حیثیت مستقل یا ذاتی نہ تھی بلکہ خود سیواجی کے تقرر کرنے سے وہ اس مرتبے پر پہنچے اور جب تک ان کی اہلیت اور وفاداری مسلّم رہتی اسی وقت تک عہدے پر رکھے جاتے تھے۔ جاگیر دینے کا طریقہ اسے پسند نہ تھا کہ اس سے جاگیردار کے موروثی حقوق ہوجاتے اور راجہ کے بے روک اختیارات میں کمی آتی تھی۔ دیہات و اضلاع میں جو عمّال موروثی چلے آتے تھے، ان کو اس نے پرانے حقوق سے محروم نہیں کیا لیکن یہاں کا روپیہ بھی اسی کے مقرر کئے ہوئے عامل وصول کرتے تھے اور اس کے علاقے میں دیہات والوں کو بستی کے گرد کوئی دیوار یا گڑھ وغیرہ بنانے کی مطلق اجازت نہ تھی اور صرف وہ قلعے بنے ہوئے تھے جن میں خود اس کے معتمد علیہ اور خاص دستے متعین تھے۔

ابتدا میں تو اپنے سپاہیوں کو منتخب اور معائنہ کرنے میں وہ ایسی احتیاط کرتا جیسی کروم ویل اپنے فولاد رخ سپاہیوں کی بھرتی میں، اور پھر مدت العمر یہ پابندی رکھی کہ جب تک پرانے ملازموں میں سے کوئی شخص نئے آدمی کی وفاداری اور نیک چلنی کی ضمانت نہ دے، اسے بھرتی نہ کیا جائے۔ ہر محکمے کی باگ بھی خود اس کے ہاتھ میں تھی۔ غدر و سازش کے معاملے میں اوّل تو وہ خود اتنا مکّار تھا کہ اہل سازش کی پیش چلنی دشوار تھی، دوسرے جتنا عاقل تھا اسی قدر نگراں اور باخبر بھی رہتا تھا ہر طرف اس کی نظر رہتی تھی۔ مقررہ جاسوسوں کے علاوہ، وہ ایک قوم یا جماعت کو دوسری

جماعت سے اور ایک صیغے کو دوسرے صیغے سے لڑاتا رہتا۔ پاسبانوں پر دوسرے پاسبان مقرر کرتا۔ خفیہ کارندے اور باریک و مخفی جاسوسی کا انتظام کرتا جو لوئی لا اور اس کے جانشینوں کے مشہور اور پیچ در پیچ انتظام سے کچھ کم پیچیدہ اور باریک نہ تھا۔ اور ان وسائل سے ہر کام اپنی نگرانی میں رکھتا تھا۔

اب میں سیواجی کے فوجی نظم کی جو ہر شعبے میں قائم تھا، مختصر کیفیت لکھتا ہوں۔

جنگی تاریخ کے طالب علم کے لئے بہتر ہے کہ وہ مرہٹوں کے طریق جنگ کی مختلف منازل کا، جن سے وہ سیواجی کے عہد سے لارڈ لیک کرنل ویلزلی اور دولت راؤ سندھیا کے زمانے تک گزرا، بغور مطالعہ کرے اور دیکھے کہ کس طرح یہ فوج جس میں اول اول نیم برہنہ، غیر منضبط اونیٰ ہتھیار والے پہاڑی آوارہ گرد جمع تھے جن کی تصنع سے خالی بہادری پہاڑوں پر چڑھ جانے کی تیز پائی اور اپنے جفاکش اور سلیقہ مند تنکار کے ساتھی سے عقیدت مندی، گھاٹوں کے کناروں پر قلعہ پر قلعہ فتح کرنے میں اور دکن پر اچانک چھاپے مارنے اور لوٹ کا مال چھپا دینے میں کام آئی۔ پھر رفتہ رفتہ دولت راؤ کی اُن اسّی پلٹنوں کی صورت میں تبدیل ہوئی جن کو نہایت نفاست کے ساتھ قواعد جنگ کی مشق اور بہت خوبی سے مرتب کیا گیا تھا فرانسیسی جنگ آزما ان کے سردار تھے۔ ایک پر شکوہ توپ خانہ ساتھ کام کرتا تھا اور خوفناک، من چلے، بانکے سواروں کا جم غفیر ساتھ چلتا تھا جن کی "وحشیانہ مرہٹہ طرز جنگ" سے اسی کے سورما کے کھیت رہنے اور دنیا کی تاریخ ہی کے بدل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ غرض یہ انتہائی سرے تھے جن کے پورے دور کو مرہٹوں کی جنگی تدابیر نے رفتہ رفتہ طے کیا تھا۔ مگر سر دست میں صرف سیواجی کے آخری انتظامات کو بیان کرنے پر قناعت کروں گا۔ اس نے قدرتی طور پر پیادوں سے ابتدا کی اور ان میں بھی صرف ہندو یا پہاڑوں کی قدیم جنگلی قوموں کے افراد تھے کچھ عرصے اور بہت کچھ تامل کے بعد اس نے مسلمانوں کو خصوصاً افغانوں کو بھرتی کیا۔ سوار فوج اس وقت مرتب کی جب دکن کے حملوں میں اس کی ضرورت پیش آئی۔ توپ خانہ سیواجی نے کبھی استعمال نہیں کیا بجز کرناٹک کی (اپنی آخری) بڑی مہم کے، جس میں وہ کہہ سن کے شاہ گولکنڈہ سے

قلعہ شکن توپیں مستعار لے گیا تھا۔

سوار و پیادہ دونوں ہلکے اسلحہ سے مسلح ہوتے تھے۔ دونوں ڈھال سے کام لیتے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی دفاعی شے، یعنی زرہ وغیرہ اُن دونوں نہیں پہنتے تھے۔ پیادہ فوج کی دو قسمیں تھیں ماولی اور ہٹ کری اور علیٰ ہذا رسالہ بھی بارگیر اور سلح دار پر مشتمل تھا۔ پہلی تقسیم محض جغرافی تھی جس سے گھاٹ اور کوکن سے بھرتی کئے ہوئے سپاہی مراد تھے۔ اور بارگیر وہ سوار تھے جن کا خرچ خود سیواجی کے ذمے تھا۔ یہ حقیقت میں اس کی ذات کے سوار او مجموعی طور پر "پاگاہ" والے کہلاتے تھے۔ سلح دار مغل احدیوں کی طرح عزت دار لوگ تھے جو اپنے خرچ سے گھوڑا رکھتے اور زمانہ حال میں ہمارے بے قاعدہ دیسی رسالے سے زیادہ مشابہ تھے۔

پیادوں کے پاس تلوار اور پرانی وضع کی یا بعض صورتوں میں نئی آئی ہوئی توڑے دار بندوقیں ہوتی تھیں۔ لیکن چوری کے کام، جیسے شبخون یا قلعے پر چڑھ جانے کی غرض سے ہر سوال آدمی تیر کمان سے مسلح ہوتا تھا ہٹ کری اچھے قادر انداز اور ماولی دست بدست مقابلے یا تلوار سے لڑنے میں زیادہ مضبوط تھے۔ سواروں کے پاس تلواریں اور بعض کے قبضے میں پرانی قسم کی بندوقیں تھیں مگر کاسکوں کی طرح ان کا خاص اور سب سے کارگر ہتھیار لمبا برچھا ہوتا تھا۔ یوں بھی یہ لوگ کاسکوں سے ملتے جلتے تھے اور مغلوں کی وساطت سے وہی نام بھی اختیار کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے ارک مین جیپٹ ریاں کے افسانے پڑھے ہیں وہ ان سواروں کی سرعت سیر، سبک دستی اور اس دہشت کا جوان کے یک بہ یک نمودار ہونے سے پھیل جاتی تھی، بخوبی تصور کر سکتے ہیں۔

پیادہ فوج کی وفاداری پر سیواجی کامل بھروسہ کر سکتا تھا۔ اور اسی طرح بارگیر سلح داروں سے زیادہ لائق اعتماد تھے۔ ان سلح داروں میں کوئی نظم نہ تھا اور ان کی آزادی بھی انھیں کج روی پر مائل کر سکتی تھی، لہٰذا ان کی روک تھام کی غرض سے وہ اکثر ان میں پاگاہ کے سواروں کی جمعیتیں شامل کر دیا کرتا تھا۔

پیادوں میں، دس، پچاس، سو، ہزار اور پانچ ہزار آدمی پر ایک ایک سردار ہوتا۔

آخر الذکر سرنوبت (یا سپہ سالار) کہلاتا تھا۔ رسالے کی ترتیب و نگرانی زیادہ پیچیدہ تھی۔
اس میں سب سے چھوٹا جوق پچیس سواروں کا ہوتا اور اس کے سردار کو (حوالہ دار) حولدار کہتے تھے۔ ایسے پانچ جوق مل کر "جوما" (یعنی جماعت بنتی اور اس کا افسر (جماعہ دار) جمادار کہلاتا۔ پھر ایسی پانچ جماعتوں کے سردار کو صوبہ دار اور آخر میں، دس صوبے ملکر اصولاً چھ ہزار دو سو پچیس کی لیکن اسماً پانچ ہزار سواروں کا لشکر ایک سردار کے تحت میں ہوتا جس کا ثقیل نام میں بیان کرتے ڈرتا ہوں یہ سرنوبت یا سپہ سالار سے نیچے ہوتا اور سرنوبت پیادہ سپاہ کے سرگروہ سے بھی علیحدہ سب سے بڑا فوجی عہدہ دار ہوتا تھا۔
صوبے کے حسابات کے لئے علیحدہ دیوانی عامل مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ برہمن یا پوڑ ودے ہوتے۔ انھیں خود سیواجی مقرر کرتا اور وہ براہ راست اسی کے ماتحت ہوتے جس کا منشا یقیناً یہ تھا کہ فوجی سالار پر وہ نگرانی رکھیں۔ پانچ ہزار کے سردار کے ساتھ بھی اسی قسم کا انتظام تھا اور سوار سب سے چھوٹی جمعیت کے، ہکرٹی کے ساتھ خبرنویس اور باضابطہ جاسوسوں کی جماعت مقرر ہوتی تھی۔ اور خفیہ ہرکارے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا، فوج کے ہر حصے میں پھیلے رہتے تھے۔
پیادہ سپاہی کی تنخواہ ماہانہ (؟) ہمارے سکے میں سات آٹھ شلنگ سے لیکر اس کی سہ گنی تک ہوتی۔ بارگیر کی اس سے تقریباً دگنی، بحالیکہ سلح دار دو سے چار گنی (۱ اشرفی) تک مشاہرہ پاتا تھا۔ جب سپاہ میدان کی طرف چلتی تو ہر سپاہی کی سختی سے تلاشی لی جاتی جس کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ اسے جو کچھ نقصان پہنچے، وہ اگر سرکاری فرض کی انجام دہی کے دوران میں پہنچنا ثابت ہو جائے تو سرکار اس کی تلافی کر دے۔ دوسرے اصلی سامان کے علاوہ جو کچھ وہ ساتھ لیکر آئے۔ اسے لازم تھا کہ حکام کے سامنے پیش کر دے۔ ورنہ جائز تھا کہ سرکار اسے ضبط کرلے کیونکہ سارا مال غنیمت سب سے اوّل سیواجی کی ملکیت ہوتا۔ لانے والے کو کچھ انعام تو اسی وقت دے دیا جاتا اور آیندہ سلوک یا ترقی کے لئے اس کا نام بھی لکھ لیا جاتا تھا۔ پھر اگر وہ اس کا معاوضہ طلب کرتا تو عموماً ادا کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سال کے سال سرکار سپاہیوں کے ایسے مطالبات کو نقد یا راجہ کے مالگزاری وصول کرنے والوں کے نام ہنڈیوں کے

ذریعے پورا کرتی رہتی تھی۔ مگر اس قسم کی رقوم کسی کو دیہات سے وصول کرنے کی سیواجی اجازت نہ دیتا تھا کہ کہیں یہ لوگ دیہاتیوں پر زیادتی کریں اور یا ایسا اقتدار حاصل کرلیں جو پوری طرح اس کے قابو میں نہ ہو۔ گائے، عورت اور کسان کو بھگا لے جانے یا ان پر سختی کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ البتہ دولت مند مسلمانوں کو یا ان کے نوکر ہندوؤں کو گرفتار کر لانا جائز تھا جو اپنی مخلصی کے لئے معقول فدیہ ادا کر سکتے ہوں۔ لیکن ممتاز قیدیوں کو ظاہرداری سے رہا کرنے کا بھی اسے شوق تھا اور بے شبہ اس سے وہ درپردہ رسل ورسائل میں مدد لینے اور نیز فیاضی کی شہرت حاصل کرنے کا کام لینا چاہتا تھا۔ ضوابط کی سخت پابندی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا اپنی محبوبہ شخص کو جنگ میں ساتھ لے جانا، سزائے موت کا مستوجب ہوتا تھا۔ اور سزا یا انعام دینے میں وہ کبھی تاخیر وکوتاہی نہ کرتا تھا۔

مستحق سپاہیوں، مندروں اور قلعے کے پاسبانوں کو دوامی معافیاں دی جاتی تھیں اوقاف کو خواہ وہ اسلامی مذہب یا پیروں کے عرس وغیرہ سے متعلق ہوں، اس نے کبھی ضبط نہیں کیا۔

سیواجی کی قوت کا اصلی ذریعہ اور سب سے خاص جنگی شعبہ اس کے قلعوں کا نظام تھا۔ ہر گڑھی میں ہنگامی فوج کے علاوہ جو کبھی کبھی اندر متعین رہتی، باشندوں اور مدافعین کا مستقل عملہ مقرر کیا جاتا۔ ان کی تفصیل سے تنظیم، احتیاط سے تربیت کی جاتی اور گڑھی کی حفاظت مین ہر طرح ان کو سرگرم و مستعد بنا دیا جاتا۔ ان میں اصلی مرہٹوں کے سپرد لڑنے کا کام ہوتا برہمن رسد رسانی اور دوسرے انتظامات کے ذمہ دار ہوتے۔ راموسی وغیرہ قدیم جنگلی قوموں کے اشخاص کا کام یہ تھا کہ دشمن کے اُدھر بڑھنے کی خبر رکھیں اور اسے پریشان کریں اور حملے سے باز نہ رکھ سکیں تو چوری سے اس کی جنگی تدابیر میں رکاوٹیں ڈالتے رہیں۔ ان سب قوموں کو معافی کی زمینیں دی جاتیں اور وہ موروثی ہوتی تھیں۔ خود سیواجی لڑائی کو جاتا تو ظاہر ہے کہ جنگ کا خرچ اور رسد بلکہ کچھ اور بھی، جنگ ہی سے وصول کرتا تھا۔ اس کے سوار دشمن کے علاقے میں گھوڑے چراتے تو برہمن عمال بڑے اہتمام سے ہر قلعے کی نواح میں دانہ گھاس کے ذخیرے بھرتے کہ برسات آنے سے پہلے رسد مہیا ہو جائے

اور سوار اپنے پہاڑی مسکنوں کو واپس آئیں تو انھیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ ہر قلعے میں اس کا حاکم یا حولدار متعین ہوتا اور قلعے کی وسعت اور اہمیت کی مناسبت سے اس کے ماتحتوں کی تعداد بڑھادی جاتی تھی۔ گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ "آمد و رفت گشت، پہرہ، چوکیداری، پانی غلہ گولہ بارود وغیرہ کی نگرانی کے احکام بہت مفصل تھے۔ ہر سر رشتے کے حاکم کو نہایت واضح ہدایات دی جاتی تھیں جن سے تجاوز کی مطلق اجازت نہ تھی۔ جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے سیواجی کے تمام کارخانوں میں حددرجہ کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تھا۔"

اس کے فوجی انتظامات کی نسبت آخر میں یہ رائے دی جاسکتی ہے کہ اس وحشی آدمی کی نظم و ترتیب میں کوئی وحشت و بدویت نہیں پائی جاتی۔

باب ششم

مرہٹوں کی جنگ آزادی

مرہٹہ قوم میں سیواجی کا وجود ان کے باہمی اتحاد اور جوش، دونوں کا موجب تھا اور اس کی ناگہانی وفات ان کے حق میں نہایت نازک واقعہ ہو گئی۔ اس نے اپنی قوم کے قلبی جذبات کو ابھارا اور ان کے سب سے گہرے اور محکم احساسات کو برانگیختہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسے دستور و ضوابط کی بنیاد رکھی جو بعض اعتبار سے زمانے کے مرور اور شہنشاہی عداوت دونوں کا صدمہ جھیل سکتے تھے، لیکن دہقانی قسم کے لوگوں میں، خواہ وہ یورپ ہی کے ہوں، جدید انتظامات کا کیا حشر ہو گا اگر ان کے بانی ہی کی روح مفقود ہو جائے؟ اس کا علاقہ بھی وسعت میں کم نہ تھا۔ اس میں سب سے پہلا ضلع جو اس کا جنگی مستقر رہا، قدرتی طور پر نہایت مستحکم تھا اور اسے قلعوں کے پیچ در پیچ نظام سے احتیاط کے ساتھ اور بھی مضبوط کر لیا گیا تھا فوج کی تعداد کثیر اور حالت بھی بہت اچھی تھی۔ آمدنی معین نہ تھی مگر سیواجی نے

باب ششم

کثیر اندوختہ چھوڑا تھا۔ اس کے نام کی دُور دُور تک دہشت پھیلی ہوئی تھی اور اس نے سرداروں کا ایک گروہ بھی تیار کر دیا تھا جن کے فطری اوصاف کی خود سیواجی کی مثال دیکھکر اور بات بات پر تنقید اور سخت پابندی کی تکلیفیں اٹھاکر، تربیت ہوئی تھی، لیکن جنگ کی اتنی زبردست کل تیار تو کر لی اور وہ بہت کامیابی سے چلتی بھی رہی۔ مگر اسے قابو میں رکھنا اُس کے غیر معمولی استعداد کے دماغ کے لئے بھی سہل نہ تھا۔ گھریا امن و انتظام کے ساتھ باقاعدہ سلطنت قائم رکھنا اور اس سلطنت ہی سے فی الواقع قزاقوں کی ایک وسیع لشکر گاہ کا کام لینا اور اس کے وجود کا انحصار ہی قتل و غارت گری پر رکھنا، کسی شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ سیواجی بھی محض اس لئے کامیاب ہوا کہ بے نظیر ذہانت کے ساتھ مختلف اتفاقی اسباب اس کے مساعد ہو گئے اور یہ کوشش جو اصولاً عارضی تھی چل گئی۔

ممالک شرق میں سرلشکر کی موت بارہا لشکر کے فوری انتشار کا باعث ہوئی ہے۔ سوال یہ تھا کہ سیواجی کے بعد اس کی مرہٹہ سپاہ کا کیا حشر ہوگا؟ آیا اندرونی نفاق، سرداروں کی ہوس، سپاہیوں کی طمع زر سیواجی کے عمدہ انتظامات کو ایسا درہم برہم نہ کر دے گی کہ وہ اُس طاقتور شہنشاہ کے کینۂ دیرینہ کا شکار ہو جائیں جس کی حکومت سے اتنے روز تک تمرّد و تنازع کرتے رہے تھے؛ اس قسم کے شبہات ہر محبِّ وطن مرہٹے کے دل میں ناشی ہوتے تھے اور سیواجی کے گھرانے کی حالت نے انھیں اور تقویت پہنچادی۔ اس کا بیٹا سنبھاجی تھا جس کی ماں مرچکی تھی اور سرکشی اور اوباشی کی پاداش میں اُسے سخت گیر باپ نے پنالا (= پنالہ) کے قلعے میں آرام سے مقید کر دیا تھا۔ سیواجی کا ایک اور بیٹا راجہ رام دس برس کا تھا اور اس کی حریص ماں نے کوشش کی تھی کہ یکایک جھپٹا مار کر اسی لڑکے کو سیواجی کا جانشیں بنادے اور بعض مرہٹہ سرداروں کے خفیہ ایما سے وہ گدّی پر بٹھا بھی دیا گیا۔ لیکن سنبھاجی پنالا سے نکل بھاگا اور بڑی مستعدی سے ہاری بازی جیت لی۔ اہل سازش میں سے بعض مل گئے اور بعض گرفتار کر لئے گئے۔ سنبھاجی بلاخر خستہ وارث حکومت ہو گیا (جون ۱۶۸۰ء)۔ اس موقع پر اس نے بڑی ہمت دکھائی جو اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور یوں بھی وہ جوہرِ قابلیت سے عاری نہ تھا۔ گذشتہ سازش کے باوجود بہت سے

مرہٹہ رئیس اسے دلی امداد دینے پر آمادہ تھے اور اگر وہ انھیں اپنے باپ کے بڑے مقصد میں کام کرنے پر اُبھارتا تو انکار نہ کر سکتے تھے۔ فی الواقع بعض کامیابیاں حاصل بھی ہوئیں اور مغلوں کے حملے ایک سے زیادہ بار پسپا کئے گئے جن میں حملہ آوروں کو نقصان اور ذلت اٹھانی پڑی۔

بایں ہمہ یہ شروع سے ظاہر تھا کہ سنبھاجی اپنے سورما باپ کا قرار واقعی جانشین نہیں ہو سکتا اور اس کی بد انتظامی اور بدعنوانیوں سے نئی قومی حکومت کو بہت کچھ خطرات پیش آئیں گے۔ وہ سست، عیاش، مُسرف، کینہ پرور اور اپنی رعایا کی سود بہبود اور نیز محسوسات سے بالکل بے پروا تھا۔ جن سازشیوں کی اس کے آگے پیش نہ جاتی تھی، انھیں اس نے ایسی وحشیانہ بے رحمی سے سزائیں دیں کہ عوام کو بہت شاق گزرا۔ مسند نشینی ہی کے وقت بُری بُری فالیں نکالی جانے لگیں۔ آیندہ فتنہ و مخالفت کا بیج پڑ گیا۔ بعض رئیسوں نے اس کی نوکری چھوڑ کر حریفوں کی ملازمت اختیار کر لی اور اس طرح سنبھاجی کے اقتدار و مداخل دونوں میں خلل پڑ گیا۔ اس کے ایک شکار کو کسی نے بچانا چاہا تھا اس پر سنبھاجی نے محض بدگمان ہو کر سیواجی کے ایک سب سے قدیم اور نہایت ممتاز رفیق کو، جو برہمن بھی تھا، قتل کرا دیا۔ ایسے شخص سے آیندہ کیا توقع ہو سکتی تھی جس نے مہاراشٹر کے جنگی نام آوروں سے قطع تعلق کرنے میں پاک نہ کیا اور نہ ان مذہبی شعائر کی پابندی کی جن کو سیواجی نے ایسے اہتمام سے قائم کیا اور جن سے فائدہ اٹھایا تھا؟ انتظام ریاست کی باگ بھی ڈھیلی ہو گئی۔ سیواجی اپنے عجیب کارخانون کی جیسی تفصیل و توجہ سے نگرانی کرتا تھا، وہ سب موقوف ہو گئی۔ بہترین اور سب سے آزمودہ سرداروں کو معزول نہیں تو حقیر ضرور کیا جانے لگا اور شمالی ہندوستان کے ایک پردیسی مُنہ چڑھے کلوشا نامی کو عیاش و بےخبر راجہ کے محل میں وہی اختیارات حاصل ہو گئے جیسے رومہ میں سجانوس کو مل گئے تھے۔ یہ کلوشا ذی علم تو تھا لیکن دیوانی یا فوجی انتظامات کی کوئی عملی قابلیت اس میں نہ تھی۔ سیواجی کے گرو نے اپنے بستر مرگ پر سنبھاجی کو بہت کچھ نصیحت وصیت کی اور سیواجی کے اوصاف و خیالات اور کارنامے سنائے کہ وہ کسی طرح تو جوش میں آئے لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ مشرقی ساحل سے ایک با اقتدار و دیرینہ سال مرہٹہ سیاست دال

خاص اسی غرض سے طویل سفر طے کر کے آیا کہ اس بداخلاق فرماں روا کو اس کے منصب کے فرائض یاد دلائے لیکن اس کی صاف گوئی اور اعتراض کا اصلاحی اثر بھی صرف چند روزہ رہا کلوشا کے رسوخ میں کوئی شے عارض نہ ہو سکی۔ اور اس کا یہ اثر جادو سے منسوب کیا جانے لگا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ رعایا کی سود بہبود پر کیا توجہ ہوئی ہوگی مرہٹہ ریاست میں زوال کے آثار نظر آنے لگے جس کو گرینڈ ڈوف نے اس طرح بیان کیا ہے :۔

"سیواجی کے جاری کردہ نظام میں، جہاں کہیں انتظامی حکام کی نگرانی اور احتیاط کی ضرورت تھی، بہت جلد خرابی پیدا ہو گئی۔ اس کا ظہور سب سے اوّل فوج میں ہوا جہاں سیواجی کے سخت ضوابط اور احکام سے غفلت برتی جانے لگی۔ رسالہ میدان میں نکلتا تو آوارہ گردوں کو بھی ساتھ لے لیا جاتا۔ لوٹ کا مال سپاہی چھپا لیتے۔ عورتیں ساتھ لے جانے کی سخت ممانعت تھی، اور اس کی سزا موت ہوا کرتی تھی مگر اب نہ صرف اس کی اجازت ہو گئی بلکہ حریف کے علاقے سے وہ بھی لوٹ کے مال کی طرح لائی جانے لگیں۔ انھیں داشتہ بنا لیا جاتا یا جاریہ بنا کے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ اب لوٹ کی مقدار کم ہو گئی تھی لہٰذا اسواروں کو پوری تنخواہ ادا نہ ہوتی تھی اور اس حالت میں جائز کر دیا گیا تھا کہ باقاعدہ تنخواہ کے عوض میں، جو سیواجی کے زمانے میں مقرر تھی، وہ لوٹ سے دل کھول کر اس کی تلافی کر لیا کریں۔ سنبھاجی بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا اور چونکہ وہ سمجھتا تھا کہ باپ نے بے حساب دولت چھوڑی ہے، لہٰذا منہ چڑھے وزیر کو بھی اس بارے میں کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ راگھوناتھ پنت کی وفات کے بعد سے کرناٹک سے کوئی مالگزاری وصول نہ ہوئی تھی۔ وہاں کے پرگنے اپنا خرچ خود نکال لیتے تھے لیکن چونکہ فوجی تاختیں جو سیواجی کے زمانے میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں ان سے اب فائدے کی بجائے خسارہ رہنے لگا تھا لہٰذا کلوشا نے مختلف جمع بندیاں کر کے مالگزاری بڑھا دی کہ یہ کمی پوری ہو جائے مگر جب وصولی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ مالگزاری جس قدر زیادہ تشخیص کی گئی تھی اسی قدر کم روپیہ تحصیل ہو سکا ہے۔ اس کی پاداش میں پرگنہ داروں کو رشوت کے الزام پر علیحدہ کر دیا گیا اور مالگزار کا ٹھیکہ دیا جانے لگا۔ بہت سے کسان گاؤں چھوڑ چھوڑ کر

بھاگ گئے اور سنبھاجی کی ریاست میں زوال کے آثار نظر آنے لگے۔"

لیکن قزاقی کی یہ مملکت جسے بانی کی کمال ذہانت نے مرتب اور اس کے جانشین نے اس بری طرح ابتر کیا، محض اندرونی خرابی سے تباہ نہ ہونے پائی۔ اس کے کئی بیرونی دشمن تھے جن میں سب سے بڑھکر تو عیار و طاقتور اورنگ زیب تاک میں لگا ہوا تھا اور پورے دکن کی تسخیر دنا مین کی بڑے پیمانے پر تیاریاں کر رہا تھا۔ اس بار بھی سنبھاجی کی روش حیرت انگیز، بلکہ تقریباً ناقابل یقین تھی۔ ہوس جاہ اور جنگ جوئی کا جذبہ رکھنے کے باوجود، اس کی سرشت شدروں کی سی تھی۔ اور ہمسائے میں اپنے پرتگیز اور جنجیرہ کے سدی حریفوں سے جد وجہد کرنے میں اسے بڑی اضلاع میں شہنشاہ سے زور آزمائی کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا حالانکہ اس کا عہدہ اور قوم کے گذشتہ کارنامے اسی کے متقاضی تھے۔ اس نے اپنے باپ کی عاقلانہ روش کی پیروی بھی نہ کی کہ مشترکہ دشمن کے مقابلے میں بیجاپور و گولکنڈہ ہی سے اتحاد کر لیتا۔ ان جنگجو راجپوتوں سے اشتراک عمل کا تو اسے خیال تک نہ آیا جن کی مذہبی اور سیاسی تائید اس کے ساتھ ہوتی اور جن کے رئیسوں نے اس کے باپ کی حمایت کی اور اس وقت علانیہ شہنشاہ کے خلاف بغاوت کر رہے تھے اور شہزادہ اکبر کو بھی ورغلا کر باغی بنا چکے تھے۔ اورنگ زیب کی چالاکی نے شہزادے کی ساری تدبیریں غارت کر دیں لیکن وہ خود بھاگ کر اب سنبھاجی کے پاس چلا آیا تھا اور اگر سنبھاجی میں اپنے باپ کی کچھ بھی سیاسی ذہانت ہوتی تو وہ اس موقع سے بہت اچھا کام لے سکتا تھا اور اپنے ساتھ باغی راجپوتوں اور دوسرے مقامات کی ناراض (بادشاہی) رعایا کو ملا کر ایک سہ گانہ جتھا بنا سکتا تھا جس کا سرغنہ شہزادۂ اکبر ہو جاتا۔

القصہ، اورنگ زیب کے دکن میں آنے اور طول طویل لڑائیوں میں آخر عمر تک لڑنے سے قبل ہی مرہٹوں کا مستقبل بہت تاریک ہو گیا تھا اور سنبھاجی کے متعلق علانیہ پیشین گوئیاں کی جانے لگی تھیں کہ اس کا حشر بہت برا ہونے والا ہے۔

شہنشاہ نے خود دکن آنے سے قبل اپنے دو بیٹوں کو الگ الگ معقول لشکر دے کر روانہ کیا کہ کوکن اور شمالی گھاٹ کے گرد کے اضلاع فتح کر کے مرہٹوں کو چاروں طرف سے گھیر لیں (۱۶۸۳ء) لیکن اس منصوبے کی مشکلات بہت جلد

نمایاں ہوگئیں۔ سلہیر کا مضبوط قلعہ غداری سے شہزادۂ اعظم کے حوالے کر دیا گیا لیکن اس کی کامیابی یہیں تک رہ گئی اور اس نے تھوڑے ہی دن بعد اُکتا کر سپہ سالاری چھوڑ دی اور دوسری طرف دوسرے لشکروں کو رام سیج کے فتح کرنے میں مسلسل کوشش کے باوجود ناکامی ہوئی۔ انھی میں ایک سردار مشہور نواب نظام الملک کے والد شہاب الدین خاں تھے جو آگے چل کر غازی الدین خاں کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اس عرصے میں سلطان معظم کوکن کے اندر داخل ہوگیا مگر یہاں مرہٹوں نے اپنے خاص طریقے کے موافق اسے ہر طرف سے تنگ کرنا شروع کیا۔ سنبھاجی نے احکام جاری کئے کہ راستے روک لئے جائیں۔ رسد نہ پہنچنے دی جائے۔ اچانک چھاپے مار کر ستایا جائے اور مویشی چرانے والوں اور بھولے بھٹکے سپاہیوں کو مار ڈالا جائے" اس نے انھیں بہت پریشان کیا اور سمندر کے راستے سامان رسد بھیجنے کی ایک کوشش کی گئی تو انتھک غنیم نے ان کی کشتیاں پکڑ لیں کیونکہ اب، رفتہ رفتہ وہ اس مذہبی وہم سے بھی آزاد ہو گئے تھے جو سمندر میں جانے کے متعلق ہندوؤں کو مانع تھا۔ آخر غازی الدین خاں نے خود سنبھاجی کو شکست دی اور شہزادے کو اس خطرناک مقام سے نکال لائے تاہم کوکن کے لشکر کی مصیبتیں ختم نہ ہوئیں بلکہ بالاگھاٹ کے بعض مقامات فتح کرنے کے بعد اسے قحط، وبا اور باخبر دشمن کے فن فریب نے اس قدر نقصان پہنچایا کہ وہ احمد نگر واپس ہوا تو بہت ہی خستہ و شکستہ ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مرہٹوں نے یا تو محض مدافعت پر اکتفا نہ کی اور یا صحیح طور پر یہ اندازہ کر لیا کہ انکا بہترین دفاع یہی ہے کہ جارحانہ کارروائی کی جائے۔ وہ اپنے ملک سے آگے بڑھ بڑھ کر دور شمال میں چھاپے مارنے لگے اور برہان پور (جہاں سے شہنشاہ اسی زمانے میں گیا تھا) اور بھڑوچ کو ل بھر کے لوٹا جو ہندوستان خاص کی سرحد پر تھے اور وہیں کے سارے دیہات کو آگ لگا دی۔ شہنشاہی سپہ سالار تعاقب میں دوڑتا پھرا مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ ان کی گریز پائی اس کی کوشش کا مضحکہ کرتی رہی۔ اور وہ ان کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔

لیکن اب اورنگ زیب بذات خود لشکر عظیم لئے ہوئے بڑھا اور شولاپور میں مقیم ہوا۔ اس کے لشکر کی صحیح تعداد بظاہر تحقیق نہ ہو سکی اگرچہ ظاہر ہے کہ وہ بہت کثیر تھی۔ البتہ ترتیب و تنظیم میں وہی شاہانہ شان و طمطراق ضرور تھا جس کی بدولت مغلیہ دربار کا جاہ و جلال ضرب المثل ہو گیا ہے۔ یہ جاہ و جلال اس وقت معراج کمال پر تھا اور اُمرا اور سرداران فوج میں بھی اس کا

جلوہ نظر آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مرہٹوں کا سیدھا سادہ انتظام بالکل مختلف اور سبق آموز تھا۔ ذیل کی دلکش عبارت اگرچہ طویل ہے مگر نہ صرف نہایت رنگین ہے بلکہ آیندہ کشمکش کے نتائج کا بھی ایسا مرقع پیش کرتی ہے کہ میں اسے تمام و کمال نقل کرنا جائز سمجھتا ہوں[۱]۔

[۱] وھو ھذا:۔

"پردیسیوں کے علاوہ اس کے رسالے میں کابل، قندھار، ملتان، لاہور، راجپوتانہ اور اس کی وسیع سلطنت کے بڑے بڑے صوبوں کے جوان بھرتی ہوتے تھے۔ رسالہ ہی ساری سپاہ کا عطر ہوتا اور اس میں دیو پیکر جوانوں اور گھوڑوں کے پرے نظر آتے جو سر سے پاؤں تک ایسے مسلح تھے کہ دکن کے ہلکے اور نیم مسلح سپاہیوں کا ان کے مقابلے کی ہمت کرنا بھی ناقابل قیاس معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پیادہ سپاہ بھی کثیر تھی اور اس میں تفنگچی، بندوقچی، تیرانداز ساز و براق سے آراستہ ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بندیلوں اور میواتیوں کی جمعیتیں پہاڑوں میں قزاقانہ جنگ کی عادی اور مرہٹہ سوالیوں سے نمٹنے کے لئے نہایت موزوں تھیں، انھی میں آگے چل کر بہت سے کرناٹک کے پیادہ سپاہی بھرتی کر لئے گئے تھے۔ شاہی خیموں کے ساتھ جو میدانی توپیں ہوتی تھیں، انھیں چھوڑ کر صدہا توپیں ایسی رہتیں جن کو ہندوستانی لوگ چلاتے اور فرنگی توپچی اُن کے نگراں ہوتے تھے۔ توپ خانے کے ساتھ طرح طرح کی سرنگیں اور سرنگ انداز رہتے تھے۔ جنگی ہاتھیوں کی بہت بڑی قطار کے پیچھے ایک قطار خاص شاہی ہاتھیوں کی ہوتی جن پر بیگمات سوار ہوتیں یا بڑے خیموں کے لادنے کا، جو اونٹوں پر نہ چل سکتے تھے، کام لیا جاتا تھا۔ بادشاہی سواری کے لئے صدہا گھوڑے شاندار ساز و یراق سے تیار رکھے جاتے تھے۔ طرح طرح کے حیوانات بھی لشکرگاہ کے ہمراہ چلتے تھے اور اس کارخانے میں بعض اوقات دنیا کے نادر ترین جانور خریدے اور بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جاتے۔ یہ غیر معمولی جلوہ ٹھاٹ شکرے، باز، کتے، شکاری شیر، شکاری ہاتھی اور شکار کے ہر قسم کے لوازم سے اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ شاہی خیام کے گرد جو قنات ہوتی اس کا محیط ۱۲ سو گز اور اس کے اندر ہر طرح کے کمرے جو بڑے سے بڑے محل میں پائے جاتے ہیں موجود ہوتے۔ دربار عام، مجلس شوریٰ، عدالت، دفاتر وغیرہ کے بڑے بڑے ایوان نما خیمے بیش بہا ساز و سامان سے آراستہ ہوتے تھے اور ان میں بادشاہ کی نشست کے واسطے اونچی جگہ یا تخت ہوتا۔ ان کے گرد مرصع ستون اور مخمل کے چھتر (کارچوبی کام اور نہایت قیمتی جھالریں ٹانک کر) لگا دیئے جاتے تھے۔ مسجد، وعظ خانے وغیرہ کے خیمے، حمام، ورزش، تیراندازی وغیرہ کے لئے

مگر شہنشاہ کی معرکہ آرائی سب سے اوّل مرہٹوں کے خلاف نہیں عمل میں آئی۔ بلکہ پہلے سلطان اعظم کو بیجاپور پر فوج دے کر بھیجا گیا۔ اسے وہی دقتیں پیش آئیں جیسی اس کے بھائی کو گولکنڈہ میں پیش آئی تھیں اور اسے بھی غازی الدین نے کمک بھیجا کر مخلصی دلائی۔ تب اورنگ زیب نے پائے تخت کا پوری طرح محاصرہ کر کے فصیلوں میں جا بجا شگاف ڈلوا دئیے۔ ادھر فاقہ کشی نے اپنا کام کیا اور بالآخر محصورین نے ہتھیار ڈال دئیے (۱۶۸۶ء) اور یہ مملکت ایک صوبہ بنائی گئی۔ شاہ بیجاپور کو قید میں ڈالا اور بہت اغلب ہے کہ

بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ غلام گردشیں جدا ہوتیں۔ محلسرا کے خیمے تکلف اور پردے کے اعتبار سے ویسے ہی عجیب تیار کئے جاتے جیسے دہلی کے محل۔ ایرانی قالین زرنگار پردے۔ یورپ کی مخملیں، اطلسیں، ہر قسم کا چینی ریشم، ہندوستان کی ململ اور زربفت، غرض بیش بہا سے بیش بہا سامان بڑی کثرت سے ان خیموں میں موجود ہوتا تھا۔ شاہی خیموں پر سنہرے روپہلے لٹو اور کلس چڑھے رہتے، اور بیرونی قناتیں وغیرہ ایسی رنگین لگائی جاتیں کہ خیمہ گاہ کی زیب و زینت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ شاہی خیام میں ایک پر شکوہ ڈیوڑھی سے داخلہ ہوتا جس کے دونوں طرف دو نفیس کوشک تیار لئے جاتے اور ان کے سلسلے میں توپوں کا حلقہ بنا کر سرے پر شاہی نقارہ اور نوبت خانے کے بڑے بڑے خیمے لگائے جاتے تھے۔ سامنے سے اور اندر بڑھیں تو شاہی پہرہ ملتا جس کا قائد کوئی امیر ہوتا اور وہ روزانہ خود بھی سوار ہو کر خدمت انجام دیتا تھا۔ جس حلقے کا اوپر ذکر ہوا اُس کے دوسرے پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ خیمے شاہی سلاح خانے، یراق خانے کے لئے لگائے جاتے تھے۔ ایک خیمہ آبدار خانے کا جس میں شورے سے ٹھنڈا پانی تیار رہتا۔ اسی طرح فواکہ، مٹھائی، پان وغیرہ ہر ضرورت کے لئے جداگانہ خیمہ نصب ہوتا، اور باورچی خانے اور اصطبل کے بہت سے ڈیرے الگ ہوتے تھے۔ کسی لشکر گاہ میں اس قسم کے سامانِ عیش کا قیاس میں آنا بھی دشوار ہے مگر جو کچھ بیان ہوا اس سب کے ماسوا طرفہ تر یہ بات ہے کہ ہر قسم کے دو دو خیمے موجود ہوتے اور ان میں سے ایک بادشاہ کے پہنچنے سے پہلے ہی اگلی منزل پر نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی سواری جلوس کی طرح چلتی اور جب خیمہ گاہ میں داخل ہوتا تو پچاس ساٹھ توپوں کی ٹھلک سے اس کا اعلان کیا جاتا۔ اور لشکر گاہ میں بھی درباری آداب و رسوم کی بالکل اسی طرح پابندی کی جاتی جس طرح شاہی پائے تخت میں دستور تھا۔

زہر دے کے مروا دیا گیا۔ عمائد ملک بادشاہی ملازمت میں داخل کر لئے گئے۔ پائے تخت میں سابقہ عظمت کے یادگار آثار باقی رہے لیکن اول تو وہ محض صوبے کا مستقر اور پھر محض شہر خموشاں رہ گیا۔ تھوڑے دن بعد ہی حشر گولکنڈے کا ہوا (۱۶۸۷ء)۔ اس کے فرماں روا کے خلاف شہنشاہ ساز باز کرتا رہا۔ رفیقوں نے اسے دغا دی پھر بھی وہ بہادری سے مقاومت کئے گیا تا آنکہ غداری کی وساطت سے اُسی تاریک و دشوار گزار قلعے میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے اس کا سابقہ حریف، شاہ بیجاپور بھیجا گیا تھا۔ مگر حیدرآباد غازی الدین کے اخلاف کا پائے تخت بن گیا اور اس شہر کی سابقہ شان شوکت فی الجملہ برقرار رہی جس کے قلعے سے یہ پوری مملکت منسوب کی جاتی تھی۔ یہ علاقہ بھی دکن کا چھٹا شہنشاہی صوبہ بنا لیا گیا۔

سلطان معظم کو اس نکوکاری کے جرم پر کہ بدنصیب شاہ گولکنڈہ کے مصائب میں کمی کرنے کی سفارش کی تھی، آتش مزاج اور شکی باپ نے ۶ سال تک مقید رکھا۔

اس عرصے میں سیواجی کے ناکارہ بیٹے نے مغل حملہ آوروں کو روکنے کی بہت کم کوشش کی اور خود اس کی قضا بھی اب سر پر کھیلتی نظر آتی تھی۔ وہ مغربی گھاٹ کی حکومتوں کی مقامی رقابتوں، ادنیٰ سازشوں اور ذرا ذرا سے قضیوں میں اُلجھا رہا۔ بدچلنی سے کمزور ہو گیا۔ خود پرست اور ناکارہ محض کلو شا کے رسوخ و اثر نے اس کے زیادہ لائق اور مستعد رفیقوں کی تگ و دو کو بھی ماند کر دیا اور ان حالات میں اس نے مغلوں کے مقابلے میں تمام جنوبی ہندوستان کی قوت متحد کر لینے کے ایک سے زیادہ اعلیٰ درجے کے موقعے کھو دئیے۔ اس میں بہت کم شبہ نظر آتا ہے کہ اگر اس وقت سیواجی برسر اقتدار ہوتا تو وہ عین وقت ہی پر، اپنی قوم اور افغانی مملکتوں میں، جو زد پر تھیں انگریزوں اور پرتگیزوں میں، جنھیں ابھی سے مغل شہنشاہ کا نہ صرف خوف بلکہ اس کی استبداد کا تجربہ ہونے لگا تھا۔ سدّی کے ساتھ جس کے فوائد بھی اسی طرف تھے۔ میسور کے باہمت راجہ چک دیو سے جس کی اُن دنوں وقعت بڑھ رہی تھی، حتیٰ کہ نیم وحشی پولی گاروں سے بھی، جو ملک کے غیر آباد و انقطاع میں تقریباً خود مختار تھے اور جن میں سے ایک نے کئی سال بعد بادشاہی سپاہ کے جس کا سپہ سالار خود شہنشاہ تھا، مدت تک تمام حملے منتشر کر دئیے۔ ان سب کو کم سے کم عارضی طور پر ضرور

متحد کر لیتا۔

اعتراض ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں انگریز محض بودے بیوپاری لوگ تھے اور اورنگ زیب سے جنگ کی جرأت نہ کر سکتے تھے، لیکن مجھے یہ خیال اس قدر یقینی نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ فی الواقع انھوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر، ہندوستان کے دونوں جانب سمندر میں شہنشاہ کے ملازمین سے تنِ تنہا مقابلہ کیا۔

مگر سنبھاجی صریحاً اس قسم کے وسیع اور پیچیدہ اتحاد کے تخیل یا اس کو عمل میں لانے کی قابلیت سے عاری تھا۔ اس نے کرناٹک کے ساحل کی طرف ایک حملہ کر کے بادشاہی افواج کو ادھر متوجہ کرنا چاہا تھا، لیکن ذلت و ناکامی اٹھائی۔ وہ ٹرپ کا پتہ بھی جو اس کے ہاتھ آگیا تھا، اُس نے اٹھا کے پھینک دیا یعنی شہزادہ اکبر کو جانے دیا۔ حالانکہ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے لشکروں کا تن وہی سے مقابلہ کر چکا تھا۔ اکثر مواقع پر مفید مشورے دے چکا تھا اور اس کی موجودگی سے مرہٹوں کو ایک قسم کی اخلاقی تائید حاصل ہوگئی تھی۔

سیواجی کی ملکی اور جنگی تنظیم اور بھی ابتر ہوتی گئی حتیٰ کہ سوائے قلعوں کے اور کوئی انتظام مشکل سے باقی رہ گیا۔ مرہٹوں کا میدانی علاقہ تسخیر ہوگیا اور قلعوں پر حملے ہونے لگے بلکہ بعض مفتوح بھی ہوگئے۔ ان کی تسخیر گویا اس نیم مردہ اور بہ سرعت مضمحل ہونے والی قوم کی موت کا پروانہ تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس موقع پر ایسے سرپھرے اور بہادر لوگوں نے اس اصول کے مطابق اپنی خرابیوں کا علاج نہیں کیا کہ قوم کے لئے ایک شخص کی ہلاکت، عین مصلحت ہے،، لیکن ایسے کسی منصوبے کا پتہ نہیں چلتا۔ راجہ کو مارنا یا محض معزول کرنا بھی اس کے ہم قوموں کے جذبات اور تعصبات کو سخت صدمہ پہنچاتا کہ وہ راجہ ہونے کے علاوہ سیواجی کا بیٹا بھی تھا۔ آخر کار مغلوں نے ٹھیک وہی کام کر دیا جو ان کے خطرناک دشمنوں میں آزادی کی روح پھونکنے اور مایوسانہ جد و جہد پر آمادہ کر دینے کے واسطے درکار تھا، جس نے بتدریج ترقی کر کے بالآخر فتح و ظفر حاصل کر لی۔

اعتقاد خاں نامی ایک سرگرم سردار، مغربی بالاگھاٹ میں مقرر تھا، اسے

وہ مقام معلوم ہوگیا جہاں سنبھاجی، تائی برلیس (liberus) کے کیپ ری کے قیام کی طرح، ادنیٰ درجے کے مشاغل عیش میں مدہوش و منہمک تھا۔ اور یہ امیر پہاڑوں کے سب راستے معلوم کر کے یکایک وہاں جا پہنچا۔ صرف چند چیدہ سوار ساتھ تھے اور اتفاق سے انھوں نے عقب سے سنبھاجی کو جا لیا۔ وہ اور اس کا مُنہ چڑھا مصاحب، دونوں پکڑے گئے۔ انھیں اونٹوں کی کمر سے باندھ کر شاہی لشکر گاہ لے چلے تو دشمنوں کے گروہ در گروہ انھیں دیکھ دیکھ کر خوشی کے نعرے لگاتے اور ان کی اہانت و استہزا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے شروع میں اورنگ زیب اس ذلت رسیدہ راجہ کی جان بخش دینے پر مائل تھا بشرطیکہ وہ بلا تاخیر سب قلعے حوالے کر دے۔ لیکن اپنی انتہائی رسوائی اور موروثی دشمن کی صورت دیکھ کر بد نصیب سنبھاجی میں اپنے باپ کی حمیت جوش میں آگئی اور اس نے اپنی مایوسی، نفرت اور کچھ ایسا کر گزرنے کا ارادہ جس سے اس بدتر از موت زندگی سے فی الفور نجات مل جائے۔

سنبھاجی کا سر قلم کر دیا گیا۔ یہ کتنا ہی عبرت خیز و رنج دہ کیوں نہ ہو، غالباً اپنی قوم کو اس جمود و غفلت سے نکالنے کے لئے ناگزیر تھا، جس میں اس نے اپنے آپ کو اور قوم کو ڈال دیا تھا سنبھاجی کے ساتھ کلو شاہی ہلاک ہوا۔

واقع میں سنبھاجی کی موت نے قوم میں نئی روح پھونک دی۔ اس کا ایسا خاتمہ کرنے سے خود اُس کی قوم کا دل کانپتا تھا، پس مغلوں نے یہ کام کیا تو وہ سخت غضب ناک ہوئے اور ان کا قصد مقاومت قوی تر ہو گیا۔ مرہٹہ رئیسوں کی مشاورۃ ہوئی جس کی صدر سنبھاجی کی بیوہ جیسو بائی تھی۔ بھائی، راجہ رام جسے اس کے مقابلے میں راجہ بنانے کی سازش ہوئی تھی، اور جو اُس وقت سے قید میں زندگی گزار رہا تھا وہ بھی جلسے میں شریک تھا۔ متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ سنبھاجی کا بیٹا سیوا جی ابھی خُردسال اور ایسے نازک وقت میں حکمرانی کے لائق نہیں ہے، لہٰذا رام راجہ کو اتالیق مقرر کر دیا جائے اور سب لوگ پوری قوت سے اپنے راجہ کے اس بے رحمی سے قتل کئے جانے کا انتقام، اور سنبھاجی کی بے عقلی کے باعث جو کچھ نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی کی کوشش کریں۔ جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ ان مقاصد کے لئے واقع میں بہت اچھی تھیں۔ ریاست کے ابتر حالات پر تحمل سے تبصرہ کیا گیا اور مناسب

تجاویز مرتب ہوئیں۔ خزانہ خالی تھا۔ فوجی نظام بگڑتے بگڑتے محض غارت گری کا اڈا عام رہ گیا تھا۔ جو قلعے قبضے میں رہ گئے تھے ان کی فوج اور رسد رسانی کا انتظام بھی اچھا نہ تھا میدانی علاقے پر دشمن قابض تھے۔ مرہٹہ راجہ کے قدیم باشندوں کی پہلی سی دھاک باقی نہ تھی جو مسلسل کامیابیوں کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔ اور نہ تو وہ مرہٹہ رئیس جو پہلے بیجاپور میں ملازم تھے، کسی مذہبی یا قومی ہمدردی کی بنا پر آمادہ تھے کہ مرہٹہ ریاست کا ساتھ دیں اور نہ وہ آفاقی سپاہی جنھیں محض روپے سے کام تھا۔ ان شکست خوردہ، پریشان و پراگندہ احوال غارت گروں کی طرف آملنے پر مائل ہوتے تھے۔ بایں ہمہ، وہ مآل اندیشانہ، جامع اور مناسب وقت انتظامات جو اب کیے گئے، بالکل ضرورت کے مطابق ثابت ہوئے اور ان سے آناً فاناً تقدیر کا پلڑا مرہٹوں کی طرف جھک گیا۔ نئی حکومت کا پہلا کام یہ تھا کہ قلعوں میں رسد اور فوج مہیا کرے۔ اور غلے اور گھاس کا ذخیرہ جمع کرائے۔ سیواجی کا سخت انتظام قائم کرنے اور خود ساختہ لٹیروں کی بجائے تنخواہ دار سپاہیوں کے لانے میں تاخیر اور مشکلات پیش آئیں کیونکہ روپیہ موجود نہ تھا۔ تاہم ایک لائق دیوان کی کوشش اور بعض قومی جذبہ رکھنے والوں کی مدد سے یہ کام بھی بخوبی ہونے لگا۔ ایک اور وزیر جس کا آوارہ گرد سلح داروں میں بہت اثر تھا، اس نے انھیں فراہم کرنے کا ذمہ لیا اور آہستہ سے تمام دیہات میں انھیں پھیلا دیا کہ پورے باخبر اور فوری ضرورت کے لئے تیار رہیں پچھلے مصیبت انگیز دورِ حکومت میں بعض سرداروں کی بہادری اور جوش بھی سینوں میں دبا رہ گیا تھا، وہ ازسرِ نو ابل پڑا اور اپنے ساتھیوں میں بھی سرایت کر گیا۔

شہنشاہی افواج کے مرہٹوں سے سازباز کی جانے لگی اور ان میں جو لوگ علانیہ ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے، وہ بھی وقت پر حبِ وطن دکھانے اور ساتھ چھوڑ کر نکل جانے کی سوچنے لگے۔ اتالیق یا نائب الریاست کی کیفیت زمانۂ حال کے ایسے جنگی آمر کی سی تھی، جسے حملے کے وقت قومی مدافعت سپرد کی گئی ہو۔ وہ علاقے بھر میں دوڑتا پھرتا تھا کہ مدافعت کا انتظام کرے اور ہر دفاعی مرکز کو خود دیکھے اور لوگوں میں اپنے عزمِ مصمم کی روح پھونک دے۔ اس کے بھائی کی بیوہ اپنے بچے کو لیکر رائے گڈھ میں پناہ گزین ہوئی جو سابق میں سیواجی کی جنگی قوت کا مبدء اور لوٹ کے مال کا مخزن تھا سب ممکنہ صورتوں کی تیاری کی غرض سے یہ شروع ہی میں

تہیہ کر لیا گیا تھا کہ اگر بالائی علاقے میں مدافعت نہ ہو سکے تو رام راجہ اپنا مستقر کرناٹک کے میدانی علاقے میں منتقل کر لے جہاں اس کے موروثی تعلقات تھے اور جس کا بہت کچھ حصہ اس کے باپ نے فتح کیا اور جہاں پہاڑ کی بلند سہ گوشہ چوٹی پر جنجی کا مستحکم کوہستانی حصار اس کے قبضے میں تھا۔ یہی وہ قلعہ ہے جو آیندہ انگریزوں سے تمام لڑائیوں میں فرانسیسیوں کے بڑھے ہوئے جنگی مرکز کا کام دیتا رہا۔

برسات آجانے سے مرہٹوں کو ذرا امن اور فرصت ملی کہ دفاعی تدابیر تکمیل کر لیں لیکن برسات جانے کے بعد پھر پوری قوت سے جنگ چھڑ گئی۔ قلعوں کا بیرونی زنجیرہ جس کو سیواجی نے اپنے آخری زمانے میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا تھا، اس سے دشمن پہلے ہی پار ہو چکا تھا۔ اب سب سے پہلے رائے گڈھ پر حملہ ہوا جہاں جیسو بائی اور سیواجی کا ہمنام پوتا چھپائے گئے تھے۔ یوں بھی اس من چلے کے، جس کی ذہانت اور کدوکاوش سے (مرہٹہ) قوم وجود میں آئی، بہت سے کارنامے اور کامیاب چھاپے اسی گرد و نواح میں ہوئے تھے۔ غداری کی بدولت یہ قلعہ مسخر ہو گیا۔ (سنہ ۱۶۹۰ء)

صغیر سن راجہ اور اس کی ماں کی گرفتاری سے بھی بظاہر ان کے رفیقوں کی ہمت شکستہ نہ ہوئی۔ تاہم اس کا مرہٹوں کے انجام اور حکومت کی نوعیت دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا۔ جیسو بائی اور اس کے بیٹے سے شہنشاہ کی بیٹی کو بہت ہمدردی ہو گئی اور شاہی لشکرگاہ میں ان کے ساتھ اچھا سلوک ہوا اگرچہ وہ اپنے اُن ہموطنوں سے بھی قطعاً ملنے نہ پاتے تھے جو ابھی تک اورنگ زیب کے زیر علم تھے۔ اُدھر، اسی سردار اعتقاد خاں نے جو اب ذوالفقار خاں کے خطاب سے مشہور ہوا، رائے گڈھ کی فتح اور سیواجی اور اس کی ماں کو گرفتار کرنے کے بعد مرچ اور پنالا کو تسخیر کر لیا۔ اب راجہ رام کو ضروری نظر آیا کہ حکومت اور فوجوں سے آزادی سے کام لینے کی غرض سے کرناٹک کے پائین گھاٹ کا راستہ لے جو غنیم کی توجہ کو بھی اُدھر سے ہٹا دینے کا باعث ہو۔ مہاراشٹر میں جو عہدہ دار اس کی طرف سے مقرر تھے، انھیں احتیاط سے الگ الگ کام تفویض کیے۔ جو قلعوں کا علاقہ ابھی تک بچا ہوا تھا۔ اُن کا آخری دورہ کر کے دیکھ بھال کی اور لوگوں کی ہمت بڑھائی۔ اس کے بعد سر ہتیلی پر رکھ کر ساحل کی طرف فرار ہوا۔ اس طرح کہ غنیم دباتا چلا آتا تھا اور کئی بار مفرورین گرفتار ہوتے ہوتے بال بال بچے۔

تاآنکہ وہ اور اس کے سب سے لائق اور باہمت سرداروں کی ٹکڑی صحیح سلامت جنجی پہنچ گئی۔ یہاں راجہ کی باقاعدہ مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی اگرچہ اُس کے بھتیجے کی جماعت نے آگے چل کر اسے محض عارضی مسند نشینی قرار دیا۔ بہرحال رام راجہ نے سرکاری خطابات، خلعت اور تمغے وغیرہ عطا کئے۔ جاگیریں دی گئیں جن میں نہ صرف ایسی اراضی تھیں جن پر اُس وقت مغل قابض تھے بلکہ ایسی بھی، جو کبھی مرہٹوں کے قبضے میں نہ آئی تھیں۔ ان تدابیر حکومت کی زندگی اور اپنی قوت بازو پر اعتماد و استقامت کا ثبوت دیا گیا اور ان لوگوں کو اطمینان دلایا گیا جو انہیں کا غائب ہو جانا ریاست کے حق میں فالِ بد سمجھتے تھے۔ پہاڑی پر خیر خواہ جوق در جوق آتے اور جنجی میں ایسی ملازمت چاہتے تھے جس میں بوقت واحد انسانی فطرت کے اعلیٰ اور اسفل میلانات کے لئے کافی کشش موجود تھی۔

مگر جہاں شہنشاہ ان قزاقوں کو پہاڑی دامنوں میں اطمینان سے کھدیڑ رہا تھا، وہیں اس بات پر بھی آمادہ نہ تھا کہ کسی دوسرے مقام پر ان کو جم جانے کا موقع دے۔ اس نے دوبارہ ذوالفقار خاں کو قیادت سپرد کی اور یہ مستعد سپہ سالار مشرق کی طرف روانہ ہوا کہ جنجی کا محاصرہ کرے۔ اُس وقت بھی مرہٹوں کی ٹکڑیاں دکن میں پھیلی ہوئی تھیں اور کبھی یہاں کبھی وہاں ایسے مقامات کو خوفزدہ کر جاتی تھیں جن کی نسبت خیال تھا کہ ان کی دست برد سے بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔ جنجی کی مضبوطی دیکھکر ذوالفقار خاں بہت گھبرایا اور اپنی سپہ کو تعداد میں اتنا نہ پایا یا نہ سمجھا کہ وہ پوری طرح قلعہ کا محاصرہ کر لے۔ اس نے سر دست تنجور و ترچناپلی کے زرخیز اضلاع سے نذرانہ وصول کرنے پر اکتفا کی اور دکن سے کمک کے لئے لکھ بھیجا۔ لیکن شہنشاہ سے، باآں ہمہ وسائل و اقتدار، کمک ملنا اتنا آسان نہ تھا جتنا طلب کرنا۔ مقابلے کی قوت بڑھتی جاتی تھی اور نئی تنظیم وہ عجیب کام کر رہی تھی کہ خود سیواجی سے بمشکل بن پڑا ہوگا۔ نیم وحشی پولی گاروں سے اب اس قسم کی جنگ چھڑ گئی تھی جو اُن کے مذاق اور حالات کے عین موافق تھی چنانچہ بیدڑ کے رئیس نے، جس کا اشارۃً اوپر ذکر ہوا، شہنشاہی فوجوں کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کیا کہ آخر میں خود اورنگ زیب کو جد و جہد کرنی پڑی۔ وائی کے مغل فوجدار کو پوری جمعیت سمیت پکڑ کر، مرہٹوں نے وہاں مرہٹہ قلعہ دار مقرر کیا (۱۶۹۲ء) رائےگڈھ اور پنالا دوبارہ لے لئے گئے۔ مرچ کے شاہی حاکم پر بھی یہی گزری جو وائی کے فوجدار پر

گزرہی تھی۔ مرہٹہ چوتھ بھردیدہ دلیری اور باقاعدگی سے وصول کی جانے لگی بلکہ ان کے سرغنوں کی ہمت افزائی اور انعام کی غرض سے گھاس دانے کا نذرانہ بھی بڑھا دیا گیا۔ راجہ نے ان کی خدمات بگرمجوشی سے تحسین کی اور اعزازی تحائف بھی خفیہ طور سے جنجی سے بھیجے گئے کہ انھیں مزید سعی و کوشش کی ترغیب ہو۔ کامیابی سے دلیر ہوکر انھوں نے ہندوستان سے مغلوں کے قافلوں پر حملہ شروع کیا۔ کئی بار سرداریاں کاٹ دیں اور تین دفعہ فوجی سرداروں کو شکست دی اور گرفتار کیا جو خطرے کی روک تھام کے لئے بھیجے گئے تھے۔

آخرکار ذوالفقار خاں کی مدد کے لئے ایک بڑی فوج روانہ ہوئی۔ مگر مغلیہ لشکر میں حسد و رقابت نے زور کیا۔ دوسرے اس میں بیجاپور کی سابقہ ریاست کے بہت سے مرہٹے بھی نوکر تھے۔ ان دونوں اسباب سے رام راجہ کے حاشیہ نشیں عیار برہمنوں نے خوب کام لیا۔ ذوالفقار خاں کو غصہ تھا کہ اُس کی جگہ شہزادہ کام بخش کو اعلیٰ سپہ سالاری تفویض ہوئی۔ اس نے رام راجہ کے حسب مراد کام کرنا شروع کیا اور قلعے پر حملے کی قوتوں کو معطل کرادیا۔ (۱۶۹۴ء) پانچ سال گزر گئے اور قلعہ جنجی فتح نہ ہوا۔ اس سے بھی بڑھکر بادشاہی لشکر کی ذلت اس کی فصیل کے سامنے یہ ہوئی کہ دکن کا سب سے ممتاز اور باہمت مرہٹہ سردار سنتاجی اسے چھڑانے کے لئے بڑھا۔ ایک اور ایسا ہی دلیر و لائق سردار دھناجی اس سے پہلے اپنی تیز پا جمعیت لیکر پہنچا اور بے خبر محاصرین کو قبل اس کے کہ وہ کوئی کارگر مزاحمت کرسکیں، بھاری نقصان کے ساتھ منتشر کردیا۔ سنتاجی کو اس سے بھی بڑھکر اور کامل تر فتح نصیب ہوئی یعنی کوڑی پاک کے مقام پر، جسے بعد میں کلائیو کے ایک شاندار معرکہ کی بدولت شہرت جاوید حاصل ہوئی، اس نے بادشاہی صوبہ دار علی مردان کا مقابلہ کیا۔ اس کی فوج کو شکست دی لشکرگاہ اور سامان اور آخر میں خود یہ مغرور صوبہ دار اس کے ہاتھ آگیا۔ پھر سنتاجی نے محاصرین کو چاروں طرف سے خاص مرہٹہ طریق کے مطابق گھیر لیا۔ افواہ مشہور کی کہ اورنگ زیب فوت ہوگیا اور کام بخش کو خالی تخت پر اپنی مدد سے تخت نشیں کرنے کی دعوت دی۔ یہ بڑی عیاری کی، کارگر چال تھی۔ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ نے (جو وزیر اعظم اور اُن دنوں لشکرگاہ میں آیا ہوا تھا) اس فرضی یا واقعی بنیاد پر کہ کام بخش سے مذکورہ بالا

نامہ و پیام کئے جارہے ہیں، اس شہزادے کو حراست میں لے لیا۔ تب اس کی فوج فساد پر آمادہ ہوئی سنتاجی اسی موقع کی تاک میں تھا، اس نے دوہری قوت سے حملے شروع کئے۔ جنجی کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا اور خود محاصرین کی ناکہ بندی کرلی۔ اس حالت خراب سے وہ ایک شرمناک عہدنامہ کرکے نکل سکے جس میں ان کو واپس جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اورنگ زیب نے شہزادے اور وزیر کو واپس طلب کرلیا اور سپہ سالاری بلاشرکت دوبارہ ذوالفقار خاں کے تفویض کردی۔

لیکن پھر محاصرہ شروع کرنے کی بجائے ذوالفقار دوبارہ جنوب کی طرف چل دیا اور اپنے حریف کو جس سے غالباً اس کی ملی بھگت تھی، ایک اور کامیابی کا موقع دے گیا۔ ایک نامی سردار قاسم خاں جو قریب کے کسی صوبے کا والی بھی تھا، بڑا لشکر لیکر سنتاجی کی تاخت تاراج کا سدباب کرنے بڑھا لیکن راستے ہی میں حریف نے اسے آلیا اور پریشان کرکے علٰحدہ علٰحدہ اس کے ہر دستے کو شکست دی۔ وہ ایک قصبے میں پناہ لینے پر مجبور ہوا مگر قصبے والوں نے اندر نہ آنے دیا اور نوبت فاقہ کشی کی پہنچی تو اس نے ناچار پوری فوج سمیت ہتھیار ڈال دئے۔ یہ ایسی سخت ذلت تھی کہ شکست خوردہ سردار نے زہر کھالیا اور شہنشاہ نے اس کے ماتحتوں پر علانیہ عتاب کیا۔ تھوڑے ہی دن بعد سنتاجی ایک اور سپاہ کو کمین میں لگالایا اور اسے بھگاکر اس کا خیمہ و خرگاہ لوٹ لیا۔ شہنشاہ نے جنجی کی تسخیر کی تاکید کی تو بالآخر ذوالفقار خاں نے یورش کرکے اسے لے لیا (۱۶۹۸ء) لیکن رام راجہ اور اس کے اہل و عیال کو سلامت نکل جانے دیا اور وہ مہاراشٹر پہنچ گئے۔ اس بڑے قلعے کے نقصان کے علاوہ دو اور واقعات سے مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی قوت پر زد پڑی۔ ایک تو یہ کہ سنتاجی اور اس کے نائب دھناجی میں رقابت پیدا ہوگئی، جس نے ہراول کی فوج سے جنجی آتے وقت حریف کو شکست دی تھی۔ سنتاجی قومی مقصد کے لئے بہت کچھ کرچکا تھا اور سات سال سے مغلوں کو اس کا نام سنکر خوف آتا تھا۔ وہ کمینہ پن کے ساتھ مار دیا گیا اور لوگوں کے نزدیک راجہ کا بھی اس میں اشارہ تھا۔ اس کے پس ماندہ ایسے احسان فراموش حاکم کی ملازمت سے الگ ہوگئے لیکن اپنے طور پر مشترکہ دشمن سے جنگ جاری رکھی۔

دوسری طرف شہنشاہ کو تلخ وطویل تجربے سے یقین ہوگیا کہ مسئلۂ حل طلب اُس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہے جتنا وہ پہلے سمجھا تھا۔ اور یہ کہ مرہٹوں کو کلیۃً مغلوب کرنے میں بہت دیر لگی جاتی ہے پس اس نے معرکہ آرائی کی ایک نئی تدبیر اختیار کی باضابطہ تقسیم عمل سے کام لیا۔ محاصرہ کرنے والے لشکر کے علاوہ ایک نیم مسلح لشکر آراستہ کیا جو ذوالفقار کے زیر قیادت میدان میں کام کرے اور اول الذکر صرف قلعے تسخیر کرے۔ اس لشکر کا سپہ سالار خود شہنشاہ تھا۔ افواج شاہی کے دل بجھے جاتے تھے۔ ان میں حرارت پیدا کرنے کی سخت کوشش کی گئی۔ سن رسیدہ شہنشاہ اس مقصد میں، جس سے گرد وپیش کے سب لوگ اکتا چکے تھے، برابر سرگرم وساعی تھا۔ چنانچہ اپنا شاندار لشکر اٹھا کر ویران پہاڑی علاقوں میں صعوبات جنگ جھیلنے کے لئے پھر آمادہ ہوگیا جس سے عیش پسند سردار بہت جلے۔

ادھر رام راجہ نے دکن پہنچ کر بڑی دھوم کا اور سب سے بڑا فوجی اجتماع کیا اور گویا مراجعت کی یادگار میں باضابطہ نہایت وسیع پیمانے پر نذرانہ وصول کرنے لگا۔ اور جہاں سے نقد رقم نہ ملی وہاں زمانۂ حال کے پروشوی طریق کے برعکس، تمسک لکھوا لئے اور مرہٹوں کے خیال کے مطابق، آئندہ کے حق کی بنیاد مضبوط کردی۔ مگر نواح نربدا سے واپسی کے وقت اس پر ذوالفقار نے اپنی جدید ترتیب یافتہ فوج سے بہ شدت حملہ اور تعاقب کیا اور راجہ اس طویل وتکلیف دہ پسپائی میں اتنا مضمحل ہوا کہ بیمار پڑ کر ایک ہی مہینے میں فوت ہوگیا (سنہ ۱۷۰۰ء)۔

اس نے باپ کے گھرانے کی عزت رکھنے میں بہت کچھ کیا۔ اس کا صرف ایک جرم ہے کہ سنتاجی کے قتل میں خفیہ شریک تھا، لیکن یہ بھی مشکل سے ثابت ہے۔ اس کام نا سنکر مغل بہت خوش ہوے لیکن اس وقت کوئی فائدہ انھیں حاصل نہ ہوا۔ اگرچہ اس کے مرنے سے غالباً وراثت کے جھگڑے میں ترقی ہوئی اور اس سے مغلوں نے فائدہ اٹھایا۔ رام راجہ کی بیوہ، تارا بائی بیٹے کی خردسالی کے زمانے میں اتالیق مقرر ہوئی۔ اس بچے کا نام بھی سیواجی تھا۔ اس کی ماں، لائق، حوصلہ مند اور مردانہ قوت کی عورت تھی۔ وہ جابجا پھرتی اور اپنے پیچھا کرنے والوں کو پریشان کرتی اور خیر خواہوں کی کوششیں تازہ کرتی تھی۔ بادشاہی افواج نے

بعض جزئی فتوحات کے علاوہ ستارا کی راج دھانی کو فتح کر لیا۔ گو اہل قلعہ نے دیر تک جم کر مدافعت کی۔ مگر اس کے بعد ہی بادشاہی فریق کو زک اٹھانی پڑی۔ اووین گلین ڈوور (Owen Glendower) کے معاملے کی طرح، یہاں بھی عناصر نے مرہٹوں کی پہاڑیوں میں ان کا ساتھ دیا۔ اور جیسا اوپر کی مثال میں ہوا تھا، یہاں بھی حملہ آوروں کو فی الواقع سخت نقصانات اٹھانے پڑے جس کا سبب یہ تھا کہ انھیں طوفانی برسات کے زمانے میں کوہی جنگ کے خطرات و مہالک کا پورا تجربہ یا اس کی پوری تیاری نہ تھی۔

سالہا سال تک یہ تھکا دینے والی جنگ جاری رہی۔ اورنگ زیب قلعے پر قلعہ فتح کرتا رہا مگر انھیں ہر دفعہ پھر مرہٹے واپس لے لیتے تھے۔ ادھر میدانی علاقے ہر وقت باغیوں کی تاخت و تاراج کی زد میں تھے۔ بادشاہی فوجوں کو بار بار شکست نصیب ہوئی حتیٰ کہ وہ دشمن کا سامنا کرنے سے لرز جاتے اور جنھیں پہلے سخت حقارت سے دیکھتے تھے، اب ان کے آگے سے فرار اختیار کرتے تھے۔ فوج کی بد دلی، بودے پن اور کم ہمتی میں غداری کا اضافہ ہوگیا۔ مغل سپہ دار اور مقامی سردار اپنے ناقابل شکست دشمنوں کو روپیہ دے دلا کے جنگ ٹالنے لگے بلکہ ان کے مال غنیمت میں حصہ بٹانے لگے اور اس طرح جنگ کی طوالت سے خود بھی فائدہ اٹھانے لگے۔ بادشاہی افواج کے مرہٹے سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنے قبیلے کے لوگوں سے جا ملتے یا خفیہ طور پر ان کی مدد کرتے تھے۔

شہنشاہ نے جس علاقے کو برائے نام فتح کیا تھا، اس کے محاصل وصول نہ کر سکا اور ہندوستان سے صحیح سلامت رسد پہنچنی محال ہوگئی۔ اس رسد رسانی سے اس کے پہلے کے مقبوضات (یعنی تمام ممالک ہند) مفلس ہوے جاتے تھے مگر موجودہ حالتِ خراب میں بغیر وہاں کی رسد کے کام چلنا بھی یوماً فیوماً دشوار تر ہوتا جاتا تھا۔ پوری سلطنت ہی کی کل بگڑ گئی اور انجام بھی اتنا ہی مصیبت انگیز و شرمناک ہوا جس قدر کہ ناممکن کام کرنے کی کوشش سخت و طویل تھی۔

اورنگ زیب نے سر عجز جھکا دیا اور صلح کرنے کی تجویز کی کہ سنبھاجی کے بیٹے کو چھوڑ دیا جائے اور بادشاہی صوبوں سے مرہٹوں کو نذرانہ وصول کرنے کا حق سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے (۱۷۰۰ء) لیکن یہ صلحنامہ موقوف رہا اگرچہ اس کے بعد

ہندوؤں کے محسوسات سے کام لینے کی جو کوشش کی گئی وہ بھی محض بے اثر ثابت ہوئی۔ یعنی اُن کے مقید راجہ کی طرف سے ہتھیار ڈال دینے کی منادی کرائی گئی۔ بیڈرئیس کا مورچہ بند قصبہ واکس کھیڑا مدت تک مغل اعظم کو روکتا اور ناکام کرتا رہا اور آخر میں اس کے نہ تھکنے والے سرکش دشمنوں نے خود اس کا (شہنشاہ کا) تعاقب کیا اور وہ ان کے ہاتھ میں قید ہونے سے بال بال بچ گیا۔

یہ آخری آزمائش مغرور و معمر شہنشاہ کے جسم و دل دونوں کے لئے سخت صبر آزما تھی۔ ایک نسل پہلے اُس نے سیواجی کو "موش کوہی" بتایا تھا اور اس کے بعد سے تمام زمانہ اور سلطنت کے جملہ وسائل اس سیاسی آزار کے استیصال میں اُس نے صرف کر دیئے مگر اب اسی پہاڑی چوہے کے رفیقوں نے ہر طرف سے اسے گھیر کر میدانی علاقے میں کھدیڑا اور آخرا سے اپنی قبر تک پہنچا دیا۔ اکیس سال پہلے وہ احمد نگر سے اس شان شوکت کے ساتھ چلا تھا جس کا اوپر حال بیان ہو چکا ہے، اب اسی جگہ وہ واپس ہوا اور اعتراف کیا کہ جس کام کا ایسے یقین کے ساتھ بیڑا اٹھایا تھا، اسے انجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوتا ہے اسے احساس ہو گیا کہ اپنی ساری چالاکی، تگ و دو، شان واقتدار کے باوجود اس کی زندگی ابتر و پریشان رہی۔ لہذا اعمال ماضیہ کے ناگزیر نتائج کو امور تقدیری کہکر اس نے اٹھاسی سال کی عمر میں رحلت کی (۱۷۰۷ء) اور کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت مغلیہ کی عظمت و سلامتی کو، جس کے لئے وہ اتنے دن تک "عاقلانہ نہیں مگر اچھی طرح" جد و جہد کرتا رہا تھا، اپنے ساتھ لے گیا۔

اس قطعی اور یادگار ناکامی کو میں نے اس کی ہر منزل میں صحت و دیانت کے ساتھ بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اور اس کے اسباب کی تلاش میں بھی کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اورنگ زیب کا مشہور سلیقۂ جہانبانی ایسی نادر دشواری کے موقع پر بالکل کام نہ دے سکتا تھا۔ شوق ملک ستانی نے اسے مہلک غلطی میں مبتلا کر دیا۔ ایک طرف تو بدامنی کے عناصر مرہٹوں میں موجود تھے اور یہ ہنوز یقینی نہ تھا کہ شہنشاہی افواج جو سیواجی کی قوت کو ابتدائی منازل میں کچلنے میں ناکام رہیں، ایک ایسی قوم کا کس حد تک قلع قمع کر سکیں گی جو تاخت تاراج کے

فن میں کمال رکھتی تھی۔ یہ لوگ عرصۂ دراز تک دُور دُور چھاپے مارنے کے باعث مالامال ہو گئے تھے۔ مذہبی جوش اور قومی عناد سے بھرے ہوے تھے۔ بڑے بڑے کارناموں کی یاد ان میں ولولہ پیدا کر رہی تھی۔ اور ایک دشوار گزار ملک میں جس کے چپے چپے پر قلعے اور گڑھیاں بنی ہوئی تھیں، وہ نہایت سرعت سے جمع ہونے کا ملکہ رکھتے تھے۔ بایں ہمہ اورنگ زیب نے اسی زمانے میں بیجاپور اور گولکنڈے کی بادشاہیوں کے خاتمے کا حکم دیا جس کے معنی یہ تھے کہ نظام حکومت ہی جو جنوب میں مسلمانوں کی سیادت کے کفیل اور باضابطہ حکمرانی کے باعث تھے، برباد ہو جائیں۔ ہندوستان میں، دوسرے ممالک سے بھی بڑھکر، بگاڑنا بہ نسبت بنانے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور ایک دفعہ سیاسی معاشرت کا شیرازہ بکھرا تو یہ کسی طرح لازم نہ آتا تھا کہ ان ریاستوں کی ہندو رعایا، خصوصاً مرہٹہ منصبدار یا عام طور سے وہ جرائم پیشہ قومیں جو ابھی تک، زوال پذیر مگر ہنوز قابلِ ادب، افغان بادشاہیوں کی ملازمت یا قابو میں تھیں، ان "جنگل والوں" کی طرف مائل نہ ہو جائیں گی جو کم رتبہ لیکن مستقل مزاج نیز آزادی اور قانون شکنی کے علم بردار تھے۔ مگر فی الواقع آخر میں ٹھیک یہی ہوا جیسا کہ اسی قسم کے حالات میں بارہا یورپ میں ایسے ہی نتائج ظہور میں آتے رہے ہیں۔

شہنشاہ کو اپنی ساری، مقامی واقفیت، مستعدی اور استقلال کے باوجود، اپنی حکمت عملی میں ناکامی نصیب ہوئی مگر اس کے علاوہ، اپنے ہمعصر لوئی چہاردہم کی طرح (جس سے تاریخی مواقع اور سیرت میں وہ ایک حد تک حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے) غرور کی وجہ سے تو اس نے اپنے دہقانی اور بے قاعدہ دشمنوں کی قوت کا اندازہ غلط کیا اور ان کے خاص حالات اور مزاج کے موافق جنگ آرائی کی تدابیر سے غفلت برتی۔ علاوہ ازیں جو شاندار ساز و سامان لیکر وہ آگے بڑھا، اس سے یہ تو ممکن تھا کہ بیجاپور و گولکنڈے کے زوال رسیدہ درباریوں کی نظر خیرہ ہو جائے لیکن اس طمطراق کو قائم رکھنے کے لئے ایک طرف تو سلطنت کے وسیع مگر محدود مداخل و وسائل ختم ہو گئے اور دوسری طرف ان کو دیکھکر لالچی اور دنیادار مرہٹوں میں جذبۂ آز اور نت نئی چال چلنے کا مادہ اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اکثر موقعوں پر بڑی سپہ سالاری ہونے

اور میدانی معرکوں میں شکست کھانے اور خاص خاص قلعے ہار جانے کے باوجود یہ باغی نہ صرف زیر نہ ہوئے بلکہ شاہی افواج کے قیمتی ساز و سامان، زر و جواہر اور ذخائر لوٹ کر مالا مال ہو گئے۔ اور آخر میں تو انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ جو ابھی تک شاہی افواج میں ملازم تھے، شہنشاہ کا جام صحت نوش کیا جس کی بدولت انھیں یہ کچھ مال و زر ملا تھا۔ اورنگ زیب کی بے مہری اور سب کے ساتھ اشتباہ و بد ظنی کے باعث، جہاں اپنے سے کسی عداوت کے [illegible] ما تقدم کی تدبیروں میں اضافہ کرنا پڑا۔ وہیں سچی موانست سے وہ محروم ہو گیا۔ اس کے ملازمین کی ہمتیں پست ہو گئیں اور جب اس کی دولت میں زوال آیا تو رشوت ستانی اور دشمنوں سے غدارانہ ساز باز کا بازار گرم ہو گیا۔

باب ہفتم

راجہ، نواب نظام الملک اور پیشوا

اورنگ زیب کی وفات سے ہندوستان کے حالات کی صورت تو کلیتہً بدل ہی گئی مگر مرہٹوں اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات میں بھی اس سے کامل اور مستقل تغیر واقع ہوا۔ وہ اوّل اول بیجاپور کی مشترکہ فوج کشی میں ان کے حلیف، پھر بادشاہی صوبوں کے بے چین و آزاردہ ہمسائے آگے چل کے مسلمانوں کی روزافزوں فتوحات کے سیلاب کے مقابلے میں، اپنی قومی اور مذہبی آزادی کے سرفروش وکامیاب محافظ اور آخر میں ایک دم توڑتے، مگر ابھی تک پُرنخوت، دشمن پر فتح کی شادمانی حاصل کر چکے تھے۔ اب اپنے مستقل مزاج دشمن کے بیٹوں میں خونریز جنگ و جدال کا تماشہ دیکھکر وہ مزے لیتے رہے اور آیندہ کسی نہ کسی مدعی سلطنت کے دوست یا طرفدار بنتے رہے۔ ان پر عام تسلط کا کوئی خطرہ نہ رہا بلکہ آیندہ کسی نے ایسا قصد بھی نہیں کیا اور معلوم ہوتا ہے انھیں اپنی قوت کو مضبوط کرنے اور سلطنت کے مقابلے میں اتنے دن تک جاں بازانہ جد وجہد کا ثمر حاصل کرنے کی کافی فرصت میسر آگئی۔

مانا کہ ان کا طریق جنگ، معمول کے خلاف اور نہایت غارتگرانہ تھا اور

اتنے زمانے کی عادت ہی کافی تھی کہ وہ چوری کی ضرورت رفع ہو جانے کے بعد بھی ہیرا پھیری سے باز نہ آئیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہ سچائی اور دلیری سے ایسے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے جو زیادہ با اصول افراد کی نظر میں بھی ایسی ہی قدر و قیمت رکھتے ہیں اگرچہ یہ افراد ان حقوق کی خاطر ہمیشہ اتنی جد وجہد نہ کریں۔ پس مرہٹوں کا مقابلہ اور حصولِ آزادی کی جنگ میں کامیابی، ہماری تائید و تحسین کی سزاوار ہے۔ آیندہ غارت گری کا میلان تو کم نہ ہوا بلکہ اس کا احاطہ آہستہ آہستہ اتنا وسیع ہوا کہ پورے ہندوستان میں یہی روح سرایت کر گئی تاہم دوسرے اعتبارات سے ان کی سیاسی حیثیت، نوعیت اور تعلقات میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔

(۱) اپنی اغراض کے لئے شہزادۂ اعظم، بھائی سے تخت و تاج کے لئے لڑنے شمال کی طرف چلا تو سنبھاجی کے بیٹے ساہو کو رہا کرتا گیا جو اتنے دن تک قید رہا اور جس کی طرف سے راجہ رام کم سے کم ابتدا میں نیابت کا ادّعا کرتا رہا تھا۔ ساہو اورنگ زیب کی بیٹی کا پروردہ اور خود شہنشاہ کا منظورِ نظر تھا لہذا بہت کچھ بادشاہ پرستی کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ سیواجی کے پوتے کے ناتجربہ کار قلب کے گرد درباری عیش و عشرت کے ریشمی تار لپٹ گئے تھے اور محلسرا کی پرامن۔ وحفاظت آرام کی زندگی کا اتنا خوگر ہو چکا تھا کہ سلطنت کا خراج گزار بنکر رہنا قبول کرلیا اور مشرقی طرز کے مطابق، اپنے دادا کی مستعدی اور ذاتی نگرانی کی زحمت اٹھانے کی بجائے جملہ انتظامات دوسروں کے حوالے کر دیے۔ بالفاظ دیگر آزاد جنگی رئیس کی بجائے مغلوں کا باج گزار حاکم بننے کو ترجیح دی۔

(۲) پس، ہر چند اس کا اقتدار قائم ہے، مالگزاری، مغل حکومت کے علی الرغم نہیں بلکہ زیر سرپرستی وصول ہو جاتی ہے اور اس کی حکومت کا دائرہ بھی وسیع تر ہو جاتا ہے، بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ شاہِ شطرنج رہ جاتا ہے اگرچہ اس کا رتبہ اتنا نہیں گرتا جتنا آیندہ اس کے جانشین کا گر گیا۔ پھر معمول کے مطابق، سلطنت کی باگ جو اُس کے مرتعش ہاتھوں سے گرنے لگتی ہے، اس کے مستعد، طالب جاہ اور دوراندیش وزیر فوراً اپنے قبضے میں کر لیتے اور نہایت سلیقے سے کام لیتے ہیں اس طرح تھوڑے زمانے کے بعد، راجہ کم و بیش

محض رسمی حاکم اور پیشوا کا دست نگر بن جاتا ہے جو بعد کے مرہٹہ خصائص کا حیرت انگیز اور مجسم نمونہ ہے۔

(۳) لیکن ساہو کی رہائی سے مرہٹوں میں دو بڑی تبدیلیاں اور بھی پیدا ہوئیں۔ یہ تدبیر اورنگ زیب نے باغیوں میں پھوٹ ڈلوانے اور ان کے سرگروہوں کے خلاف ساز باز میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے تجویز کی تھی اور واقع میں اس (رہائی) کا یہی نتیجہ ہوا کہ رام راجہ کی بیوہ تارا بائی نے اپنے صغیر سن بیٹے کی طرف سے ساہو کی حکومت تسلیم نہ کی اور کہنا شروع کہ اس کے سنبھاجی کے بیٹا ہونے میں بھی شبہہ ہے۔ چنانچہ مرہٹوں میں اختلاف پیدا ہوا اور بہت سے عمائد نے تارا بائی کا ساتھ دیا۔ ساہو کی راج دھانی ستارا بنا جسے اس نے ۱۷۰۸ء میں مغلوں سے واپس لیا تھا مگر حریف (یعنی رام راجہ کا بیٹا) کولھاپور میں آزاد رہا اور یہ خرابی اسی پر ختم نہیں ہوئی۔ جس طرح دورِ جاگیرداری میں یورپ اور خصوصاً اسٹیفن کے زمانے کے انگلستان میں ایسی ہی صورت پیدا ہوئی تو مابہ النزاع ریاست کا ہر مدعی اپنے رفیقوں کا زیادہ محتاج ہو گیا اور انھیں ایسی آزادیاں دینے پر مجبور ہوا جو اس کے اور ملکی اغراض کے لئے سخت مضر تھیں۔ اسی طرح اب مرہٹوں میں ابتری پھیلی اور اس سے بھی بڑھکر یہ آفت آئی کہ بہت سے سرکش، ظالم اور غارتگر سرداروں نے اپنے وارثِ سلطنت کی طرفداری کے بہانے سے خود نہایت بے رحمی اور بے امتیازی کے ساتھ خونریزیاں شروع کیں۔ خلق خدا پر بے حساب ظلم توڑے آفتیں ڈھائیں اور تمام علاقے میں ایسی ویرانی اور بدامنی پھیلادی کہ اگر دیہات کی تنظیم موجود نہ ہوتی تو پھر یہاں کی آبادی کا خدا ہی حافظ تھا۔ اس عرصے میں مغل بے شبہہ مزے سے اپنے پرانے دشمنوں کی باہمی جنگ و جدال کی سیر دیکھتے رہے جس نے بادشاہی صوبوں کو تاخت تاراج سے فی الجملہ بچا رکھا۔

(۴) ساہو کی رہائی اور مرہٹوں کی حالت میں جو تغیر واقع ہوا، اس کے سلسلے میں ایک اور امر بھی بیان کر دینا مناسب ہوگا، کہ اس تغیر کا دکن کی حریف قوموں کے تعلقات پر جو اثر پڑا اس سے دکن کا سیاسی نظم و نسق بھی خاص طور سے متاثر ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ساہو فی الواقع ایک باج گزار رئیس رہ گیا تھا لیکن

بادشاہی سیادت کو معاوضہ لئے بغیر اُس نے نہ مانا تھا۔ بلکہ ایک قسم کا راضی نامہ کر لیا تھا جس کی روسے راجہ کو دکن کے چھٹوں شاہی صوبوں میں چوتھ کا حق دیا گیا اگرچہ اس کی اہم شرط یہ تھی کہ یہ رقم ان صوبوں کا والی یا بادشاہی صوبہ دار خود وصول کرکے مرہٹوں کو دے دیا کرے گا۔ یہ گویا ساہو کو باج گزار رکھنے کی رشوت تھی اور ساتھ ہی مرہٹوں کے حملے اور غارت گری کا حیلہ دُور کرکے راجہ کو مقررہ مالگزاری سے معقول رقم دی جانے لگی۔ اس طرح وہ نظام سلطنت کا باضابطہ رکن بھی بن گیا اور قزاقانہ دست بُرد اور غارت گری کے انسداد سے جو اِس باغی قوم اور اُس کے ساتھیوں کے ہزارہا افراد کی وجہ معاش ہوگئی تھی، ان لوگوں کی نااتفاقی اور اپنے ہی وطن میں لڑنے اور لوٹ مار کرنے کا میلان قوی تر ہوگیا۔

دکن میں یہ بدامنی، لانظمی اور تذبذب کی حالت اس زمانے کا نمونہ اور ہندوستان کے عام حالات کے مطابق تھی ہر جگہ سلطنت کی بنیادیں متزلزل، اور شکستگی نمایاں تھی۔ نظم و نسق ابتر ہوگیا تھا۔ دربار میں انقلابات، بغاوتیں اور جانشینی کی جنگیں نہایت سرعت سے پے در پے ہوئیں۔ شہنشاہ وزیروں کے ہاتھ میں گڑا بن گیا اور دشمنوں کو مراعات کی رشوت اور اپنے برائے نام ملازموں میں تفریق ڈال کے بغاوت کا حفظ ماتقدم کرنے لگا۔ سلطنت کے محاصل پر وحشی قومیں اور من چلے رئیس ڈاکے ڈالنے اور اپنی ترکتازیوں سے اس کی تباہی کا سامان کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دن میں ہر صوبہ دار کو یہی فکر ہوگئی کہ ایسی کم طاقت بادشاہی سے کیوں نہ انحراف کرکے اپنی خود مختار سلطنت علیحدہ قایم کر لی جائے۔

دکن کے مختصر واقعات جو ساہو کی ابتدائی حکومت میں رونما ہوئے، یہ ہیں کہ وہاں کا صوبہ دار بہادر ذوالفقار خاں ہوا لیکن وہ دکن میں نہ رہتا تھا اور اس کا نائب داؤد خاں کام کرتا تھا۔ اسی نے چوتھ کے متعلق وہ سرکاری منظوری دلوائی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ساہو اپنے آپ کو ہندوؤں کا بادشاہ اور اسی کے ساتھ شہنشاہ کا زمین دار یا سد محصل کہتا تھا۔ اس کا حریف اور وراثت کا مدعی رام راجہ کی دوسری بیوی کا بیٹا سنبھاجی تھا اور اس کے معاملات رام چند رپنت کے ہاتھ میں تھے۔ یہ بڑے زور کا وزیر تھا اور تارا بائی کا بیٹا فوت ہوا تو اس نے تارا بائی کو قید کر دیا

ممتاز مرہٹہ رئیس ذرا ذراسی بات خصوصاً ذاتی نزاع اور مفروضہ بے توقیری پر ایک راجہ کا ساتھ چھوڑ کر دوسری طرف چلے جاتے تھے تاہم ساہو کے رفیقوں کی تعداد زیادہ اور لوگ نسبتہً لائق تھے۔ نکمے نمائشی لوگوں کی بھی کثرت تھی جن کی وجہ سے مضبوط واستوار انتظام قائم کرنا روز بروز دشوار تر ہوگیا۔ دوسرے ساہو اور داؤد خاں کی معاملت، ذاتی قسم کی تھی اور اندیشہ تھا کہ داؤد خاں اپنی جگہ سے برطرف ہوا تو اور بھی زیادہ ابتری پیدا ہو جائے گی۔

اس سے بھی بڑھکر ایک تبدیلی اور ہونے والی تھی۔ یہ سیاسی اور تمدنی بے ربطی دو خاص آدمیوں کی ممتاز و نمایاں عداوت کو تھوڑے دن میں ایک دوسرے کے مقابل لانے والی تھی اور ان کی کشمکش کے سامنے باقی سب فساد ہیچ ہو جانے والے، یا یوں کہو وہ سب اس کے تحت میں آجانے والے تھے۔ یہ ایسے ممتاز اور ایک دوسرے کی ضد تھے کہ اگر ساری تاریخ پر قابض نہ ہوگئے تو چھا ضرور گئے اور ان کی ذات میں وہ تمام مقاصد، طاقتیں اور طریقے جمع ہوگئے جو اتنے زمانے سے دکن میں اپنی سلامتی یا سیادت کے لئے مصروف جنگ تھے۔

مرہٹوں کے خانگی ہنگاموں یا سلطنت مغلیہ کے انقلابات کی یہاں تفصیل لکھنی ضروری نہیں مگر مختصر طور پر وہ اسباب و واقعات بیان کرنے مناسب ہوں گے، جو باجی راؤ اور نواب نظام الملک کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لائے اور وہ کشمکش چھیڑ دی جو ناگزیر تھی۔

یاد ہوگا کہ پیشوا کا عہدہ سیواجی کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ چند مشہور اشخاص اس پر مامور رہے لیکن اسے ستارا کی راج دھانی میں موروثی بنانے والا بالاجی وشوانا تھ، نواب نظام الملک کے حریف (باجی راؤ) کا باپ تھا۔ اس کوکنی برہمن میں ریشہ دوانی کے ساتھ کام کی وہ ہمت اور مستعدی بھی تھی جو اس برادری کے لوگوں میں نسبتہً کم ہوا کرتی ہے۔ مگر اس کی اولاد میں یہ چیزیں اسی کے برابر بلکہ اور بھی زیادہ جمع ہوگئی تھیں۔ گھاٹ کے دشوار گزار پہاڑی وطن نے، جہاں آمد رفت کے راستے تک مفقود تھے ابتدا میں اس پر جو اثرات ڈالے ان کی ایک وجہ یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے کہ اکثر مرہٹہ سرداروں کے برخلاف، یہ شخص

گھوڑے کا بہت مبرا سوار تھا۔ ہمعصر تحریروں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور ان میں یہ بھی لکھا ہے کہ دشمنوں کے سامنے سے بھاگنے کی جلدی ہوتی تو اس وقت بھی وشوا ناتھ کے گھوڑے کے دونوں طرف آدمی رکھنے پڑتے کہ اسے گرنے سے بچائیں۔ مگر ملاحوں کی طرح اہل کوہستان کا یہ نقص بھی جو تربیت کی خرابی سے ہوتا ہے قابل معافی ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا شخص میدان جنگ یا جلسۂ وزارت میں اچھی خدمت انجام دینے سے عاری ہے۔

وشوا ناتھ کی محنت اور قابلیت نے رفتہ رفتہ اسے اپنے رقیبوں کی دراندازی سے بالاتر کر دیا اور راجہ نے کامل اعتماد کے بعد اسے پیشوا مقرر کیا اور قدرے ناعاقبت اندیشی سے پورندھر کا مضبوط قلعہ اور نواح کا علاقہ بھی اسے عنایت کر دیا آخر میں مرہٹوں کے طریق مالگزاری کی اصلاح بھی اس کے تفویض ہوئی اور یہ کام اس نے بالکل نئے طریقے پر انجام دیا جو اس کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت تھا۔ اس سے رعایا کی اجتماعی قوت کو اور بالواسطہ پیشوا کی آیندہ سیادت و رسوخ کو بڑی تقویت پہنچی۔

اس نے سب سے اوّل مغربی ساحل اور کوکن کی ابتری پر توجہ کی اور اسے دور کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی کے ساتھ پورندھر کے گرد کے علاقے اور شہر پونا کو جو اس کے اخلاف کا پائے تخت بنا، ترقی دی۔ اُسے قزاقوں سے جن کے گروہ یہاں پھیلے ہوئے تھے، پاک کیا۔ دیہات کے انتظام پر توجہ کی۔ مستاجری طریقہ موقوف کیا اور ابتدائی تشخیص کو کم کر کے آہستہ آہستہ بڑھاتا گیا جو زراعت کی ترقی کا عام اصول ہے[1]۔

اس کی مالگزاری کی تجاویز مغلوں سے ایک نئے سمجھوتے کا نتیجہ تھیں مغلوں کی طرف سے اسے حسین علی خاں نے طے کیا جو دکن کا صوبہ دار بنکر آیا تھا (۱۷۱۸ء) اور جس کے واقعات آیندہ بیان ہوں گے۔ مگر نئی مراعات اور طریق تحصیل سے نہایت پیچیدہ ہونے کے باعث قطع نظر کر لی جائے تو بھی انھیں اجمالی طور پر

---

[1] گرانٹ ڈف۔

بیان کرنا ضروری ہے کیوں کہ وہ اس عجیب قوم کی پوری تاریخ اور پیشوا کے بیٹے کی سرگزشت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

سیواجی کی وفات کے وقت جو علاقہ اُس کے قبضے میں تھا اس کا بڑا حصہ ساہو کو واگذاشت کر دیا گیا۔ مالگزاری کی چوتھ اور سردیش مکھی، ایک مقررہ رقم کے عوض دینی منظور کی گئی جو مرہٹے شاہی خزانے میں ادا کرتے، انتظام کے ذمہ دار اور معین تعداد میں فوج دینے کے پابند ہوتے تھے۔ اس کا عمل دکن کے شاہی آہنی صوبوں کے علاوہ تنجور، ترچناپلی اور میسور کی باجگزار ریاستوں میں بھی تسلیم کیا گیا۔ مرہٹہ فوج رسمی طور پر تو بادشاہ کے لئے، لیکن حقیقت میں حسین علی خاں کی خدمت کے واسطے تھی۔

اب مرہٹوں کو اپنے محاصل وصول کرنے کی آزادی ملی اور وہ ایسے لوگ نہ تھے کہ اپنا ایک حصہ بھی چھوڑ دیتے یا رفتہ رفتہ انھیں بڑھانے میں کمی کرتے۔ وشواناتھ کی اصلی کوشش ہی یہ تھی۔ اس نے چوتھ اُس تخمینے پر تشخیص کی جو ملک کی ابتر حالت کے اعتبار سے بالکل خیالی تھا اور اس طرح یہ موقع بہم پہنچا لیا کہ جو کچھ وصول ہو وہ علی الحساب لکھا جائے اور بقایا کے معقول بہانے سے طرح طرح کے نذرانے بھی وصول کئے جاتے رہیں۔ الگ الگ اضلاع مستقل طور پر مرہٹہ سرداروں کے نامزد کر دیے گئے اور ان کے حقوق مقامی قرار دیئے گئے جس سے ان سرداروں کو شوق بڑھے کہ ان علاقوں میں عملاً اپنا تسلط قائم کریں۔ لیکن انقطاع اور آخر میں انتزاع کا میلان روکنے کی غرض سے، نیز قومی اغراض کی وحدت کا احساس پیدا کرنے کے لئے ابتدائی تشخیص مالگزاری میں طرح طرح کی باریک تقسیمیں کر دی گئیں اور مختلف عمال و عمائد کو حصہ دار بنا دیا گیا تاکہ ایک ہی علاقے میں کئی کئی رئیسوں کی غرض وابستہ اور تعلق قائم رہے۔ اسی مقصد سے، اور راجہ کے ہم قبیلہ خیر خواہوں کے خاندانی جذبات کی خاطر بعض پرگنے یا مواضع کسی دوسرے رئیس کے علاقے میں جاگیر یا انعام کے طریق پر دوسرے مقربین کو دے دیے گئے۔ اس طرح مرہٹوں کے مالی دعاوی کو برابر بڑھاتے رہنے کا انتظام بھی تھا اور ساتھ ہی اتنی پیچیدگیاں ڈال دی تھیں کہ عوام بلکہ بڑے زمیندار تک علم جہالت کے باعث

اپنے برہمن محاسبوں کے پنجے سے نہ نکل سکتے تھے اور آخر میں ان سب کے سرگروہ یعنی خود برہمن پیشوا کے روز افزوں اقتدار کے نیچے دب جاتے تھے مختصر طور پر یہ وہ طریق نظم ونسق تھا جس کی نسبت گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ مذہبی موشگافی سے قطع نظر، دنیاوی معاملات میں برہمنوں کی چالاکی کا اس سے بڑھکر مظہر کہیں نہ ہوگا۔

جس وقت بالاجی دکن کے مالیے کو اپنی قوم والوں میں بانٹ دینے کی یہ عیارانہ تجویزیں مرتب کر رہا تھا، اسی زمانے میں نواب نظام الملک نے بھی اسی متاع گراں بہا پر اپنا حق جمانے کی تیاریاں کیں۔ وہ اسی غازی الملک کا فرزند تھا جو دو مرتبہ اورنگ زیب کی شکرگزاری کا مستحق ہوا کہ ایک مرتبہ گولکنڈہ میں اور دوسری بار بیجاپور کے سامنے اسی نے شہنشاہ کے بیٹوں کو خطرناک موقعوں سے نجات دلائی بیجاپور کی بادشاہی کا خاتمہ ہوا تو نوجوان چین قلیچ خاں (نواب نظام الملک ان دنوں اسی لقب سے مشہور تھے) مرہٹوں کی جنگ میں عمدہ خدمات انجام دیتے رہے اور پھر بیجاپور کے صوبے کا والی یا فوجدار بنا دیے گئے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو خانہ جنگی ہوئی اس میں سلطان معظم دوسرے بھائیوں پر غالب آیا (۱۷۰۷ء) اور بہادر ذوالفقار خاں کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا ذوالفقار کی بجائے اس کا نائب داؤد خاں حکومت کرتا تھا اور معظم کے انتقال تک یہی صورت رہی۔ تاآنکہ معظم یا شاہ عالم اول کے انتقال پر خاندانی کشمکش نے اس شہنشاہ کے پوتے فرخ سیر[1] کو وارث تخت بنا دیا اور اس کی سرکار سے ذوالفقار کے قتل کا حکم صادر ہوا (۱۷۱۳-۱۷۱۲ء) اس کام میں عبداللہ اور حسین نامی دو سید پیش پیش تھے اور چین قلیچ خاں بھی ان کے ساتھ تھا جس کا انعام یہ ملا کہ سیدوں کے سابقہ رقیب کی بجائے دکن کا گراں بہا صوبہ چین قلیچ کے تفویض ہوا اور داؤد خاں گجرات بھیج دیا گیا۔ اسی چند روزہ کی صوبہ داری میں چین قلیچ خاں نے دکن کی پیچیدہ سیاست سے آگہی حاصل کی اور کولھاپور کے راجہ سے سازباز کی ابتدا کی جو آیندہ بھی ان کی حکمت عملی ہونے والی تھی

---

[1] فاضل مصنف نے اسے فیرک شیر (Ferokshere) لکھا ہے۔

مطلب یہ تھا کہ ساہو کے اقتدار کو کم کیا جائے۔ ستارا کے بگڑے ہوئے درباریوں کی بھی صوبہ دار دکن کے پاس آؤبھگت ہونے لگی۔ ساہو کے عمّال کو زرستانی سے روکنے کے لئے فوج روانہ کی اور شکست دیکر ان کے بعض پرگنوں پر قبضہ کرلیا۔ بارے کچھ روز بعد مصالحت کی صورت نکل آئی۔ راجہ کو جدید شہنشاہ کی کی طرف سے دس ہزار سوار کا منصب عطا ہوا اور ادھر صوبہ دار جو ہنوز ملک میں امن امان قائم کر رہا تھا، یک بیک الگ کر دیا گیا۔ نخوت پسند حسین علی نے بادشاہ کو اپنے بھائی کی تحویل میں چھوڑ کر خود دکن کی صوبہ داری لی اور چند روز بعد بالاجی سے وہ قرارداد کی جس کی کیفیت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس کے پیش رو (چین قلیچ خاں) کو ناچار مالوے میں ہٹ جانا پڑا اور اسی وقت سے اپنے سابقہ حلیفوں (یعنی سیدوں) کی طرف سے اس کے دل میں سخت گرہ پڑ گئی۔ خود شہنشاہ متلون مزاج، بزدل اور فریب کار تھا۔ اس نے ان بھائیوں سے رستگاری پانے کے لئے داؤد خاں کو ابھارا کہ حسین علی پر حملہ کرے۔ مگر لڑائی میں حسین علی غالب آیا اور اس کا حریف مارا گیا (۱۷۱۶ء) تاہم بادشاہی سازش کے خطرے سے، اور یہ سمجھکر کہ چین قلیچ خاں دشمنی پر آمادہ ہیں، وہ مرہٹوں سے دوستی کرنے پر آمادہ ہو گیا جن کے ہاتھ کئی بار شکستوں کا مزا چکھ چکا تھا اور جن سے اپنے ولی نعمت کے استیصال کی تجویز میں وہ مدد لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ بالاجی وشواناتھ اور مرہٹوں کی بہت بڑی امدادی جمعیت لیکر وہ دہلی روانہ ہوا۔ بدنصیب فرخ سیر کو معزول، مقید اور قتل کرا دیا (۱۷۱۹ء) اور چند مہینے کے اندر تین برائے نام شہنشاہ حاسد سیدوں کی سرپرستی میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ ان میں آخری محمد شاہ تھا (۱۷۱۹ء) جس کی تقدیر میں کافی طولانی اگرچہ قابلِ شرم و تاسف عہد حکومت لکھا تھا۔

اس اہم موقع پر دو یادگار واقعات یہ ہوئے کہ پیشوا نے شمالی ہندوستان سے واپس آتے میں وفات پائی۔ اس نے اپنے آقا اور عام طور سے قوم کے لئے بہت کچھ کام کیا تھا مگر اس کی جگہ لینے اور اس کے منصوبوں کو ترقی دینے کے لئے اس کا بیٹا باجی راؤ موجود تھا جو متوفی سے بھی بڑھکر ممتاز شخص گزرا ہے۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ چین قلیچ خاں جو سیدوں کی سرکاری اور ذاتی ناانصافیوں سے

پیچ وتاب کھا رہے تھے، نربدا کو اتر کر جنوب میں چلے آئے کہ جس طرح ممکن ہو دکن پر قبضہ کرکے ان سلطنت کے غاصبوں سے آخری زور آزمائی کے لئے ایک عمدہ موقع بہم پہنچائیں۔

جس عہد سے اب ہم گزرنے والے ہیں، اسے مرکزی سلطنت کے تعطل وبدامنی اور مرہٹوں کی روزافزوں طاقت نے عجیب قسم کے پیچ در پیچ واقعات سے معمور کردیا ہے۔ مگر جو لوگ اس زمانے کے عام میلانات اور مستقل نتائج سے بحث رکھنا چاہتے ہیں، وہ اس کی اکثر جزئیات کو چھوڑ دیں تو کچھ حرج نہیں بلکہ فائدے ہی میں رہیں گے۔ البتہ ان دو شخصوں کے حالات کو تسلسل سے مطالعہ کرنا لطف ودلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اس عہد کی سب سے ممتاز وباا ثر ہستیاں ہیں اور جنھوں نے ہندوستان کے دو بڑے حکمراں خاندانوں کی بنیاد ڈالی جو ان کے گزر جانے کے عرصۂ دراز بعد تک پھولتے پھلتے رہے۔ دوسرے اس تحدید سے ہمارے تاریخی مطالعے میں بھی کافی یک رنگی پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ نواب نظام الملک اور باجی راؤ تھے جن کے حالات وخصائل میں کئی اعتبار سے بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔

دونوں ایسے باپوں کے بیٹے تھے جو صحیح معنی میں نہیں تو نسبتہً نوخیز اشخاص تھے مگر انھوں نے اپنے اخلاف کے اقتدار وناموری کا راستہ تیار کردیا تھا۔ دونوں ابتدائی زندگی میں دکن کے مقامات اور پیچیدہ سیاسیات سے، نیز مرہٹہ طرز جنگ اور شہنشاہی دربار کی خرابیوں سے واقف ہوگئے تھے۔ دونوں، اگر پوری سلطنت کو نہیں، تو جنوبی صوبوں کو متنازعہ فیہ سرزمین سمجھتے تھے کہ ان کے محاصل اسی کا مال ہوں گے جو زیادہ دلیر وحریص ہو اور رقابت کے ساتھ انھیں لوٹ سکے۔ دونوں کو تربیت دی گئی تھی کہ اپنے آقاؤں کو ظاہری طور پر مقدس اور عوام کی فہمید کے لئے محترم، حصول اعزاز یا فاسد معاہدوں کی تصدیق کے لئے مفید مانیں مگر اسی کے ساتھ ہوشیار اور صاحب حزم وزیروں کے ہاتھ میں واقعتہً محض آلۂ بیجان تصور کریں۔ دونوں کو احساس تھا کہ وہ موروثی عداوتوں، سرکاری اور شخصی رقابتوں کے ہدف ہیں لہٰذا ہر حال میں احتیاط سے قدم رکھنا بالکل لازمی چیز ہے

اسی طرح اوصاف وخصائل میں، دونوں بے انتہا جاہ پسند، دوراندیش، مستقل ارادہ اور میدان جنگ میں پامردی کی صفات سے متصف تھے اور قساوت قلبی کے اُن تاریک، ترمیلانات سے خالی تھے جس سے ان کے دوسرے ممتاز معاصرین کی سیرت داغ دار ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں کی معاشرت اور مذاق سادہ تھے لیکن دونوں رسمی طمطراق اور پرشکوہ القاب وآداب کی مصلحتیں سمجھتے تھے۔ دونوں نے بہت سے نکتے اور کام کی باتیں ایک دوسرے سے حاصل کی تھیں۔ چنانچہ نظام الملک نے بارہا مرہٹوں کی چال سے خوب کام نکالا اور ہمیشہ اس امر کا خیال رکھا کہ مرہٹہ رئیسوں سے دوستانہ تعلقات قائم رہیں اور ان کے دستے اپنے لشکر کے ساتھ رہیں۔ اسی طرح باجی راؤ کی بڑی آرزو تھی کہ بادشاہی خطابات ومناصب سے بہرہ مند ہو۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوا اور خود اپنے ہم قوموں کے تعلقات درست کرنے کے سلسلے میں بہت سے مغلوں سے القاب ومراتب اختیار کر لئے۔

ان سب مشابہتوں کے باوصف، ان دونوں میں بہت بڑا فرق بھی موجود تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ برہمن اور تورانی مغل کی قومی سرشتیں گویا معکوس ہوگئی تھیں۔ یعنی باجی راؤ سیاست وملک داری کا سلیقہ رکھنے کے باوجود، نسبتۃً سیدھا، صاف گو سپاہی تھا جو ارادہ کرتے ہی، جیسا کہتا ویسا ہی عمل کرتا۔ بخلاف اس کے، نواب نظام الملک جوانی میں جس قدر شیردل اور عمل کے وقت قیامت کے تیز وتند تھے کہ اشتعال پانے کے بعد ان کا حملہ روکے نہ رک سکتا تھا، اسی قدر محتاط، نتیجہ اندیش اور وقتی تدابیر سے کام لینے کے عادی ہوگئے تھے۔ وہ مخالفوں کو نامہ وپیام کی پیچیدگیوں میں الجھانے کا اور ان کے رفیقوں میں پھوٹ ڈال کر قوت کمزور کر دینے کے بہت شائق تھے۔ یہ سبق انھوں نے یقیناً اورنگ زیب کی مثال سے سیکھے مگر جیسا کہ قاعدہ ہے آگے چل کر یہی طبیعت ثانیہ بن گئے اور جیسا کہ ہم آیندہ پڑھیں گے قطعی اور دوٹوک کارروائی کرنے میں دیر تک سوچنے اور تاخیر کرنے کی بدولت انھیں بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس ابتدائی فرق کو ان دونوں کے مختلف حالات نے اور بڑھا دیا۔ یہ اختلافِ حالات قدرتی اسباب اور آیندہ اتفاقات روزگار کا نتیجہ تھا۔ مثلاً، اگرچہ باجی راؤ کے حاسد رقیب موجود تھے

(جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا) تاہم اسے دربار ستارا میں اپنے باپ سے وہ اقتدار ورثے میں ملا تھا کہ اپنے اوصاف ذاتی کی بدولت وہ بہ آسانی اس اقتدار کو قائم و مستحکم رکھ سکتا تھا۔ بخلاف اس کے، نواب غازی الدین کی ابتدائی سرپرستی اور روشناس کرا دینے کے باوجود، نواب نظام الملک بہت سے لائق اور جاہ طلب عمائد میں سے ایک تھے۔ پس انھیں اپنے حریف باجی راؤ کی نسبت کہیں زیادہ قوت بازو سے بڑھنا پڑا اور اس شکستہ اور نامعتبر مسالے سے جو دسترس میں تھا، خود انھیں وہ عمارت تیار کرنی پڑی جو آیندہ کے یقینی اور زبردست حملوں کا خاطر خواہ مقابلہ کر سکے۔

دوسرے، ستارا کا راجہ (ساہو) نرم مزاج، اعتبار کرنے اور آسانی سے بات مان جانے والا آقا تھا۔ اس کے مقابلے میں شہنشاہ متلون مزاج، شکی ہونے کے ساتھ نہ اپنا حکم منوانے کی قابلیت رکھتا تھا نہ اس میں اپنے کسی امیر وزیر کی مستقل تائید کا مادہ تھا۔ وہ زمانہ ساز درباریوں، مبتذل مصاحبوں میں ہر وقت گرفتار رہتا اور ان کے اغوا سے ہمیشہ ان لوگوں کا اقتدار مٹانے کی خفیہ تدبیریں کرتا، جو بہت ممکن تھا کہ اس کے وفادار خادم ہوں مگر ان حالات کو دیکھ کر انھیں خواہی نخواہی اپنی ذاتی مدافعت کے لئے ہر وقت بدگمان اور چوکنا رہنا پڑتا اور وہ اینچ پینچ بلکہ بادشاہ کی مخالفت کی روش اختیار کر لیتے تھے۔ باجی راؤ کا طرز عمل سادہ، وفاداری اور ساتھ ہی ہر دلعزیزی کا تھا اپنی فتوحات وسیع کرنے وقت وہ عادتاً راجہ کا حکم مانتا اور اپنے باپ کے عاقلانہ انتظام کی بدولت پوری قوم کے فوائد کو ترقی دیتا تھا۔ ایسا کرنے میں خود اس کے اقتدار کا بڑھنا اور اس کے خاندان کی حکمرانی نہیں تو سیادت کا قائم ہو جانا قدرتی بات تھی، مگر اس غرض کے لئے اُسے روزانہ عیاریاں اور طرح طرح کی ریاکاریاں کرنی نہ پڑتی تھیں۔ آخری فرق یہ کہ نواب نظام الملک کو عموماً اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا پڑا اور بالاجی کو ایک راجپوت رئیس کی تائید اور کبھی کبھی امداد کے علاوہ رزم و بزم دونوں جگہ اپنے باو فا بھائی چمناجی آپا سے پرجوش مدد ملتی رہی۔

سیدوں سے لڑائی کا فیصلہ کرنے کے بعد نواب نظام الملک نے جو کارروائی کی، اس میں مستعدی، ہنرمندی اور کارگری کی جملہ خوبیاں موجود تھیں۔ وہ بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ نربدا سے پار ہوئے اور مرہٹوں کی ایک امدادی جمعیت سے بہت جلد خاندیس پر

قابض ہو گئے۔ مرہٹہ جمعیت میں کچھ ستارا کے ناراض سپاہی اور کچھ سنبھاجی کے رفیق شامل تھے۔ نواب نظام الملک کو دونوں طرف سے نرغے میں آجانے کا بڑا خطرہ تھا کیونکہ سید حسین کے نائب اور بھتیجے کا لشکر عظیم تو اورنگ آباد میں تھا اور مالوے سے ایک اور لشکر لیکر دلاور علی حملہ آوروں کے خلاف بڑھا۔ حریف کی شتاب کاری اور مرہٹہ طرز جنگ سے نواب نظام الملک کی واقفیت کا فائدہ یہ ہوا کہ اپنی سپاہ کے ایک حصے سے غنیم کا حملہ روک کر پھر اُسے کمین میں بڑھا لائے اور شکست دی۔ دلاور علی مارا گیا۔ اب نواب نظام الملک عالم علی کی طرف چلے جس کی سپاہ میں ساہو کی بڑی امدادی فوج موجود تھی۔ اس طرح مرہٹے اپنے خاص طریق جنگ میں ایک دوسرے سے لڑتے رہے آخر عالم علی نے بھی وہی غلطی کی جو دلاور نے کی تھی اور کامل شکست کھاکر مارا گیا۔ (۱۷۲۰ء)۔

اپنے چھائے ہوئے وزیروں کے مقابلے میں یہ کامیابی سنکر شہنشاہ نہایت خوش ہوا۔ سیدوں کو بھی معاملہ اتنا نازک نظر آیا کہ سید حسین شہنشاہ کو ساتھ لیکر خود نواب نظام الملک سے لڑنے روانہ ہوا لیکن عین روانگی کے وقت سازش کا شکار ہوا جس میں سیدوں کے کئی دشمنوں کی شرکت تھی۔ اودھ کے آیندہ نوابوں کا مورث سعادت خاں سب سے پہلے اسی سازش کی شرکت کے سلسلے میں منصۂ شہود پر آتا ہے۔ باقی ماندہ سید، عبداللہ نے جم کر مقابلہ کیا کہ اپنا اقتدار بحال رہے مگر شکست کھائی اور قید ہو گیا۔ شہنشاہ اور اہل دہلی خوشی سے پھولے نہ سمائے اور زوال پذیر مغل کی رستگاری پر جسے وہ اپنی ہمت سے حاصل نہ کر سکتا تھا، بڑی دھوم دھام سے جشن منائے گئے۔ اس انقلاب کا بالواسطہ سبب نواب نظام الملک تھے لہٰذا جہاں پناہ کی نگاہ میں بہت مقبول ہوئے۔ دوسرے مناصب کے علاوہ دکن کی صوبہ داری کی توثیق کر دی گئی اور مزید براں مالوے پر بھی انتظام رکھنے کی اجازت ملی اور وزیر سلطنت بنائے گئے۔

لیکن بادشاہ کی کمزوری اور بد انتظامی کے باعث سیاسی مطلع بہت جلد دوبارہ مکدّر ہو گیا۔ جودھپور کے راجہ اجیت سنگھ نے بغاوت کی۔ ایک وزیر اس کو مطیع کرنے بھیجا گیا مگر شہنشاہ نے اپنے طور پر راجہ کی درخواست معافی قبول کر لی اور اسے آگرے کی حکومت عطا کی جس سے دوسرے وزیر کو بھی جو اس وقت آگرے کا

حاکم تھا، سخت کبیدگی ہوئی۔ نواب نظام الملک ان دنوں دکن میں مرہٹوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں مصروف تھے۔ پہلی صوبہ داری کی طرح اس مرتبہ بھی وہ حریف راجاؤں کو لڑانا، اور کمزور کی حمایت کر کے قوی تر راجہ کے دعاوی ٹا لنے چاہتے تھے۔ مگر وشواناتھ کی حکمت عملی پہلے سے ساہو کو اپنی قوت اور فوقیت دلا چکی تھی کہ صوبہ دار کی کوشش نہ چل سکی اور وہ اس بہانے سے کہ ستارا کے حقوق بادشاہ کے مصدقہ ہیں، پسپا ہو گیا۔ امن وصلح سے دکن کی نصف مالگزاری کا دعویٰ تسلیم کرنے پر ساہو اور اس کے ساتھی مطمئن ہو گئے اور شہنشاہ کو بھی خوشی ہوئی کہ ایک طرف تو اس کے طاقتور صوبہ دار نے خود اپنے محاصل کم کر لئے اور بادشاہی احکام کی اطاعت کی عمدہ مثال پیش کی اور تیسرے جنوب میں ایسا توازنِ قوت پیدا ہو گیا جو شہنشاہی حکومت کے حق میں نہایت مفید تھا۔

اس کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ نواب نظام الملک بہ حیثیت وزیر دہلی گئے (۱۷۲۲ء) مگر محمد شاہ کے دربار میں انھیں بھی وہی اجنبیت محسوس ہوئی جو قدامت پسند اور تنگ مزاج کلے رنڈن کو چارلس ثانی کے دربار میں ہوئی تھی ان میں نہ متانت کی کمی تھی اور نہ خود پسندی کی۔ آداب مجالس میں وہ قدامت پسند تھے۔ اور دوسری طرف سیاسی معاملات میں موقع کے لحاظ سے دونوں سے کام لیتے تھے، پس اپنی متانت وسنجیدگی کی وجہ سے رنگیلے درباریوں کو جنھیں وہ جھڑک بھی دیتے تھے، ایک آنکھ نہ بھائے۔ اور نہ متلون مزاج وعیاش بادشاہ ان سے رضامند رہ سکا کیونکہ اسے وہ راہ راست پر لانا چاہتے تھے۔ غرض شہنشاہ اور مصاحبوں نے ملکر ان سے پیچھا چھڑانے کی وہ تدبیر نکالی جو اِن کی طبیعت کے عین مناسب تھی۔ گجرات کا صوبہ دار تمرد دکھا رہا تھا۔ وزیر (نظام الملک) سے سزا دلوانے کی اسے ایسی دھمکیاں دی گئیں کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور ادھر نواب نظام الملک کو اس سے خوب برافروختہ کر دیا گیا اور اسی غصے میں وہ صوبہ دار مذکور (حیدر قلی خاں) کی گوش مالی کے لئے روانہ ہوئے۔ حیدر قلی بڑا منچلا سپاہی اور اعلیٰ درجے کا لشکر رکھتا تھا لہذا امید تھی کہ طاقتور وزیر کا اگر خاتمہ نہ کر سکا تو بھی بہت دن تک الجھائے رکھے گا۔ لیکن جنگ میں وزیر کی تلوار سے بڑھکر تدبیر وں نے اسے بہت جلد مغلوب کر لیا اور اس کی فراری کے بعد گجرات کی صوبہ داری کا کام بھی وزیر نے اپنے ہاتھ میں لے لیا

چند اضلاع اپنی ذاتی جاگیر میں داخل کئے، اپنے ماموں حامد خاں کو نائب مقرر کیا اور گانگواڑے کے مورث، مرہٹہ رئیس سے اتحاد کرکے فاتحانہ دہلی کو مراجعت کی۔

اس شان سے نواب نظام الملک کا دوبارہ پائے تخت میں پہنچنا بادشاہ کو اور بھی شاق گزرا اور ان کے درمیان پہلے سے زیادہ بے لطفی پیدا ہوگئی اور آخر میں مصالحت کی یہ صورت نکلی کہ نواب نظام الملک نے دربار میں رہنے کا خیال ترک، اور وزارت سے استعفا داخل کردیا۔ اس کی بجائے صدر نائب الممالک کا پرشکوہ مگر خالی لقب عطا ہوا اور وہ اب خود مختاری کا عزم مصمم کرکے تیسری مرتبہ دکن چلے آئے (۱۷۲۴ء) بظاہر شہنشاہ کے عہدہ دار لیکن حقیقت میں اب وہ جنوب کی بادشاہی کے لئے پیشوا کے حریف ہوگئے۔

لیکن ان کی ابتدائی کشمکش مرہٹوں سے نہیں ہوئی۔ محمد شاہ کے مزاج اور عام روش کے متعلق جو کچھ اوپر بیان ہوا، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سابقہ وزیر کے رخصت ہونے سے جتنا اطمینان بھی ہوا ہو وہ ایسے طاقتور شخص کی طرف سے (جس کے ارادے چھپے ہوئے تھے اور جس سے وہ ذاتی نفرت بھی رکھتا تھا) غافل نہ رہ سکتا تھا۔ اور اس ہی پر کیا منحصر ہے، ایسے حالات میں کوئی فرماں روا بھی اپنے ماتحت کے ہاتھ میں اتنا علاقہ وسیع اور مجتمع ہوتے دیکھکر چپ نہ بیٹھ سکتا تھا۔ گجرات و مالوہ کے ساتھ دکن کے جملہ محاصل کا نواب نظام الملک کے قبضے میں آنا، سلطنت کے حصے بخرے ہوجانے کے مرادف تھا اور اس سے اقتدار جو نائب سلطنت کی عملاً ملکیت قریب قریب ایک نہائی سلطنت پر قائم ہوجاتی۔ پس ارادہ کرلیا گیا کہ ہر حصے میں الگ الگ اس کے حریف کھڑے کردیے جائیں کہ ممکن ہو تو وہ ان کے علاقے چھین لیں۔ چنانچہ ایک فرمان صادر ہوا جس سے گجرات و مالوہ کے صوبے نواب نظام الملک سے لے لئے گئے۔ حالانکہ بادشاہی حکم سے وہ مدت سے مالوے کے صوبہ دار تھے اور گجرات کو چند ہی روز قبل انھوں نے خود فتح کیا تھا۔ اور باغی صوبہ دار کے بھاگ جانے کے بعد اپنے قبضے میں لیا تھا۔ مگر اب وہاں کے لئے سربلند خاں اور مالوے کے واسطے راجہ گیردھر بہادر نامزد کئے گئے۔ دوسرا حکم خفیہ طور سے حیدرآباد کے صوبہ دار

مبارز خاں کے نام بھیجا گیا کہ دکن کے خود ساختہ والی کی مخالفت کرے اور اسے نکال دینے کی صورت میں خود اس بیش بہا ولایت کا صوبہ دار ہو جائے۔

منصوبہ تو اچھا باندھا گیا تھا کیونکہ دکن کے انتظام کی غرض سے نواب نظام الملک کی فوجیں مالوے سے چلی گئی تھیں اور راجہ گیر دھر نے چپکے سے اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔ البتہ گجرات میں دقت پیش آئی جہاں نئے صوبہ دار کے نائب شجاعت خاں کو حامد خان نے شکست دی شجاعت خاں جان سے مارا گیا اور یہی حشر سربلند کے بھائی کا ہوا جو بادشاہی اقتدار قائم کرنے شجاعت کا انتقام لینے کی غرض سے بڑھا تھا۔ ان معرکوں میں حامد خاں کو دو مرہٹہ سرداروں، پیلا جی اور کنٹھا جی سے مدد ملی۔ یہ موجودہ خاندان گائکواڑ کے اجداد میں تھے اور ان مرہٹوں کا قدم آہستہ آہستہ اس علاقے میں جمنے لگا تھا جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ستارا سے ان کی پرجوش خدمات کے صلے میں یہاں ان کو باقاعدہ عہدے دیئے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ انھوں نے پہاڑ کی ڈاکو قوموں، یعنی بھیل اور کولیوں سے خوب اتحاد کر لیا تھا۔ یہ جنگلی ڈاکو بہت زمانے بعد تک اس نواح میں اودھم مچاتے رہے اور راوٹ رم وغیرہ نے ان کو حال میں متمدن زندگی اور مفید مشاغل میں لگا کر دوبارہ آدمی بنایا ہے۔ مگر حامد خاں کو بڑی پریشانی ان دو مرہٹہ سرداروں کی باہمی رقابت سے پیش آئی۔ ان کے جھگڑوں سے مشترکہ مقصد میں خرابی پڑنے لگی سربلند خاں نے دشمن کی قوت سے گھبرا کر خندقیں وغیرہ بنانی شروع کیں، اس وقت مرہٹوں نے، فوراً حملے کی تیاری کی اور لڑائی میں سربلند خان کو شکست ہوئی لیکن مرہٹوں کا اتنا نقصان ہوا کہ پھر وہ شمشیر آزمائی پر مائل نہ ہوئے اور حامد خاں کا اقتدار رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ اس کی جد و جہد محض فریقانہ اور قزاقانہ رہ گئی اور یہ بھی برسات کے آنے پر ختم ہو گئی۔ سربلند خاں بلا شرکت صوبے کا حاکم ہو گیا اور شہنشاہی منصوبے کا یہ دوسرا جزو بھی تکمیل کو پہنچ گیا۔ مگر گجرات میں یہ وقفہ صرف عارضی تھا بحالیکہ جنگ کے اصلی موقع پر تقدیر نے بالکل دوسرا پہلو اختیار کیا۔

یہاں (یعنی دکن میں) نواب نظام الملک نے سیاست و سپہ سالاری کی پوری قوت لگا دی تھی۔ وہ حریف کے سپاہیوں میں کئی مہینے تک نا اتفاقی کے

بیچ بوتے اور خود مبارز کو صلح وآشتی کی مختلف شرطوں سے بے وقوف بناتے رہے۔ بالآخر جنگ ہوئی اور ایک خونریز معرکے میں مبارز شکست کھا کے مارا گیا۔ تب نواب نظام الملک نے بادشاہ کو نہایت عقیدت مندانہ لب ولہجہ میں تہنیت لکھ بھیجی کہ حضور کے اقبال سے ایسے شریر وخطرناک باغی کا استیصال ہوا (۱۷۲۴ء)۔ اس طرح محمد شاہ خود اپنے جال میں پھنس گیا۔ اُس نے دکن میں طوفان اٹھا کر کوشش کی تھی کہ نواب نظام الملک کو کہیں کا نہ رکھے لیکن انجام کار ان کی قوت اور بھی مضبوط ہوگئی۔ دکن کا سیاسی مطلع صاف ہوگیا اور انھیں پوری فرصت مل گئی کہ وراز دست اور مخدوش مرہٹوں سے اپنے تعلقات درست کریں۔ ان کے حالات اور خصائل سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ بہت سے مرہٹہ سرگروہوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اپنی قابلیت سے زیادہ ان کی باہمی رقابت وحسد پر بھروسہ تھا جو ان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان ابتدائی منصوبوں میں اس لئے اور بھی سہولت ہوگئی کہ نوجوان پیشوا اپنے اور اپنی قوم کے دلیرانہ جاہ طلبی کے حوصلے پورے کرنے کی غرض سے ان دنوں شمال میں گیا ہوا تھا۔ دربار ستارا میں سری پت راؤ نامی شمالی ہند کا ایک برہمن باجی راؤ کا خاص رقیب تھا اور جیسا کہ معلوم ہے خود پیشوا کوکنی برہمن تھا۔ سری پت شدومد سے اس روش کی وکالت کرتا تھا کہ راجہ ساہو کی قوت کو مہاراشٹر میں مضبوط کیا جائے۔ کولھاپور کے مدعی راجہ کا قلع قمع اور کرناٹک کے میدان کو واپس لیا جائے جس پر سیواجی آخر زمانے میں قابض ہوا اور اب وہ کچھ تو مغلوں کے تصرف میں تھا اور کچھ سیواجی کے بھائی کے خاندان میں بٹا ہوا تھا بخلاف اس کے باجی راؤ خوب جانتا تھا کہ مرہٹوں کی فوج کے لئے امن واطمینان کی حالت سازگار نہیں ہوسکتی اور یہ کہ مرہٹہ قوم کی اصلی خوشی اسی میں ہے کہ نئے نئے علاقوں میں نفوذ کیا جائے اور سلطنت کے ان صوبوں سے نذرانے وصول کئے جائیں جہاں اب تک مرہٹوں کے قدم نہ پہنچے تھے یہی ان تاختوں کے کامیاب سرگروہ کے اقتدار بڑھانے کی بہترین شکل تھی۔ نظر براں وہ مسلسل دور دور کی معرکہ آرائی میں مصروف رہنے کا حامی تھا تاکہ برائے نام راجہ کی حکومت کا دائرہ وسیع ہو۔ حکومت کا خزانہ نئے نئے صوبوں کے باقاعدہ خراج سے معمور رہے۔ فوج والے برابر ہشاش بشاش اور وطن میں سب مطمئن اور خوش رہیں

اور اپنے سابقہ ستانے والوں سے انتقام کا منصوبۂ عظیم بھی پورا ہوتا رہے یہاں تک کہ پوری سلطنت کا خون کھینچ لیا جائے اور وہ انھی لٹیرے سواروں کے سامنے بے دست و پا پڑی رہ جائے جن کے استیصال میں ایک زمانے تک کوشش کرتی رہی تھی۔ ایک فصیح و بلیغ تقریر کے آخر میں اس نے اپنے آقا سے التجا کی کہ "اب ہمیں موقع ملا ہے کہ اپنے ملک سے اغیار کو نکال باہر کریں اور شہرت جاوید حاصل کرلیں۔ ہندوستان کا رُخ کرنے سے آپ کے عہد میں مرہٹوں کا جھنڈا کرشنا سے اٹک ندی تک لہرانے لگے گا۔" راجہ نے جوش میں آکر کہا "بے شک تم لائق باپ کے سپوت ہو، تم ہمارے جھنڈے کو ہمالیہ پربت پر لے جاکے گاڑو گے۔" (گرانٹ ڈف)

اس طرح باجی راؤ کی رائے بزم شوریٰ میں غالب آئی۔ میدان رزم میں اُس نے جو کچھ کیا وہ آگے بیان ہوگا۔ سردست اس کے چلے جانے سے نواب نظام الملک کو جو موقع کی تاک میں تھے اپنی تدابیر کو عمل میں لانے کا موقع مل گیا۔ اِن کی پہلی تدابیر نہایت اہم تھی جو کم سے کم فی الوقت پوری طرح کامیاب ہوئی۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں وہ دکن کے آدھے محاصل پر مرہٹوں کا حق مجبوراً تسلیم کرچکے تھے اور ان دعاوی کی شہنشاہ نے بھی توثیق کردی تھی۔ لہٰذا ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اپنے مجوزہ پائے تخت حیدرآباد کے گرد کے اضلاع سے ان مرہٹہ حقوق کو منتقل کرائیں۔ اور اس طرح مرہٹوں کی آئے دن کی ہیرا پھیری سے نجات پاکر اپنی آیندہ مملکت کا ایک محفوظ و آزاد مرکز بنالیں۔ چنانچہ راجہ اور سری پت دونوں کو معاوضے میں دوسرے مواضع دے کر یہ بات حسب دلخواہ طے کرالی۔ پیشوا نے واپس آکر اس قرارداد کو غلط ٹھیرایا لیکن ابھی ستارا میں اِس پر تیز و تلخ مباحثے ہی ہو رہے تھے کہ باجی راؤ کو خبر ملی کہ نواب نظام الملک نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس طرح اپنی تازہ کامیابی اور مرہٹوں میں اندرونی نفاق و شقاق اور کولھاپور سے دیرینہ عداوت سے جرأت پاکر، نواب نظام الملک نے خراج دینا بالکل بند کردیا[1]۔

---

[1] شری پت راؤ پرتی ندھی (سپہ سالار) نے نواب نظام الملک آصفجاہ اول کو باور کرایا کہ پیشوا باجی راؤ نے ریاست ستارا کے دروبست پر پورا قابو پالیا ہے اور اگر اس کے زور کو کم نہ کیا گیا تو راجہ ساہو اس کے ہاتھ میں

ستارا کے راجہ کے محصلوں کو برطرف کرکے بہ حیثیت صوبہ دار دکن راجائی کا جھگڑا طے کرنے کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ کٹھ پتلی بن جائے گا۔ نواب نظام الملک کو اس کا علم تھا کہ پیشوا کی ہوس جاہ و ملک گیری دکن میں تلاطم پیدا کر دے گی اگر اس کی قوت کو نہ توڑا گیا۔ امیر الامراء حسین علی خاں کی صوبہ داری کے زمانے میں صوبہ جات دکن میں مرہٹوں کو چوتھ اور سر دیش مکھی وصول کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا جب سے نواب نظام الملک نے دکن کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی وہ اس فکر میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح مرہٹوں کے چوتھ اور سر دیش مکھی وصول کرنے والے عمال کو بے دخل کریں۔ شری پت راؤ سے انھوں نے یہ سمجھوتہ کر لیا تھا کہ دربار ستارا میں پیشوا باجی راؤ کے اثر و رسوخ کو کم کر کے اول الذکر کو وہاں کے در و بست کا مختار بنایا جائے۔ اس کے صلہ میں شری پت راؤ دکن میں چوتھ اور سر دیش مکھی کے حقوق سے دست بردار ہو جائے گا اور اس طرح دربار ستارا اور ریاست حیدر آباد امن پسند ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں گے لیکن پیشوا باجی راؤ نے راجہ ساہو پر اپنا ایسا شخصی اثر قائم کر لیا تھا کہ جو وہ کہتا تھا وہی راجہ کرتا تھا۔ کولھا پور کے راجہ سمبھا جی سے بھی نواب نظام الملک کی خط و کتابت رہتی تھی اس واسطے کہ وہ بھی پیشوا باجی راؤ کی حکمت عملی سے خائف رہتا تھا۔

یہ کہنا کہ نواب نظام الملک نے مرہٹوں میں نفاق پیدا کیا سراسر غلط ہے۔ ان میں نفاق پہلے سے موجود تھا۔ نواب نظام الملک کے تدبر کا اقتضا یہی تھا کہ وہ اس نفاق سے فائدہ اٹھائیں اور اس طرح مرہٹوں کو ریاست حیدر آباد میں چوتھ اور سر دیش مکھی وصول کرنے کے حق سے محروم کریں جو انھوں نے سلطنت مغلیہ کی کمزوری اور امیر الامراء حسین علی خاں کی بے تدبیری اور بے عملی کی بدولت حاصل کر لیا تھا۔ جب نواب نظام الملک نے ریاست حیدر آباد کے در و بست کی تنظیم شروع کی تو انھیں مرہٹہ عمال سے سابقہ پڑا جو ہر ضلع میں موجود تھے۔ ملکی آمدنی میں سے سب سے پہلے چوتھ اور سر دیش مکھی کی مطلوبہ رقوم وضع کی جاتی تھیں اس کے بعد جو کچھ بچتا تھا وہ صوبہ دار کو انتظام ملکی کے لئے ملتا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں ملک میں ابتری اور بد نظمی پھیلی ہوئی تھی۔ مرہٹہ عمال کو ملک کے انتظام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ صرف اپنی رقوم وصول کرتے اور نظم و نسق کی ساری ذمہ داری صوبہ دار کے سر پڑتی۔ نواب نظام الملک نے ۱۳۲۴ھ کی جنگ شکر کھیڑا کے بعد اپنی تمام تر توجہ نظم و نسق کو درست کرنے کی طرف منعطف کر دی۔ ممدوح نے اپنی خوش تدبیری اور حوصلہ مندی سے آہستہ آہستہ چند سال کے اندر دکن کو چوتھ اور سر دیش مکھی وصول کرنے والے عمال سے پاک کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو

بہا نے ایک بالادست کا لب و لہجہ اختیار کیا۔ ساہو جو عام طور سے نرم مزاج تھا، اپنی ساری مالگزاری کا اس طرح روکا جانا اور نیز اپنی راجائی کا معرض بحث میں آنا سنکر غصے میں جامے سے باہر ہوگیا اور مقابلے میں قومی لشکر کو لے کر خود جانا چاہتا تھا جس سے بہ مشکل لوگوں نے اسے باز رکھا اور بالآخر پیشواہی کو سپہ سالاری تفویض ہوگئی۔ اور اس کے اثر اور اوصاف نے ملک کی پوری قوت اپنے گرد جمع کرلی۔ اس طرح ضمناً آیندہ معرکہ آرائی مرہٹہ قوم کی فرمان روائی کو عملاً اس کے ہاتھ میں منتقل کر دینے کا بھی ایک بڑا سبب بن گئی۔

نواب نظام الملک نے اپنی دلپسند روش کو اب بھی ہاتھ سے نہ دیا اور جنگ کا آغاز کرنے سے قبل خط کتابت سے کام لینا چاہا جس میں یہ ظاہر کیا کہ جو کچھ کیا گیا ہے وہ خود ساہو کی دوستی ہے کہ اسے پیشوا اور اس کے گرگوں کی چیرہ دستی سے نجات دلائی جائے۔ جو لوگ برطرف کئے گئے ہیں ان کی بجائے ایسے لوگوں کو مقرر کرنا مقصود ہے جو راجہ کے زیادہ مطیع و وفادار ہوں۔ مگر یہاں کی حکمت عملی نے خطا کھائی۔ ان کی دشمنی یقینی اور غضب آوری تھی اور عذر قابل پذیرائی نہ تھا بلکہ اس سے ان اصلی واقعات کا اور بھی اظہار و وضاحت ہوگئی جو بجائے خود ناگوار و مخدوش نوعیت رکھتے تھے کوئی اور موقع ہوتا تو ممکن ہے کہ راجہ کو اپنے طاقتور وزیر (پیشوا) سے بدظنی پیدا ہو جاتی لیکن اس وقت تو اس کے غیظ و غضب کا رخ دوسری طرف پھر چکا تھا۔ دوسرے باجی راؤ کی چاپلوسی اور تملق کے برتاؤ نے اپنا کام کیا اور بدلہ لینے کے واسطے جو لشکر روانہ ہوا، اس کی قیادت پیشواہی کو دے دی گئی۔

برسات کا موسم دونوں طرف سرگرم تیاریوں میں گزرا۔ صاف موسم کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ ریاست حیدرآباد میں بھی ان علاقوں کی طرح ابتری اور بدنظمی قائم رہتی جہاں مرہٹہ گردی کی روک کے لئے کوئی قوت مقابلے پر نہ آسکتی تھی۔ نواب نظام الملک نے فوجی حملوں اور حکمت عملی کے ذریعے اپنے اس مقصد کو حاصل کیا۔ سنتری پت راؤ پرتی ندھی اور راجہ سمبھاجی والی کولھاپور سے نواب نظام الملک نے اس لئے تعلقات قائم کئے کہ یہ دونوں پیشوا باجی راؤ کے مخالف تھے جو ریاست حیدرآباد سے چوتھ اور سردیش مکھی کی رقوم وصول کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نواب نظام الملک کے عزم و تدبیر کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور بالآخر حیدرآباد کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے گجرات، مالوہ اور وسط ہند کے دوسرے علاقوں کو اپنا مشق ستم بنایا۔

آتے ہی پہلی ضرب پیشوا نے لگائی نواب نظام الملک کے ہراول کا تھوڑی دیر حملہ روکا، پھر یکایک پلٹ گیا کہ دشمن کو حیران اور اورنگ آباد کا رُخ کرے۔ افواہ مشہور کر دی کہ برہان پور کو برباد کرنا چاہتا ہوں اور اس طرح حریف کو اس شہر کی حفاظت کے واسطے شمال کی طرف بڑھا لیا۔ لشکر کا ایک حصّہ سامنے چھوڑ کر اصلی جمعیت سے ایک دم گجرات دوڑ گیا اور اس صوبے کو لوٹا۔ لوگوں میں سخت کھلبلی پڑ گئی اور اسی میں یہ شبہہ پیدا ہوا۔ کہ شاید وہ اپنا پیچھا کرنے والے سے خفیہ ساز باز رکھتا ہے۔ ادھر نواب نظام الملک نے اس گریز پا دشمن کا پیچھا کرنا فضول سمجھکر جنوب کا رُخ کیا اور پُونا پر حملہ کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا لیکن پیشوا اپنا علاقہ بچانے کے لئے دوڑا آیا اور واپسی میں بھی ہر جانب تاراجی اور تباہی پھیلا دی۔ نواب نظام الملک کو اپنے مرہٹہ حلیفوں پر بہت بھروسہ تھا مگر ان کی باہمی بدظنی اور نااتفاقی سے معرکہ آرائی میں رُکاوٹ پیدا ہوئی اور خلاف توقع انھیں کثیر نقصان اٹھانا پڑا۔ بے شبہہ ان کا توپ خانہ اچھا کام دیتا رہا لیکن یہ بچاؤ عارضی تھا اور تھوڑے ہی دن میں ان کا لشکر ناہموار سرزمین میں جہاں پانی میسّر نہ تھا، ہر طرف سے گھر گیا لیکن وہ جس طرح ہوا آگے بڑھتے رہے اور بالآخر ایک بہتر جگہ پہنچ گئے تھے مگر یہاں دوبارہ گھر گئے۔ اور جو دعاوی رد کر دیے گئے تھے، انھیں دوبارہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنے کولھاپور کے حلیف سمبھاجی کا ساتھ چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا لیکن خراج کی تمام واصلات ادا کرنے اور آیندہ ادائی کی کفالت میں چند مستحکم مقامات حوالے کرنے کا عہد کیا۔ (۱۷۲۹ء)

ان یادگار حریفوں کا پہلا مقابلہ اس طرح ختم ہوا۔ جنگ کے بعد پہلی مرتبہ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اور وہ ایک دوسرے کے سامنے آئے اور رسمی تحائف لئے دیے گئے۔ تھوڑے دن بعد باجی راؤ نے گجرات کے مغل صوبہ دار سے جو مفید مطلب قول قرار کئے ان سے بھی اس کا اثر بڑھا اور آیندہ شاندار ترقی کی توقعات کو قوت پہنچی اس قرارداد کا ذکر ہم صراحت سے آگے کریں گے۔

مگر نواب نظام الملک اسے جاہ و اقتدار کے منصوبے پکانے کی مہلت دینے والے آدمی نہ تھے۔ ایک ممتاز مرہٹہ رئیس ترمبک راؤ دھبڑے، گجرات کے معرکوں میں شریک تھا۔ وہاں کے بادشاہی صوبہ دار سے پیشوا نے جو شرطیں کیں ان میں دھبڑے کو

خیال ہوا کہ اس کی حق تلفی کی گئی ہے پس نواب نظام الملک سے دوستانہ اتحاد کر کے اس نے بہت سے سرداروں کو گرد جمع کیا اور ۳۵ ہزار سپاہ کے ساتھ دکن آنے پر تیار ہوا لشکر کشی کا مقصد علانیہ یہ تھا کہ راجہ کو باجی راؤ اور برہمنوں کے پنجے سے نکالا جائے۔ قرار پایا تھا کہ نظام دکن اپنے قرب وجوار کے علاقوں میں اس لشکر سے اتحاد عمل کریں گے۔ پیشوا کو حسب معمول بہت جلد اور صحیح اطلاع مل گئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ ایسے مخدوش حریفوں کے مل جانے سے قبل، خود جارحانہ کارروائی کرے۔ ترمبک کی سپاہ تعداد میں دگنی تھی مگر پیشوا کے ہمرکاب پائگاہ کے چیدہ دستے اور بہت اچھے سپاہی موجود تھے۔ وہ پھر گجرات چلا کہ "شیر سے اسی کی کچھار میں جاکر مقابلہ کرے" لیکن نواب نظام الملک کی تقلید میں پہلے نامہ وپیام شروع کیے۔ نربدا کے قریب اس کے ہراول پر حملہ ہوا اور اُس نے شکست کھائی۔ مگر وہ اس زک سے بددل نہ ہوا اور یہ سمجھ کر کہ اس کی تلافی دلیرانہ حملہ کرنے ہی سے ہو سکتی ہے اس نے یکایک دشمن کے پورے لشکر پر تیز وتند یورش کی۔ سپاہیوں کی کمی تعداد کی اعلیٰ قابلیت نے تلافی کر دی اور دشمن کا ایک حصہ بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن ترمبک تہیہ کر چکا تھا کہ یا میدان جیتے گا یا مر کر ہٹے گا۔ اس نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیریں ڈلوا دیں کہ سپاہی اپنے سردار کا استقلال دیکھ کر ہمت نہ ہارنے پائیں ادھر باجی راؤ گھوڑے پر سوار بہادری اور نگرانی میں حریف سے کم نہ تھا سخت لڑائی ہوتی رہی لیکن ایک اتفاقی نشانے سے ترمبک مارا گیا (۱۷۳۱ء) اور اس کے گرتے ہی نہ صرف یہ میدان پیشوا کے ہاتھ رہا بلکہ سوائے نام کے پوری مرہٹہ حکومت بھی قبضے میں آگئی" (ڈف)

باب ہشتم

سلطنت کی آخری گھڑیاں

(۰)

یاد ہوگا کہ شہنشاہ نے نواب نظام الملک کی روز افزوں اور خطرناک قوت کم کرنے کی غرض سے سربلند خاں کو گجرات اور راجہ گردھر کو مالوے کا صوبہ دار نامزد کر دیا تھا کہ نواب نظام الملک ان علاقوں سے نکال دیئے جائیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے صوبے پر فی الوقت قابض ہو گئے تھے لیکن نواب نظام الملک کے اخراج سے مرہٹوں کی دراز دستی میں آسانی ہو گئی جو اس سے کم خطرناک نہ تھے اور ان ملکوں میں جراثیم کی طرح پھیل جانے کی تاک لگائے بیٹھے تھے جن تک پہلے یورش کر چکے تھے۔ خصوصاً گجرات میں تو گائکواڑ کے پہلے ہی قدم جم گئے اور جنگلی بھیل اور کولی قوموں سے تقویت پہنچ گئی تھی۔ یہ قومیں غیر آباد اقطاع میں آباد اور آس پاس کی مامون آبادیوں پر ڈاکے ڈالتی رہتی تھیں۔ مرہٹوں کی پیہم تکلیف دہ غارتگری کا نتیجہ یہ ہوا کہ سربلند خاں جسے اصرار و تقاضے کے باوجود دربار شاہی سے کوئی مدد نہ بھیجی گئی تھی، خاص خاص مراعات کرنے پر مجبور ہو گیا۔ انھی مراعات کا ہونا مرہٹوں کی سلطنت میں مزید مداخلت کرنے کی

ابتدا سے (۱۷۲۹ء) کیونکہ حقیقت میں یہ اصطلاحی چوتھ اور سردیش مکھی، مالگزاری اور محصول راہ داری کے ۳۵ فیصدی کے قریب ہو جاتی تھی۔ شرمندگی مٹانے کی غرض سے اس نے ان فیاضانہ عطیات کو ان شرائط سے مشروط کر دیا کہ مرہٹے "رفاہ عام اور اضافۂ آبادی اور دکن کی عام امن و بہبود کی کوشش کرتے رہیں گے"۔ چوتھ کی منظوری کے ساتھ یہ عجیب شرطیں بھی عائد کی گئی تھیں کہ ڈھائی ہزار گھوڑے ہر وقت ہتھیار کھے جائیں گے (وراجہ ستارا کی طرف سے؟) جتنی مالگزاری فی الواقع وصول ہوتی اس کی چوتھائی رقم ادا کی جائے گی۔ ہر ضلع میں مرہٹے صرف دو یا تین محصل مقرر کر سکیں گے اور رعایا سے کوئی مزید مطالبہ نہ کیا جائے گا اور شاہی حکومت کے قیام و دوام میں ہر قسم کی مدد دی جائے گی۔ (گرانٹ ڈف) لیکن مستقبل قریب میں سب سے بڑھ کر جس دفعہ سے ہمیں تعلق ہے وہ یہ تھی کہ راجہ کی طرف سے باجی راؤ پر لازم ہوگا کہ صوبے کے سرکش زمینداروں اور دوسرے مفسدوں کو کسی قسم کی مدد نہ دے"۔ یہ شرط گائکواڑ کی اغراض کے خلاف تھی کیونکہ اس کے حلیف بھیل اور کولی غارتگری کر کے ہی اپنی بسر اوقات کرتے تھے۔ خود گائکواڑ ان دنوں ترمبک راؤ دھبھاڑے کا گماشتہ تھا۔ اس قول و قرار سے پیشوا کو باوجود دھبھاڑے اور اس کے رفیقوں کے مقابلے میں محافظ امن کا رتبۂ عالی مل گیا جس دھبھاڑے کی آتش حسد مشتعل ہوئی اور وہ نواب نظام الملک سے مل کر ایک مہم پونا لے چلا جس کی غرض یہ تھی کہ ساہو کی ریاست کے فوجی اور دیوانی معاملات میں پیشوا کو حصہ لینے سے محروم کر دیا جائے۔ مگر مہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ باجی راؤ کی مستعدی اور دلیری نے ترمبک اور اس کے بہت سے طاقتور ساتھیوں کا قلع قمع کر دیا۔

تغیر حالات سے پیشوا کی توجہ بھی اول ادھر منعطف ہوئی کہ پچھلی خانہ جنگی کے ناگوار اثرات کو جہاں تک ہو سکے زائل کیا جائے۔ ترمبک جن لوگوں کے ساتھ سلوک کرتا رہتا تھا اسی سلسلے میں پیشوا نے بہت کچھ اور عطائیہ داد و دہش کی۔ ترمبک کے بیٹے کو باپ کی جگہ سیناپتی مقرر کیا۔ دوسرے سردار جو لڑائی سے بچ رہے تھے انہیں معافی اور مناسب خدمات دی گئیں۔ اس طرح سے کم فی الوقت مرہٹوں کے اندر تفرقہ پڑ جانے کا خطرہ دور ہو گیا۔

ادھر شہنشاہ نے سربلند خان کو وقت پر مدد دینے کے لئے تو انگلی بھی

نہ ہلائی تھی، لیکن اس صوبہ دار نے مجبوراً جو مراعات کی تھیں، ان کی توثیق کرنے سے انکار کردیا۔ اور سربلند کی بجائے جودھپور کے راجہ ابھے سنگھ کو صوبہ دار مقرر کیا۔ سربلند کے ساتھ اس قسم کا اہانت آمیز برتاؤ پہلے بھی ہو چکا تھا، پس نواب نظام الملک جو ہر موقع سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے تھے، اس برتاؤ پر بظاہر بہت خفا ہوئے حالانکہ ابتدا میں سربلند خاں خود انھی سے گجرات چھیننے کے لئے وہاں آیا تھا۔ مگر اس وقت سربلند کی حمایت میں ایک امکان یہ بھی نظر آتا تھا کہ وہ پیشوا کی بڑھتی ہوئی قوت روکنے میں نواب نظام الملک کے ساتھ ہو جائے گا۔ دوسرے دربار شاہی سے جو راجپوت راجہ اس کی جگہ مقرر ہوا، اس کی نسبت شبہہ تھا کہ وہ باجی راؤ کا دوست ہے اور اس سے درپردہ ملا ہوا ہے۔

اس جگہ گجرات کے تفصیلی حالات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور میں اس اجمالی کیفیت پر قناعت کرتا ہوں کہ وہاں کے صدر مقام میں تو بادشاہی حکومت سسکتی رہی، ورنہ باقی پورے صوبے پر مرہٹے اور ان کے جنگلی حلیف قابض اور خود مختار ہو گئے اور یہ حالت اس وقت تک رہی جب کہ انگلستان کے تسلط کے مبارک ایام آئے اور انگریزوں نے اس خطے میں امن و انتظام قائم کیا۔ گائکواڑ کی دوستدار اور ماتحت ریاست کو برقرار رکھا اور بالآخر پہاڑ کی ان جنگلی قوموں کو بھی آدمی بنایا جنھیں مطیع کرنے میں مسلمان کبھی کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

مالوے میں راجہ گیردھر کی فتح بھی چند روزہ ثابت ہوئی۔ وہاں پیشوا کے تین نائب، ہلکر، سندھیا اور پوار محصول وصول کرنے لگے۔ گیردھر کو انھوں نے قتل کر دیا اور اس کے کسی عزیز نے جانشینی اور انتقام کا ارادہ کیا تو اس پر بھی یہی گزری۔ بادشاہ کی طرف سے نیا صوبہ دار بھیجا گیا۔ لیکن باجی راؤ نواب نظام الملک سے مصالحت کرنے کے بعد اب خود قیادت کر رہا تھا۔ اس نے نئے صوبہ دار کو ایک قلعے میں محصور کر کے باقی علاقہ بادشاہی افواج سے خالی کرا لیا۔ دربار شاہی کا کام ہی ان دنوں کاموں میں مداخلت اور خرابی ڈالنا ہو گیا تھا۔ وہاں سے صوبہ دار کی ناکامیوں کی سزا دینے کی غرض سے دوسرا صوبہ دار جے سنگھ نامزد ہوا جو باجی راؤ کا حلیف تھا۔ ذاتی دوستی اور سرکاری فرائض میں کچھ روز تک کشاکش ہوئی اور آخر کار اس نے

حکومت چپکے سے پیشوا کے حوالے کر دی (۱۷۳۴ء) اور شہنشاہ کو بھی اس وقت مصلحت اسی میں نظر آئی کہ اس انتقال ملک پر خاموش ہو رہے۔ مالوے کی ان لڑائیوں کے سلسلے میں مرہٹے بندھیل کھنڈ میں بھی بڑھ آئے تھے۔ یہاں کے ایک راجپوت راجہ کی پیشوا نے دستگیری کی۔ اس نے پیشوا کو بیٹا بنا لیا اور تھوڑے دن بعد وفات پائی تو دو تہائی دو صلبی بیٹوں میں اور ایک تہائی ریاست پیشوا کے ورثے میں آئی۔ اس سے مرہٹوں کی حدود مملکت ہندوستان کے وسط تک وسیع ہو گئیں۔

ضعیف و پراگندہ حال، لڑکھڑاتی ہوئی سلطنت کا خاتمہ بھی اب قریب نظر آتا تھا۔ وشوا ناتھ کے سن چلے بیٹے نے ابتدا ہی میں اپنا نظام عمل بیان کر دیا تھا اس کے مطابق کام کرنے پر وہ بھی تیار ہو گیا۔ وہ جوش میں آ کے چلایا کہ "آؤ اس مرجھاتے درخت کے تنے پر ضرب لگائیں۔ ٹہنے اپنے آپ گر جائیں گے۔" (اڑف) اس معرکہ آرا قسمت آزمائی کے لئے اس نے بہت خوبی سے منصوبہ مرتب کیا اور عملی تیاریاں کیں چند سال پہلے، کولھا پور کے راجہ سے صلح کر لی گئی تھی۔ نواب نظام الملک رضامند ہو گئے تھے کہ مرہٹوں کو شمال میں ہوس نکالنے کی پوری آزادی دے دی جائے بشرطیکہ ان کی مقامی خودمختاری میں کوئی رخنہ نہ ڈالا جائے۔ چنانچہ اسی خودمختار ریاست کی تنظیم میں وہ پوری توجہ سے منہمک تھے۔ پیشوا نے مغربی ساحل پر اپنے آقا کے دشمنوں کو، جنگ آرائی کے دوران میں مہلت پاتے ہی سرنگوں کر دیا تھا۔ گجرات، مالوہ اور بندھیل کھنڈ بادشاہی افواج سے قریب قریب بالکل خالی کرائے گئے تھے اور بہت کچھ انھی کے محاصل سے باجی راؤ کے لاؤ لشکر کا خرچ چلتا تھا۔ اجمیر و بندھیل کھنڈ دونوں (خطوں) کے راجپوت دوستی پر مائل تھے اور میوار کے قبضے سے مرہٹہ حلقۂ اقتدار کی ایک تازہ چوکی قائم ہو گئی تھی۔ یہ بھو نسلے خاندان کے ایک سردار کا کارنامہ تھا جو ناگپور کی ریاست کا بانی ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ آگے چل کر یہ رئیس پیشوا کی ہوس جاہ کا مخالف ثابت ہوا لیکن یہ بات مغلوں کے خلاف اشتراک عمل کرنے سے کسی طرح مانع نہ تھی۔ بلکہ ایسا اشتراک قدرتی تھا۔ سندھیا اور ہلکر بہت پرجوش اور کارآمد آلۂ کار اور اپنے ترقی مربی کی اغراض سے پوری طرح وابستہ تھے۔ بحیثیت مجموعی طور پر باجی راؤ محسوس کرتا تھا کہ

اب خود شہنشاہ سے قوت آزمائی کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس کی ابتدا ملکر کے صوبہ آگرہ پر تاخت کرنے سے ہوئی (۱۷۳۶ء) اس نے وزیر خان دوراں کو فوراً پریشان کر دیا مگر عملی کارروائی کرنے کی بجائے، وہ بڑی شان و شوکت کا لشکر تیار کرنے میں مصروف ہو گیا، جس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ نواب نظام الملک سے مدد کی درخواست کی گئی تھی، وہ بھی بے سود رہی۔ ملکر نذرانے وصول کرتے کراتے صرف تھوڑی دیر کے لئے بادشاہی لشکر کی شاندار مگر بے کار لشکر گاہ میں چند ہوائیاں پھینک کر اپنے گریز پا سواروں سے انھیں کاٹ گیا۔ پیشوا نے اپنے لشکر میں واپس آتے ہی شہنشاہ سے تقاضا شروع کیا کہ سرکاری طور پر گجرات و مالوہ کا محاصل مرہٹوں کے نام لکھ دیا جائے جن کو واقعات پہلے ہی مرہٹوں کے تفویض کر چکے تھے۔ دربار میں ایک گروہ ہر قسم کی مراعات کے خلاف تھا مگر محمد شاہ اور وزیر فیاضانہ مصالحت پر مائل تھے چنانچہ اندر ہی اندر دستاویزیں تیار کی جانے لگیں پیشوا کے وکیل کو یہ ہم راز معلوم ہو گیا اور اس پر پیشوا اور بھی اتر گیا اور اپنے مطالبات بڑھا دیئے۔ ان سے انکار کیا گیا لیکن آخر کار ایک عطیہ نواب نظام الملک کے علاقے سے، اور دیا گیا جس کا منشا یہ تو تھا ہی کہ پیشوا کو کچھ دے کے ٹالا جائے لیکن اس کے علاوہ نواب نظام الملک کو منظلوم بادشاہی کی مدد پر ابھارنا بھی منظور تھا اور یہ منصب کچھ مدت سے وزیر سلطنت ان کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوسرے مقصد میں، جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے، کامیابی ہو گئی مگر پہلا مقصد بالکل ناکام رہا۔ باجی راؤ نامہ و پیام ہونے کے باعث نہیں رکا۔ نہ دہلی کے قریب ایک شاندار و کثیر لشکر کی فراہمی سنکر باز رہا بلکہ بلا رحم و رعایت بڑھتا چلا آیا۔ ایسے ملک سے جواب تک مرہٹوں کی یورشوں سے بالکل محفوظ رہا تھا، نذرانے وصول کئے اور آگرے کے قریب پہنچ کر اپنے چند سرداروں کو دوآب کی غارتگری کے لئے روانہ کیا۔ مگر سعادت خاں کے اودھ سے اقدام نے ان کا سدباب کر دیا۔ اس زک کی مبالغہ آمیز خبریں دہلی اور نواح میں گشت کرنے لگیں تو پیشوا نے خود اپنے قول کے مطابق ارادہ کر لیا کہ اپنے ہندوستان میں موجود ہونے کا ثبوت دے اور شہنشاہ کو پائے تخت کے دروازے آگ کے شعلے اور مرہٹوں کی صورت دکھا دے۔" (ڈف)

چنانچہ وہ سرعت سے دہلی کی طرف چلا اور مضافات میں خیمے گاڑ دیے

عام غارتگری سے پرہیز کیا لیکن وہ ایک سبق آموز نمونے دکھا دیے کہ وہ کیسا بے انتہا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ (۱۷۳۷ء) پھر اطمینان سے شہنشاہ اور اس کے ایک راجپوت امیر سے خط کتابت شروع کی جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کچھ مدت بعد ازرہ اخلاق یہ کہہ کر کہ ممکن ہے میرے سپاہیوں سے شہر کو ضرر پہنچے، وہ اور دُور ہٹ گیا۔ اس پسپائی سے بادشاہی فوجوں کو ہمت ہوئی اور وہ اب پہلی مرتبہ سامنا کرنے آئے مگر بہت جلد مار کر ہٹا دئے گئے اور کچھ نقصان کے ساتھ پریشان ہوکر بھاگے۔ پھر پیشوا بھی ہٹ گیا اور باضابطہ صوبۂ مالوہ کی سند، اور تیرہ لاکھ روپیہ لیکر دکن واپس گیا۔ اس کامیابی سے جو اُس کی قوم کی تاریخ میں بے نظیر تھی، وہ پھول گیا تھا مگر اس اندیشے سے خالی نہ تھا کہ دیکھئے کہ نواب نظام الملک کیا روش اختیار کرتے ہیں۔ یہ اندیشہ بے بنیاد نہ تھا۔ کمزور بادشاہ کو ہر چند اپنے سب سے طاقتور ماتحت سے ہمیشہ سخت نفرت رہی اور وہ اسے ختماً رخصت کر چکا، اور اس کے ہاتھ سے آخری دفعہ ذلیل بھی ہوا تھا، تاہم اب اسی کی طرف پھر آیا اور مصیبت کے وقت اسی شخص سے مدد کی التجا کی جس کے ساتھ پہلے دغا اور دشمنی کر چکا تھا۔ ادھر نواب نظام الملک کو احساس ہوا کہ ملکی توازن کو درست کرنے کی ضرورت ہے اور ایک نودولت ہندو کو پوری سلطنت پر چھا جانے سے جس طرح ممکن ہو، روکنا چاہیئے۔ اس طرح ان دونوں حریفوں کا عہد و پیمان دوستی ختم ہوا اور دونوں تل گئے کہ اپنی قوت اور سلطنت کی قسمت کی آخری آزمائش کریں۔ نواب نظام الملک کی سپاہ، جس میں محمد شاہ کے باقی ماندہ راجپوت رفیق بھی شامل تھے، ۳۵ ہزار اور عمدہ توپ خانے سے مسلح تھی۔ پیشوا کے پاس دُگنے سے زیادہ سپاہی تھے اگرچہ بعض امدادی دستے جن کی شرکت متوقع تھی، وقت پر نہ آئے۔ آصف جاہ کی پرانی شہرت، باجی راؤ کے مقابلے میں پچھلی مرتبہ ناکام رہنے کے باوجود، بالکل زائل نہ ہوگئی تھی۔ راجپوت بڑے جنگجو مشہور تھے اور شہنشاہ کا رعب ہنوز دلوں میں باقی تھا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ نیم مسلح مرہٹوں کو توپ خانے سے ڈر لگتا تھا اور وہ اس کی جنگ میں خود کوئی مہارت نہ رکھتے تھے۔

وہ کچھ تردد سے کے ساتھ آگے بڑھے لیکن یہ دیکھکر بہت جلد مطمئن اور مغرور ہوگئے کہ ان کا حریف مضبوط مقام پر خندقیں تیار کرا رہا ہے۔ انھوں نے اسے خوف کی

علامت سمجھا اور ہمت پاکر حملہ کر دیا مگر اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا البتہ دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوئیں نواب نظام الملک ذمہ داری کے احساس سے پریشان تھے اور بڑھاپے نے اب کمزور بھی کر دیا تھا۔ لہذا ایسی کوئی تدبیر نہ کی جس سے کہ خود جارحانہ کارروائی کر کے ناکامی کا حفظ ماتقدم کر لیا جاتا۔ یہ پرانی ترکیب کہ مرہٹوں کو مرہٹوں سے لڑایا جائے، اس موقع پر نہ چلی اور وہ فوج جو کمک کے لئے آرہی تھی، راستے ہی میں کاٹ دی گئی اس صدمے سے بھی دشمنوں کے دل بڑھے اور خود ان کے سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ان کے ذہنی دماغوں میں یہ انجام جنگ کی فال بد تھی۔ صوبہ دار اودھ بھی موقع پر نہ پہنچا بلکہ آخر میں واپس چلا گیا جس سے نواب نظام الملک کی سپاہ کی اور ہمت شکنی ہوئی۔ تھوڑے دن بعد قریب قریب وہی صورت جو پہلی جنگ میں پیش آئی تھی، واقع ہوئی، پیشوا نے مغل سپاہ کو گھیر لینے کی تدبیر کی۔ اس کو خوب تکلیفیں پہنچائیں اور جو لوگ بھاگ کر اس کے پاس آئے انھیں پناہ دینے سے انکار کر دیا کہ اپنی لشکر گاہ میں زیادہ بھیڑ نہ ہونے پائے۔ اس سے بھی نواب نظام الملک کی سپاہ کی تکلیف میں اضافہ ہوا پھر فریقین نے ہر ممکن کوشش کی کہ کمک بہم پہنچا کر اپنا پلڑا جھکا لیں۔ اس میں دونوں کو ناکامی ہوئی بھونسلے نے پیشوا کو فتحمند بنانے کے لئے کوئی جنبش نہ کی اور خود باجی راؤ کا بھائی بسین کی پرتگیزی بستی کے محاصرے میں مصروف تھا اور اپنے شکار کو عین منہ میں آنے کے وقت چھوڑ کر ادھر نہ آسکا۔ اسی طرح نواب نظام الملک کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ وقت پر دکن سے امدادی فوج لیکر نہ پہنچ سکے (بڑا بیٹا پائے تخت دہلی میں تھا)

ہٹتے ہٹتے سیڈان کی طرح، بھوپال کے چھوٹے سے شہر میں نواب نظام الملک گھر گئے اور وہاں کثرت سے لوگ بھر گئے۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی مایوسانہ جد و جہد کی گئی اور آخر توپوں کی مدد سے تین میل روزانہ کی پاس انگیز سست رفتار سے کچھ دور تک مراجعت بھی ہوئی لیکن پہلے موقع کی طرح، اب بھی گھر کر یہ پاسبان اور منتظم سلطنت مجبور ہوا کہ ایک معاہدے پر دستخط کر دے جس میں اپنے قلم سے وعدہ لکھا کہ باجی راؤ کو پورا مالوہ اور نربدا اور چنبل کے درمیان کی حکومت دی جائے گی شہنشاہ سے اس کی منظوری لی جائے گی اور پیشوا کے مصارف کے عوض پچاس لاکھ کی

امدادی رقم دلوانے کی ہر ممکن سعی کی جائے گی۔" (ڈف)

اس کے بعد یہ حریف جدا ہو گئے اور آئندہ کبھی ان کا مقابلہ نہ ہوا اگرچہ باجی راؤ اور سن رسیدہ نواب نظام الملک کے فرزند کے درمیان ایک اور معرکہ پیش آیا جس میں مرہٹے (پیشوا) نے اپنی قوت سے بڑھکر، پورے دکن کی تسخیر اور اس طاقت کے استیصال کا ارادہ کیا جس کی کبھی حمایت اور کبھی مزاحمت کرتا رہا تھا، اور اس میں ایک حد تک بہت ذلت کے ساتھ خود پسپا ہونے پر مجبور ہوا، مگر اس سرنگونی اور اپنے عمر بھر کے حریف پر موجودہ تازہ ترفتح کے درمیان ایک واقعہ ایسا غیر معمولی اور دہشت انگیز ہوا کہ کچھ مدت کے لئے اور سب ہنگامے دب گئے، یعنی مذکورہ بالا معاہدے پر مشکل سے دستخط ثبت ہوئے ہوں گے کہ یکایک نادرشاہ ہندوستان میں گھس پڑا اور (اکثر لوگوں کا خیال تھا، اگرچہ بظاہر غلطی سے کہ) خود نواب نظام الملک نے اسے دہلی پر فوج کشی کی شہ دی۔

اس غیر معمولی شخص کا عروج اپنے ملک کے ایک نہایت پُر مصائب دور میں ہوا۔ وہ ادنیٰ درجے کا خراسان کا باشندہ تھا۔ اس کے ابتدائی کارنامے سیواجی کی طرح قزاقی کی نوعیت کے تھے۔ لیکن اس کی ہمت و مستعدی اور جنگی اوصاف نے اسے بہت جلد سپہ سالاری، اور قوم کے محب وطن ناجی کے مرتبے پر پہنچا دیا۔ اور وہ رفتہ رفتہ تخت بادشاہی تک پہنچ گیا۔ اصل یہ ہے کہ سلاطین صفوی کے انحطاط اور نتیجۃً سلطنت کی کمزوری نے مغربی افغانوں کو ایران پر حملہ کرنے کی طمع دلائی اور ایک عیار و دلیر سردار محمود کی سرداری میں وہ وسط ایران تک پہنچ گئے۔ محاصرہ کر کے اصفہان فتح کر لیا۔ شاہ ایران حسین صفوی کو گرفتار اور پائے تخت کو مسخر کر کے اپنے سردار کی بادشاہی قائم کی (۱۷۲۲ء) اور پھر باقی ملک کو فتح کرنے کی کوشش کی جس میں کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی نصیب ہوئی لیکن ابتدائی حملہ آوروں کی تعداد اس مقصد کے لئے کافی نہ تھی۔ وطن کے لوگ جنہیں اپنے پہاڑوں سے شیفتگی تھی، بہت کم کمک پہنچاتے تھے اور محمود کے مزاج کے متعلق ناموافق باتیں سنکر بھی ایران آنے سے ہچکچانے لگے کیونکہ نئے حالات میں اس کی طبیعت کا رنگ بدل گیا اور اس کی بدظنی اور سفاکی نے کئی ممتاز رفیقوں کو اس سے برگشتہ کر دیا۔ اس نے

شروع میں مفتوحین کے ساتھ نرمی کی مگر بے اعتباری اور اپنی حکومت سنبھالنے کی دشواریوں کے احساس کے باعث وہ بہت جلد دہشت آفرینی اور قتل عام کی باضابطہ اور مایوسانہ حکمت عملی پر چلنے لگا اور تخت نشینی سے تین سال کے اندر مخبوط الحواس ہوگیا اور شدید کرب و تکلیف اٹھا کر، جسے قدرتاً خدائی انتقام سے منسوب کیا گیا، وفات پائی (۱۷۲۴ء) ۔ اس کا ایک رشتہ دار، اشرف، جس کی سپہ سالاری اور سیاست دانی کی شہرت تھی، وارث تخت ہوا۔ مگر اس اثنا میں روسیوں نے پیٹر اعظم کے ماتحت اور نیز باب عالی نے افغانی فتح کے بعد کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر شمالی صوبوں پر حملہ کر دیا اور رواقعۃً تقسیم ملک کا ایک معاہدہ کیا جو اس مملکت کے انتزاع کے مرادف ہوتا۔ اس حال میں اگر نادر شاہ خروج نہ کرتا تو ایران پر بھی وہی گزرتی جو پولینڈ پر گزری۔

قیدی بادشاہ (حسین) کا بیٹا طہماسپ بھاگ کر شمال مشرق کے غیر مفتوح اضلاع میں پہنچ گیا اور لقب شاہی اختیار کر چکا تھا اس نے روس و ترکی کی مشکوک امداد بھی حاصل کر لی اور معاوضے میں ان صوبوں سے دست برداری کا اقرار کیا جس پر یہ سلطنتیں قابض ہوگئی تھیں ابھی دونوں پیٹر نے وفات پائی البتہ ترک اشرف کے خلاف بڑھے لیکن افغانی فوجوں نے نیز اس بدنامی نے ان کی پیش قدمی روک دی کہ یہ ایک سنی حاکم کے مقابلے میں شیعہ شہزادے کی اعانت تھی۔ خود طہماسپ کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے وسائل کم اور کوشش بے قاعدہ تھی۔ اس کا حریف ڈرنے کی بجائے اس کو حقیر جانتا تھا کہ اتنے میں ایک لائق اور مستقل مزاج رفیق کے آملنے سے معاملات کا رنگ بدل گیا (۱۷۲۷ء) اور پناہ گزیں مدعی کو تھوڑے دن کے لئے اپنے اجداد کی دلفریب جانشینی میسر آگئی۔ یہ شخص نادر قلی، جو آیندہ دولت فارس کا مالک اور مغلیہ سلطنت کا حریف غالب بنا، ایک ترک قبیلے کا آدمی تھا۔ کہتے ہیں اس کا باپ اونی چغے اور ٹوپیاں بنا کے بسر اوقات کیا کرتا تھا۔ نادر کی ابتدائی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز پیش آئے۔ سترہ سال کی عمر تھی کہ ازبک اپنے ایک غارتگرانہ دورے میں اسے پکڑ لے گئے۔ چار سال بعد وہ جان بچا کر بھاگا اور خراسان کے ایک چھوٹے سے رئیس کی نوکری کی۔ پھر اسے قتل کر کے بیٹی کو لے بھاگا اور شادی کر لی۔ پھر ڈکیتوں کا

سرگروہ بنکر نمودار ہوا اور اپنے پرانے دشمنوں (یعنی ازبکوں) پر اس بہادری سے حملے کئے کہ والیٔ خراسان نے اسے ملازم رکھ لیا۔ مگر چند روز بعد ہی تازیانے سے خبر لی اور برطرف کر دیا۔ پھر وہ اپنے چچا کے پاس چلا گیا جو قلات کا حاکم ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بھی نادر جیسے تکلیف دہ رفیق سے جلد چھٹکارا پا کر خوش ہوا۔ مگر اس عرصے میں ملکی واقعات نے اس نامانوس لیکن زیرک نوجوان کے سامنے حسب دلخواہ اور مسلسل کامیابی کی نئی راہیں کھول دیں حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے وہ تخت سلطنت تک پہنچ گیا۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ افغانیوں نے ایران پر حملہ کیا اور اس بدامنی کے زمانے میں اس بہادر و لائق محب وطن کے گرد تھوڑی سی فوج مہیا ہو گئی۔ اس کے چچا نے یہ کارنامے سنکر دوبارہ بلایا کہ قلات آئے اور اپنے مصیبت زدہ بادشاہ کی دستگیری کرے۔ نادر نے لبیک کہی۔ گذشتہ قصوروں کی آسانی سے معافی حاصل کر لی اور تازہ و تاریک ترجرم یہ کیا کہ دغابازی سے چچا کو مار کر خود قلعے پر قابض ہو گیا۔ اس مستحکم مقام سے خراسان کے افغان حاکم پر حملہ کیا اور شاہ طہماسپ نے ایک دفعہ اور اس کا گناہ معاف کیا کیونکہ اب نادر اس کی بگڑی بنانے کا ضامن ہو گیا تھا۔

نادر شاہ کی سوانح میں یہاں تک کوئی ایسی چیز نہیں جو فرنگی ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہو لیکن ہمیں ہوس اقتدار و سلطنت کے اس گدلے چشمے کے منبع تک پہنچنا مناسب معلوم ہوا، جس نے آگے چل کر ایسے زبردست سیلاب کی صورت اختیار کی اور خاندان تیموری کے بوسیدہ قصر کو یک بہ یک تباہ و برباد کر دیا۔ نیز اسی کم نسب، ناتعلیم یافتہ، غیر متدین، لیکن کمال عاقل و ممتاز خود ساختہ سپاہی نے، حیرت انگیز سرعت کے ساتھ وہ فوجی اور سیاسی کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ایسے شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں۔

اُس نے زوال پذیر اہل وطن کی شکستہ ہمتوں کو تازہ کیا۔ انھیں حوصلہ مندی، استقامت اور ضابطے کی تعلیم دی۔ پھر اُنھیں پے در پے میدان جتائے تا آنکہ پائے تخت پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ شاہ ایران بحال ہوا۔ افغانی غاصب ملک سے مار کر بھگا دیے گئے اور بھاگتے میں گھیر گھیر کر مارے گئے۔ جو بچے وہ ساحل بحر پر یا پُرصعوبت دشت و بیاباں میں کھیت رہے (سنہ ۱۷۳۰ء)۔ دوسری طرف روسیوں کی

بحر خزر کے کنارے کنارے پیش قدمی روک دی اور اس طاقت سے جو ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا رہی تھی، قابلِ اطمینان عہدنامہ ہوگیا، مغرب میں عربوں کا سدباب کیا اور شمال میں سلطان روم کو پسپا اور اس کے جاں نثاروں کا سر نیچا کیا۔ گذشتہ مصائب میں جو صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے، وہ ایک ایک کر کے واپس لئے اسی سلسلۂ جنگ میں سخت ہزیمت اٹھانے کے بعد (۱۷۳۰ء) حیرت انگیز سرعت سے اس کا بدلہ لیا حالانکہ وہ شکست بالکل تباہ کن نظر آتی تھی اور آخر میں اس خونریز محاربے کو بہمہ وجوہ کامیابی سے اس طرح ختم کیا کہ دولتِ ایران کی حدود جہاں پہلے تھیں وہاں تک پہنچ گئیں (۱۷۳۵ء) صفویوں کے خاندان شاہی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا اور ملک کا جداگانہ مذہب ایک دن میں بدل دیا یعنی تمام اہل ایران کو جبراً اور یک بہ یک سنی بنا لیا تاکہ دوسرے اسلامی ممالک کو فتح کرنے میں آسانی ہو۔ (۱۷۳۶ء) افغانیوں سے ان کی ایران پر فوج کشی کا انتقام لیا مگر ساتھ ہی ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اس کے مطیع اور دل سے وفادار ہوگئے۔ ہندوستان پر بجلی کی طرح گرا (۱۷۳۸ء) مغل شہنشاہ کی سپاہ کو ایک ہی معرکے میں پراگندہ کر دیا اور لرزتے کانپتے بادشاہ کو مجبور کیا کہ ملتجی بن کر فاتح کے لشکر میں حاضر ہو۔ بغیر مزید مزاحمت کے ہندوستان کے پُرشکوہ دارالسلطنت میں داخل ہوا۔ اس کے شہرۂ آفاق خزائن اُڑا لے۔ باشندوں سے سخت تاوان، امیروں سے نذور و تحائف اور بیرونی صوبوں سے محاصل وصول کئے۔ سلطنت کی شہرت ہمیشہ کے لئے اور تقریباً ہستی ہی کا خاتمہ کیا تاہم جابجا اس چوٹ کھائے ہوئے نرسل کو اکھاڑنے کی کوشش نہیں کی۔ یعنی ماورائے سندھ کے (اضلاع چھین لینے کے علاوہ سلطنت کی لڑکھڑاتی عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچایا اور شکست خوردہ بادشاہ کو نہ صرف اپنے منصب پر بحال رہنے دیا بلکہ مربیانہ شان سے اس کی فرماں روائی قائم رکھنے کی کفالت کی یہ پہاڑوں کے زبردست دروں سے تین کروڑ پونڈ سے زیادہ مالیت کا مال غنیمت بخیر و سلامت پار لے گیا۔ شمال کے وحشی قبائل میں دھاک بٹھائی اور وسط ایشیا تک اپنے نام کی دہشت پھیلا دی۔ ولی عہد سلطنت کو اندھا کرا کے طرح طرح کے شبہات اور نئے نئے جذبات برانگیختہ کر دیئے (۱۷۴۳ء) اور اسی بدنصیب مظلوم کے بقول، ایران کی آنکھیں نکال دیں۔ پھر فرصت سے، پشیمان بھی ہوا مگر کچھ خاص طور پر غمگیں نہ ہوا۔ بلکہ اپنے تاسف سے

ثبوت میں ایسے وحشیانہ اور قابل نفرین ظلم کئے جن پر یقین آنا مشکل ہے اور جو ایک منفعل دیوانے ہی کی حرکت ہو سکتے ہیں۔ جس ملک کو غیروں سے بچایا اور دوبارہ عظمت وفلاح سے بہرہ مند کیا تھا، اسے پھر اُن مصائب کا شکار کر دیا جو ایک بے لگام اور خونی استبداد کی شدائد کالازمی نتیجہ ہیں۔ اور آخر ایک خونی کے ناگہانی حملے کا شکار ہوا (۱۷۴۷ء) جو اس کے مجنونانہ جرائم اور رعایا سے روز افزوں عداوت کی ناگزیر سزا تھی۔ مختصر طور پر یہ اس شخص کی عجیب و ہراس انگیز و برق رفتار زندگی کی سرگزشت ہے جو اپنے معاصرین کی نظر میں تیمور و اٹی لا سے کچھ کم درجے کا "قہر الہٰی" نہ تھا اور جیسے شہنشاہ فریڈرک ثانی سے کچھ کم یہ حق نہیں پہنچتا کہ (= اعجوبۂ روزگار) کے نام سے یاد کیا جائے [۱]

دربار دہلی سے نادر شاہ کی نزاع کا بڑا سبب یہ ہوا تھا کہ اس کے بعض افغان دشمنوں کو یہاں پناہ دی گئی تھی۔ جب وہ دریائے سندھ اتر کر بڑھا تو ملک میں حیرانی اور کمال سراسیمگی پھیل گئی۔ اسے روکنے کی ایک مضطربانہ کوشش کی گئی تھی مگر جیسا کہ قاعدہ ہے اس میں فوری اور ناقابل تلافی ناکامی ہوئی۔ دہلی میں داخل ہونے سے قبل کے حالات خود اس نے اپنے بڑے بیٹے کو جو آیندہ اس کی سیاست کا شکار ہوا، تحریر کئے ہیں اور اس کے سب سے ضروری اجزا ذیل کے حاشئے میں درج ہیں [۲]

---

[۱] نادر شاہ کی سیرت وسوانح کا اہل یورپ کے دل پر جو اثر پڑا، اُس کا اظہار اس عجیب وغریب روایت سے بھی ہوتا ہے، جس میں نادر کو برایان (=موجودہ علاقۂ تلجیم) کا باشندہ ثابت کرنے کے شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ یہ روایت ایک فرانسیسی کتاب میں تھی۔ جسے اب بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

[۲] نادر شاہ لکھتا ہے کہ :

"ہم خود اس روز (= جنگ) کے مشتاق تھے۔ لہٰذا فوراً خیمہ وخرگاہ کی حفاظت کا انتظام اور خدا سے دعا کر کے گھوڑے پر سوار ہوئے اور میدان میں آپہنچے ۔ دو گھنٹے تک سخت لڑائی اور توپ و تفنگ کی آتش باری ہوتی رہی۔ پھر خدائے قدیر کی مدد سے ہمارے شیر شکار بہادروں نے دشمن کی صفوں کو شکستہ اور ہر سمت پراگندہ و گریزاں کر دیا۔ لڑائی دو گھنٹے اور پھر ڈھائی گھنٹے تعاقب رہا۔ دن چھپنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ میدان دشمن سے صاف ہو گیا۔ اس کی لشکرگاہ کے مورچے اور دمدمے مضبوط تھے اس لئے لشکرگاہ پر ہم نے اپنی سپاہ کو حملے کی اجازت نہیں دی۔

نادر شہر دہلی میں داخل ہوا تو گو فاتح کے جملہ حقوق منوانے اور باقاعدہ زرستانی پر

اموالِ کثیر، بہت سے ہاتھی، کچھ بادشاہی توپیں، اور ہر قسم کا بیش قیمت سامان فتح کے جلدو میں ہمارے ہاتھ آیا۔ دشمن کے بیس ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے اور اس سے بھی زیادہ تعداد گرفتار ہوئی۔ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم نے شہنشاہ ہندوستان کی فوج کو گھیر لیا اور انتظام کر دیا کہ باہر سے آمد رفت کا سلسلہ مسدود ہو جائے۔ اسی کے ساتھ توپیں اور زنبوریں تیار کیں کہ شاہی مدموں کو گرا کے زمین کے برابر کر دیں۔

شاہی لشکر میں سخت بے ترتیبی اور بدنظمی پھیل گئی تھی لہٰذا بادشاہ کو ایک ہی دن بعد مجبوراً نواب نظام الملک کو ہمارے پاس بھیجنا پڑا۔ یہ ۱۷ ذیقعدہ جمعرات کا دن تھا۔ دوسرے ہی دن خود محمد شاہ امیروں سمیت ہماری بارگاہ فلک اشتباہ میں فریادیوں کی طرح آ گیا۔ چونکہ ہم ترکمان اور وہ بھی ترکمان اور خاندان والاشان گورگان کا جانشین ہے اس لئے اسے آتے دیکھکر ہم نے اپنے عزیز فرزند ناصر علی خاں کو روانہ کیا کہ لشکرگاہ کی حدود سے آگے بڑھکر استقبال کرے۔ بادشاہ ہمارے خیام میں آیا تو ہم نے اپنی مہر سلطنت اس کو دی اور وہ ایک دن ہمارا مہمان رہا۔ اپنے ترکمانی رشتے اور اس کے منصب شہنشاہی کے لحاظ سے یہ سلوک کیا گیا اور ہم نے حکم دیا کہ اس کی شاہی بارگاہ اور اہل خاندان کی حفاظت کی جائے۔ اور اس کی اپنے مرتبۂ عالی کے مطابق تکریم کی گئی۔

پھر شہنشاہ اور اس کے اہل خاندان دہلی روانہ ہوے اور جمعرات (؟) ۲۹ ذیقعد کو ہمارے پرچم اقبال نے بھی اسی سمت حرکت کی۔

محمد شاہ کے رتبۂ عالی اور خاندان گورگان سے ہونے اور بہ حیثیت ترکمان ہم سے رشتہ رکھنے کے لحاظ سے، ہمارا شاہانہ ارادہ یہ ہے کہ اسے تخت بادشاہی پر قائم و دائم اور تاج سلطانی اس کے سر پر رکھیں۔ الحمد للہ والمنت کہ اس عزوجل نے ہمیں ایسا کرنے کی قدرت عطا فرمائی۔ خدائے تعالیٰ نے ہمارے اور ہمارے جاں نثار و مظفر بہادروں کے پر شوکت و نصرت قدموں کے نیچے سات سمندروں کو سحاب دشتی بنا دیا۔ اس نے ہماری خسروانہ نظر میں بادشاہوں کے تخت و تاج اور دنیاوی جاہ و جلال اس حباب سے بھی زیادہ بے قدر و حقیر کر دیا جو سطح موج پر ابھر آتا ہے۔ اور بے شبہہ اس کی رحمت جس کا اس وقت ظہور ہوا، تمام بنی نوع پر روشن و مبرہن ہو جائے گی (اقتباس از تاریخ ایران، مرتبہ میلکم۔ ترجمہ (انگریزی) از ایشیاٹک ریسرچز) —

آمادہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ، خوفزدہ باشندوں کی جان اور آبرو کا پاس اور لوٹ مار سے احتراز کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بادشاہی قصر میں فروکش ہوا اور امن قائم رکھنے کی غرض سے اپنے سپاہی شہر کے محلّوں میں پہرے پر مقرر کر دیے۔ یہ بھی حکم دیا کہ اگر کوئی سپاہی کسی ہندی کو ستائے گا تو اس کے ناک کان کاٹ دیے جائیں گے۔ اس کے انتظام کی سختی مشہور تھی۔ لوگوں میں اس کی طرف سے وحشت کی بجائے رفتہ رفتہ عداوت کا جذبہ جوش مارنے لگا۔ دو دن خیریت سے گزرے صرف باضابطہ مال ستانی کا کام ہوتا رہا۔ سر جون میل کم لکھتا ہے کہ وہ فتح کے معاوضے میں بادشاہ کی ساری دولت اور اس کے سب سے دولت مند امیروں کی متاع کا معقول حصّہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ خزانۂ شاہی کے تمام زر و جواہر جو شاہانِ مغلیہ کئی پشتوں سے جمع کرتے آئے تھے، وہ سب محمد شاہ نے فاتح کے حوالے کئے۔ امرائے کبار نے بھی اپنے بادشاہ کی پیروی کی اور تمام نقد روپیہ اور مال منقولہ جو ان کے پاس تھا، لا کے دے دیا۔ یہ تو تحائف تھے جنھیں "خوشی خواہ" کہا گیا لیکن ان کی وصولی کے بعد صوبوں سے "باقیات" کا مطالبہ اور شہر دہلی کے سب متمول باشندوں پر بہت بھاری تاوان عائد کیا گیا، طرّہ یہ کہ ان رقوم کی وصولی کا ٹھیکہ خود ہندی متاجروں کو دیا گیا اور انھوں نے اہلِ وطن کی اس مصیبت سے فائدہ اٹھا کر جس بے دردی سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اس کا یقین آنا مشکل ہے چنانچہ نادر شاہ کے لئے جتنی رقم جمع کی تھی، اس سے چار پانچ گنا زیادہ روپیہ وصول کیا۔

بہت سے باغیرت اور نیز مال کی محبت رکھنے والے، عالی رتبہ اشخاص خودکشی کر کے مر گئے کہ اس مصیبت و بے آبروئی سے نجات ملے۔ عام اہلِ شہر کا ہراس و مایوسی بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ تیسری رات، نادر شاہ کی ناگہانی موت کی مہلک افواہ سے بلوہ ہو گیا اور اس نے قبضۂ شہر کے رہے سہے مصائب کی تکمیل کر دی۔ عوام نے ہنگامہ کر کے اُن سپاہیوں کو جو ہر طرف حفاظت کے لئے مقرر تھے، قتل کر دیا اور بزدل و فرومایہ عائد نے بھی انھیں بچانے کی کوشش نہ کی بلکہ عوام الناس کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے دیا۔ نادر شاہ نے اس طوفان بے تمیزی کو فرو کرنے کی غرض سے قاصد روانہ کئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور یہ قاصد بھی تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ صبح ہوئی تو وہ سوار ہو کر خود چلا کہ ان خیرہ عقل و شوریدہ سر لوگوں میں ذاتی اثر سے کام لے لیکن

یہ کوشش بھی رائیگاں گئی اور خود اس کی جان پر حملہ ہوا۔ آخر اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ عوام کا بیہودہ گروہ تو اسی وقت منتشر اور ان سپاہیوں سے جن کا غضب حق بجانب تھا، لرزہ براندام ہوگیا۔ لیکن اب اس سے کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ خوفناک قتل عام واقع ہوا اور اس عقوبت کو آتش زنی نے اور بڑھا دیا۔ اور شہر کے اکثر حصّوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔

تند خو فاتح اس وقفے میں ایک مسجد میں آگیا اور سر جون میلکم کے بقول "وہیں اس قدر کبیدہ اور گہرے سکوت میں بیٹھا رہا کہ اس میں خلل ڈالنے کی کسی کو جرأت نہ ہوسکتی تھی۔ آخر کار بدنصیب محمد شاہ، دو وزیروں کے ہمراہ، دوڑ کر بے تحاشا سامنے آیا اور فریاد کی کہ میری رعایا کی جان بخش دو[1]! نادر نے جواب دیا، شہنشاہ ہند کا کہنا خالی نہیں جاسکتا، اور فوراً قتل عام کو روکنے کا حکم جاری کیا۔ اس حکم کی اسی وقت تعمیل ہوئی اور ثابت ہوگیا کہ یہ خوفناک سپہ سالار اس حالت میں بھی جب کہ سپاہی بالکل از خود رفتہ ہو رہے ہوں، ان پر کس قدر غیر معمولی رعب رکھتا ہے۔"

اس مہیب صبح کو کتنے نفوس ضائع ہوئے؟ اس کا اندازہ کرنا تو غیر ممکن ہے لیکن بے شبہ ان کی تعداد کثیر تھی اور دوپہر سے قبل انتقام کی تلوار میان میں نہیں گئی۔ بعد میں بھی کئی سو اشخاص کو، بغاوت کے اغوا یا شرکت کرنے کے جرم میں، تحقیقات کرکے سزائے موت دی گئی۔

دہلی کے نالائق بازاریوں کے اخلاق جس حد تک گر گئے تھے، اس کا اندازہ اسی واقعے سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایرانیوں کے رخصت ہونے کے چند ہی روز بعد

---

[1] یہ غلط ہے کہ محمد شاہ خود دوڑ کر بے تحاشا نادر شاہ کے سامنے آیا اور فریاد کی کہ میری رعایا کی جان بخشی کی جائے۔ ہمعصر تاریخوں میں ہے کہ محمد شاہ نے نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل کو نادر شاہ کے پاس بھیجا جن کی سفارش پر دہلی کا قتل عام بند کیا گیا۔ تاریخ مظفری اور حدیقۃ العالم میں اس واقعے کی تفصیل درج ہے۔ نواب نظام الملک نے دربار دہلی کی طرف سے ایک بڑی رقم نادر شاہ کو دینے کا وعدہ کیا۔ جب دہلی میں ذرا امن قائم ہوا تھا تو نواب نظام الملک اعتماد الدولہ اور سربلند خاں نے خود اپنے پاس سے اور دوسرے امراء سے رقم جمع کرکے نادر شاہ کے حوالے کی اس کے بعد نادر شاہ نے باقاعدہ محمد شاہ سے معاہدۂ صلح کیا اور ایران واپس ہوا۔

انھوں نے اپنی گذشتہ ذلتوں کا خود سوانگ بھرا اور اس میں اپنے فاتحین کے خونخوار چہروں اور وحشیانہ تکبر کی (جن سے چند روز پہلے ان کی روح فنا ہوئی جاتی تھی) نقالیاں بھی خاص طور پر لطف وانبساط کا موجب بنیں[1]

نادر شاہ دو مہینے دہلی میں قیام کرنے اور اپنے منجھلے بیٹے کی شاہی خاندان میں شادی کرنے کے بعد وطن کی جانب واپس روانہ ہوا۔ کہتے ہیں اس نے محمد شاہ کو بہت کچھ نیک نصیحتیں کیں اور یہ تو مسلّم ہے کہ اہل ہند کو اپنے مغل بادشاہ کی سچی اطاعت وفرماں برداری کی سخت تاکید کی اور ڈرایا کہ ایسا نہ کروگے تو دوبارہ آکر تہس نہس کرڈالونگا۔ چنانچہ اپنے گشتی مراسلے کے آخر میں یہ تہدیدی الفاظ تحریر کئے کہ "خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ لیکن اگر تمھاری اپنے بادشاہ کے خلاف سرکشی کی خبر ہمارے کان تک پہنچی تو لوح روزگار سے ہم تمھارا نام تک مٹادیں گے۔

لیکن اس قسم کا میلان تھا بھی تو اسے اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ ادھر خاندان مغلیہ کی ڈگمگاتی کشتی ان فصیح نصیحتوں اور رعب دار دھمکیوں سے اتنی تر نہیں جتنی کہ خود نادر کی تباہ کن آمد اور قتال اس کے ڈبونے کا قوی سبب بن گئی۔ کیونکہ اسی نے اس خاندان کو بری طرح ذلیل کیا اور لوٹا۔ نادر کے محمد شاہ کو شکست دینے اور دارالسلطنت کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کرنے کے بعد ہی ہندوستان کے تین بہترین صوبے سلطنت سے جدا ہو گئے جیسا کہ شرقی سیاسیات کا عام معمول رہا ہے۔ یہ بنگالہ، بہار اور اڑیسہ کے صوبے تھے جہاں ایک سنئے اور منجھلے شخص نے عملاً خود مختار سلطنت قائم کردی۔ اس کا نام محمد علی تھا مگر آخر میں علی وردی خاں کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس کا باپ میرزا محمد ابتدا میں "عظیم شاہ" (=عظیم الشان؟) کی سرکار میں نوکر تھا لیکن اس شہزادے کا خاتمہ ہونے کے بعد اڑیسے کے نائب ناظم شجاع الدولہ کی ملازمت میں داخل ہوا اور اپنے دو نوں بیٹوں، محمد اور حاجی احمد کو بھی اسی سرکار میں نوکر کرا دیا۔ انھوں نے بڑے بڑے عہدے اور شجاع الدولہ کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا۔ شجاع الدولہ مرا (۱۷۳۰ء) تو اس کا بیٹا سرفراز خاں جانشیں ہوا جس سے شجاع الدولہ بہت ناراض تھا۔

---

[1] میلکم کی "تاریخ ایران"۔

غالباً محمد اور احمد بھی اپنے مربی کی اس ناخوشی میں ہم خیال تھے اور ممکن ہے کہ نئے ناظم نے ان کی کافی عزت و توقیر بھی نہ کی ہو، پس انھوں نے مل کر سازش کی اور سرفراز خاں کو اکھاڑ پھینکا (۱۷۳۹ئہ) چند سطروں میں یہ طے کرنا کہ کس حد تک یہ فعل محض غداری پر مبنی تھا اور کس حد تک سرفراز خاں یا اس کے ندیموں کا طرزِ عمل اشتعال کا موجب ہوا، آسان نہیں ہے اور نہ شاید اس کو طے کرنا اب کچھ ضروری ہے۔ لیکن اسی واقعے کے بعد سے محمد علی (علی وردی خاں) کی زندگی کا وہ دَور شروع ہوتا ہے، جو اُس عہد کی ابتری اور سیاسی اغراض کے تصادُم کی نہایت عمدہ مثال ہے اور یہی وہ اسباب تھے جو گزشتہ انتظام کے مٹانے اور نیا نظم قائم کرنے میں مصروفِ عمل تھے۔ اسی کے ساتھ علی وردی کے واقعات پڑھکر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اِس شخص میں کیسی حیرت انگیز مستعدی بھری ہوئی تھی حالانکہ وہ اسی علاقے کا باشندہ تھا جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہاں کی آب و ہوا آدمی کو لازماً تن پرور، تن آسان اور کاہل بنا دیتی ہے۔ یوں بھی علی وردی کے کارناموں کو، مختصر طور پر بیان نہ کیا جائے تو سلطنت کے انقراض و شکستگی کی تصویر بالکل ناقص رہ جائے گی اور سراج الدّولہ کی چند روزہ حکمرانی کا سبب اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکے گا، جس کی تخریب کے بعد انگریزوں کی حکومت بنگالے میں قائم ہوئی۔

القصہ، علی وردی پہلے سرفراز خاں کی طرف سے بہار کا حاکم تھا۔ سرفراز خاں کے خاتمے کے بعد اس نے دہلی کی حریص و زوال پذیر حکومت کو بہت سا روپیہ دے کر بنگالے کا واقعی قبضہ اور تینوں صوبوں کی صوبہ داری کا لقب حاصل کر لیا۔ مگر اڑیسے میں ان دنوں سرفراز خاں کا بہنوئی مرشد قلی خاں حاکم تھا اس کے رشتہ داروں نے اُبھارا کہ علی وردی خاں کی دوستانہ فرمائش قبول کرنے کی بجائے شمشیر آزمائی کی جوکھوں مول لے۔ لڑائی میں مرشد قلی کو شکست ہوئی۔ وہ بچ نکلا مگر آیندہ اس کشمکش میں پڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ کٹک میں علی وردی نے اپنے بھتیجے صولت جنگ (خلف احمد) کو حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے رعایا اور فوج دونوں کو بگاڑ لیا جس پر وہاں بلوہ ہو گیا اور بلوائیوں نے صولت جنگ کو پکڑ کر سرفراز خاں کے ایک اور عزیز باقر خاں کے حوالے کر دیا۔ اس ہنگامے سے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ صولت کے ماں باپ تو اپنے لڑکے کو بچانے کی غرض سے تیار تھے کہ اڑیسہ باقر خاں ہی کے

حوالے کر دیا جائے لیکن علی وردی خاں نے اسے پسند نہیں کیا اور دوبارہ فوج کشی کر کے باقر خاں کو شکست دی۔ صولت جنگ کو موت کے منہ سے چھڑا لیا اور صوبے کا دوبارہ معقول انتظام کر کے اطمینان سے پائے تخت کی طرف آرہا تھا کہ یکایک خبر پہنچی کہ مرہٹوں کا ٹڈی دل اس کی تلاش میں چلا آتا ہے اور حسب معمول غارتگری اور زرستانی پر تلا ہوا ہے۔ ۱۷۴۲ء برار کے مرہٹہ رئیس راگھوجی بھونسلے کی یہ پہلی کوشش تھی کہ اپنے فوجی سردار بھاسکر پنڈت کو چالیس ہزار سوار دیکر (شمالی) ہندوستان پر حملہ کرنے کو روانہ کیا۔ علی وردی مشکل سے بردوان پہنچا ہو گا کہ اپنا بھاری سازوسامان وہاں محفوظ کرا دے، کہ استنے میں غنیم کا لشکر آپہنچا اور نواح بردوان میں غارت گری و تاراج شروع کر دی۔ چند مقابلوں اور معرکوں کے بعد مرہٹوں نے دس لاکھ روپیہ لیکر واپس جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر علی وردی نے انکار کر دیا اور اپنے مستقر مرشد آباد تک پہنچ جانے کی تیاری کی لیکن قابل جنگ صرف پانچ ہزار سپاہی رہ گئے تھے اور مرہٹوں کے حملے سے دہشت زدہ ہو کر ہزاروں آدمی کی بھیڑ ساتھ ہو لی تھی۔ علی وردی نے حکم دیا تھا کہ یہ لوگ وہیں ٹھیریں لیکن وہ نہ مانے اور لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی وردی کو اس پسپائی میں بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ سارا سازوسامان، خیمے، توپیں راستے میں چھوٹ گئیں اور وہ چوتھے دن کٹوا پہنچ سکا جہاں صولت جنگ (جسے کچھ مدت پہلے اُس نے اڑیسے کے باغیوں سے نجات دلائی تھی) کمک لیکر آگیا۔ ان مصائب میں بھاسکر کی شرائطِ صلح اور سخت ہوتی جاتی تھیں لیکن علی وردی خاں انھیں ماننے سے برابر انکار کرتا رہا۔ اس پر میر حبیب نامی سردار جو صوبہ دار بنگالہ کی رفاقت چھوڑ کر بھونسلے کا نوکر ہو گیا تھا، اپنی مرہٹہ جمعیت کے ساتھ مرشد آباد پر جھپٹا مگر علی وردی خاں کئی کئی منزلیں طے کرتا ہوا وقت پر پہنچ گیا اور گو مرہٹوں نے اس کے رفیق اور مرشد آباد کے سب سے بڑے ساہوکار جگت سیٹھ سے، نواب کے آتے آتے تیس لاکھ اشرفی کا مال اینٹھ لیا، تاہم شہر ان کی دست برد سے بچ گیا۔ اس کے بعد مرہٹے آس پاس کے علاقے میں اس طرح پھیل گئے کہ بنگالے میں گنگا کے غربی جانب نواب کے قبضے میں شہر مرشد آباد اور مضافات کے سوا، کچھ باقی نہیں رہا[۵۱]۔ یہ برسات کا زمانہ تھا لیکن اسی وقفے میں علی وردی خاں نے

[۵۱] - اسکاٹ۔

ایسی تیاری کی کہ ابھی ندیاں چڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کشتیوں کا پُل بنا کے مرہٹی ندی کے پار اُتر آیا۔ اس کی تازہ دم فوج کی آمد آمد نے دشمن کے حواس گُم کر دئے اور وہ گھبرا کے فرار ہو گئے۔ اب علی وردی خاں کی باری تھی کہ مرہٹوں کا خیمہ وخرگاہ چھینے اور انہیں گھنے جنگلوں میں کھدیڑتا پھرے۔ کچھ مدّت کے بعد حملہ آوروں نے پھر ترتیب درست کر لی اور کٹک پر یورش کی۔ وہ دوبارہ علی وردی خاں کے مقابلے میں آئے مگر شکست کھائی اور اس کے علاقے سے باہر تک بھگا دئے گئے۔ دہلی کے ناتوان بادشاہ نے بھی اس کارِ نمایاں کی قدر کی اور صوبہ دار، اس کے بھتیجوں اور بڑے عہدہ داروں کو خطابات سے سرفراز کیا۔ علی وردی خاں کو خلعت اور ایک مرصّع بجواہر خنجر بھیجا اور دوسری طرح بھی اظہار نوازش و خوشنودی کیا اگرچہ وہ اب محض برائے نام محمد شاہ کا ماتحت رہ گیا تھا۔ پھر بھی علی وردی کی امداد کی درخواست پر صفدر جنگ نواب اودھ کو حکم دیا گیا کہ حملہ آوروں کو نکالنے میں شرکت کرے، لیکن علی وردی خاں کو فتح ہوئی تو اس نے کوشش کی کہ جلد سے جلد ایسے حلیف سے پیچھا چھڑائے جس کی نسبت یہ شبہہ بے بنیاد نہ تھا کہ ہمسائے کی آگ سے خود ہاتھ تاپنا چاہتا ہے۔

ادھر اپنے نائب کی ناکامی نے اس کے اصل حاکم کی طبیعت میں اشتعال وسرگرمی پیدا کی اور خود رگھوجی بڑا لاؤ لشکر لیکر بنگالے پر چڑھ دوڑا۔ مگر انھی دنوں پیشوا باجی راؤ کا بیٹا بالاجی۔ اپنے نامور باپ کا جانشین ہوا تھا۔ وہ بعض اسباب کی بنا پر جن کی آیندہ صراحت ہوگی، اس موقع پر خود اپنے ہمقوم کے خلاف، علی وردی خاں کا طرفدار ہو گیا اور مغلیہ فوجوں سے بھی پہلے اتنی جلد میدان میں آگیا کہ اس کے تعاقب کی بدولت رگھوجی کو چند ہی روز میں بنگالے سے بھاگ جانا پڑا۔ (۱۷۴۳ء)

دوسرے سال پھر بھاسکر پنڈت زبردست لشکر کے ساتھ بنگالے میں داخل ہوا اور بہت بھاری نذرانے کا مطالبہ کیا۔ اس مرتبہ علی وردی خاں نے دوسری تدبیر اختیار کی یعنی بہت احتیاط اور عیاری سے اپنا منصوبہ بنا کر دشمن کے سپہ سالار اور بڑے بڑے سرداروں کو ملاقات کے واسطے بُلایا۔ کہ شرائط صلح کے تفصیلی امور طے کر لئے جائیں۔ اور سب کو مروا ڈالا۔ پھر یکبارگی مرہٹہ سپاہ پر یورش کر کے اُسے تہ وبالا کر دیا۔ صرف ایک لشکر جو خاندان گائکواڑ کے کسی سردار کے تحت میں لشکرگاہ میں

رہ گیا تھا، اور وہ سردار علی وردی خاں پر غداری کا شبہہ رکھتا تھا، سلامت بچ کر نکل گیا۔ (۱۷۴۴ء)۔

علی وردی خاں نے اس موقع پر اور ان دشمنوں کے ساتھ جن کو وہ بلاشبہہ بالکل وحشی درندوں سے کچھ کم نہ سمجھتا ہوگا، انتہائی دغابازی کا برتاو کیا لیکن یہ فعل، اس عہد کے سیاسی ماحول میں، جس میں علی وردی کی پرورش ہوئی، کچھ بھی خلاف معمول نہ تھا۔ دوسرے، حقیقت یہ ہے کہ وہ طبعاً فیاض آدمی تھا اور اس کی حکمت عملی بھی یہی تھی کہ جو لوگ اس کی دراز دستی میں مدد دیں، اور اس نئی ریاست میں، جس کے بنانے میں عرقریزی کر رہے تھے، معقول حصہ پانے کے دعوی دار ہوں، ان کے ساتھ داد و دہش کا سلوک مرعی رکھا جائے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ پریشانیوں میں اس نے لوگوں سے بہت کچھ وعدہ وعید تو کر لئے مگر اب ان سب کو پورا کرنا، دشوار یا مخدوش نظر آتا تھا۔ اسی سے لوگوں میں بددلی پیدا ہوئی اور جب اس نے بہار کے گراں قدر صوبے کو اپنے سب سے طاقتور رفیق مصطفیٰ خاں کی تحویل میں دینے سے انکار کیا، تو علانیہ نزاع کی نوبت پہنچی۔ غالباً اسے وہ نظیر جو خود اس نے قائم کی کہ اپنے پیش رو سے اسی صوبے کی حکومت پاکر، مقابلے پر کمر باندھی، فراموش نہ ہوئی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ مصطفیٰ خاں پر اسی قسم کے منصوبے کا شبہہ بھی کیا جاتا تھا۔ بہر نوع، اس مطالبے اور انکار کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ دار اور اس کے سپہ سالار میں کشیدگی بڑھ گئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے دغابازی کا شبہہ ہونے لگا۔ دربار میں ایک بہت ہی بدنما واقعے سے مصطفیٰ خاں کو ایسی ملازمت سے ہاتھ دھونے کا، جس میں اس کی جان محفوظ نہ تھی، حیلہ مل گیا۔ علی وردی خاں نے بلا تامل اس کا استعفا قبول اور بقایا تنخواہ کا حساب کر دیا مگر حکم دیا کہ وہ فوراً اس کے علاقے سے نکل جائے۔ مصطفیٰ خاں نے کوشش کی تھی کہ چند اور افغان سردار بھی اس کے باغیانہ منصوبوں میں شریک حال ہو جائیں لیکن کامیابی نہ ہوئی اور وہ اپنے بہت سے پیادے اور آٹھ ہزار سوار لیکر وہاں سے رخصت ہوا۔ چلتے وقت چھاونی کو آگ لگادی اور کھلے بندوں بہار پر جبراً قبضہ کر لینے کی تیاریاں کیں۔

وہاں علی وردی خاں کا بھتیجا ہیبت جنگ حاکم تھا۔ نواب کا ایما ہوا کہ

خود اس کے بہار پہنچنے تک کوئی لڑائی نہ لڑی جائے لیکن ہیبت جنگ نے جوش میں آکر ایسی آزمودہ کار فوج کے آزمودہ کار سردار سے لڑنے میں تامل نہ کیا حالانکہ خود ہیبت جنگ کے لشکر میں اناڑی سپاہی تھے اور تعداد بھی کمتر تھی۔ جنگ میں اس کا بالکل ہی خاتمہ ہو جاتا لیکن مصطفیٰ خاں کا فیلبان مارا گیا اور ہاتھی قابو سے باہر ہو گیا۔ مصطفیٰ خاں مجبور ہو کر ہاتھی سے اتر پڑا جس سے حسب معمول ساری فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس طوفان بے تمیزی میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے سے فرار ہونے لگیں۔ اس کے بعد ایک ہفتے تک دور سے گولہ اندازی ہوتی رہی تاآنکہ مصطفیٰ خاں نے دوبارہ دشمن کی صفوں پر حملہ کیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی تقدیر نے کمزور فریق کا ساتھ دیا۔ باغی مصطفیٰ خاں کے دو بہترین سردار کام آئے اور ابتدائے جنگ ہی میں خود اس کی آنکھ پر زخم لگا۔ علی وردی خاں کی آمد آمد سن کر بھی اس نے ہٹ جانا ہی مناسب جانا۔ ادھر نواب کی سپاہ آگئی تو چچا بھتیجے کی متحدہ سپاہ نے تعاقب کیا اور اودھ کی حدود میں بھگا دیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے پھر بہار کا رخ کیا اور اپنے پرانے حریف ہیبت جنگ سے لڑا مگر شکست کھائی اور مارا گیا اگرچہ اس کے ساتھ والوں کی جمعیت بعد میں بھی ملک میں منڈلاتی پھری۔

اس اثنا میں علی وردی خاں کو پھر مرہٹوں کی تازہ یورش کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس مرتبہ خود رگھوجی سر لشکر بن کر آیا تھا۔ ایک تو اپنے نائب اور انیس سرداروں کے مارے جانے کا غصہ، دوسرے یہ خیال کہ ملک میں اندرونی خلفشار برپا ہے، لہذا نواب سے بہت بھاری مطالبات شروع کئے۔ علی وردی خاں دو مہینے تک اسے بہلاتا رہا۔ کبھی داد وستد کی شرطیں اور تہذیب و شائستگی کی باتیں کرتا، کبھی بگڑ بگڑ کے دوڑن کی ہانکتا۔ یہاں تک کہ لڑائی کا مناسب وقت آگیا۔ تب یہ مصنوعی باتیں چھوڑ کر اس نے خود پیش قدمی کی۔ شروع میں حریف سبقت لے گیا تھا، لیکن کئی معرکوں میں نواب نے رگھوجی کو شکست دی اور ایک مرتبہ تو یہ مرہٹہ سردار گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ اس دفعہ بھی حملہ آوروں نے مرشد آباد پر یلغار کی تھی مگر اس مرتبہ پھر علی وردی خاں کی سرگرمی نے اپنے دارالملک کو اس آفت سے بچا لیا جو ہندوستان کے بہت سے پرشکوہ شہروں پر گزری تھی۔ یہ ناکامی، پھر گنتوا پر ایک اور شکست اور خود

اپنے سپاہیوں میں فساد ہو جانے سے رگھوجی کو مصلحت یہی نظر آئی کہ بنگالے سے پسپا ہو جائے (۱۷۴۵ء) البتہ میر حبیب کی سرداری میں کٹک پر اپنا قبضہ بحال رکھا اور افغانوں اور مرہٹوں کی ایک مخلوط فوج وہاں متعین رہی۔

تھوڑی دیر کے لئے علی وردی خاں کا علاقہ علانیہ جنگ وجدل سے بالکل پاک ہوگیا اور اسے فرصت مل گئی کہ دھوم دھام سے نواسے کی شادی رچائے۔ یہ وہی نوعمر نواسا تھا جو بعد میں سراج الدولہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر امن واطمینان کی اس قلیل فرصت میں بھی جبکہ جنگ کے دیوتا کا مندر بند تھا۔ اس مظفر و منصور سپہدار (علی وردی خاں) کا دل پورا مطمئن نہ تھا۔ کٹک پر ابھی تک دشمن کا تسلط تھا۔ پھر یہ کہ بھونسلے کے بچ نکلنے کے متعلق صیغۂ راز میں خبر ملی تھی کہ دو افغان سرداروں کے اغماض سے وہ فرار ہوا۔ بعض اور اسباب بھی اس شبہے کی تائید کرتے تھے کہ یہ سردار نواب کے نمک حلال نہیں ہیں چنانچہ اس نے انھیں اور ان کے ساتھ والوں کو برطرف کر دیا لیکن بہار میں توطن اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ تعداد میں چھ ہزار سے زیادہ اور پختہ کار واوباش مزاج سپاہی تھے اور انھیں بہار میں بسنے کی اجازت دینا اس درجہ ناعاقبت اندیشی کی بات تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا نواب نے ایسا کیوں کیا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس حکمت عملی کے خطرناک نتائج بھی ظہور میں آ گئے۔

ادھر امن کے قلیل زمانے کو خود نواب نے ختم کر دیا۔ یعنی کٹک واپس لینے کی غرض سے فوج کشی کی۔ چند فتوحات بھی حاصل ہوئیں مگر ان کے مقابلے میں نئی پریشانی یہ پیدا ہوئی کہ میر جعفر اور عطاء اللہ نامی دو سپہ سالاروں نے سرکشی اور نمک حرامی پر کمر باندھی (ان میں میر جعفر وہ شخص ہے جسے بعد میں انگریزوں نے بنگالے کا صوبہ دار بنایا) نواب نے مجبوراً ان دونوں کو برطرف اور مرشدآباد میں خانہ نشیں کرا دیا۔ اس مرتبہ بھی مرہٹوں نے ایک نئے سردار جانوجی کی قیادت میں، مرشدآباد تک

بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر نواب نے کچھ پیش نہ جانے دی ان مشقتوں کے بعد وہ برسات میں آرام سے رہا تھا کہ دفعۃً اس کی طوفانی زندگی کے سب سے تند و تیز طوفان نے اُسے آلیا۔

وہ افغان سردار جن کی نسبت اوپر بیان ہوا کہ برطرفی کے بعد اپنے کثیر و جرائم پیشہ رفیقوں کے ساتھ بہار میں بسا دیے گئے تھے، سردار خاں اور شمشیر خاں تھے۔ بہار کا حاکم ابھی تک نواب کا بھتیجا ہیبت جنگ تھا۔ اس نے چچا سے درخواست کی کہ ان افغانوں کو جو اپنے قصور پر منفعل اور آیندہ تلافی کرنے کے دل سے خواہش مند ہیں، سرکاری ملازمت میں لینے کی اجازت دے دی جائے، خود ہیبت جنگ کی نیت کے متعلق بہت سی بدگمانیاں کی جاتی ہیں، تاہم چچا نے بادل ناخواستہ اس کی درخواست منظور کر لی اور ہیبت جنگ نے ان معزول سرداروں سے دو تین مرتبہ ملاقات اور ابتدائی گفتگو کی۔ پھر یہ دکھانے کے لئے کہ وہ ان کی طرف سے کوئی کینہ نہیں رکھتا اور ان کی بدگمانی رفع کرنے کی غرض سے اس نے اپنے ساتھ کے سپاہی بلکہ پہرے چوکی والوں کو بھی ہٹوا دیا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو اکثر ایسی حماقت کا ہوا کرتا ہے کہ غدّار و کینہ پرور شمشیر خاں نے اس موقع کو خالی نہ جانے دیا اور بھروسہ کرنے والے نائب صوبہ دار کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ (وقوع سے قبل سردار خاں کی اس قتل میں شرکت مشتبہ ہے) پھر سپاہی بھر میں جہاں یہ خون ناحق ہوا تھا، سخت آفت برپا کر دی۔ اس مار دھاڑ میں ان پٹھانوں کے ہزاروں ملازمین کے علاوہ، وہ سب سپاہی بھی فوراً آملے جن کو تھوڑے دن پہلے ملازمت سے برطرف کیا گیا اور وہ نواب سے ناراض تھے۔ ہیبت جنگ کے قتل کے وقت جو گڑبڑ ہوئی، اس میں کسی باضابطہ مزاحمت وغیرہ کا انتظام خارج از بحث تھا۔ ہیبت جنگ کا باپ (حاجی احمد) سرفراز خاں کو شکست دینے کے بعد اپنے بھائی (یہ نواب علی وردی خاں) سے لڑ جھگڑ کے سرکاری خدمت سے دست بردار ہوا

اوران دنوں پٹنے ہی میں چین کی زندگی بسر کرتا یا روپیہ جوڑنے میں مصروف رہتا تھا۔ باغی سرداروں نے اسے بھی پکڑ کر کئی دن تک طرح طرح کی شدید اذیتیں دیں حتیٰ کہ وہ جان سے گزر گیا لیکن اپنے خزائن ودفائن کا اس نے بھید نہ بتایا۔ تاہم ان کا پتا چل گیا اور یہ روپیہ بھی نئی فوجیں بھرتی کرنے میں صرف ہوا، اسی طرح دہشت زدہ شہر والوں سے بھاری بھاری نذرانے وصول کئے گئے۔ ہیبت جنگ کی بیگم جو علی وردی خاں کی بیٹی تھی، اسے ابھی باغی پکڑ کر لے گئے اور خود بنگالے پر چڑھائی کی تیاریاں کرنے لگے (۱۷۴۸ء)

یہ بغاوت جس میں سگا بھائی اور بھتیجا مارے گئے، بیٹی اس طرح باغیوں کے ہاتھ پڑی، ایسی حالت کچھ کم خطرناک نہ تھی جب کہ مرہٹہ فوجیں ہمسائے میں موجود تھیں، اور اپنے رہے سہے رفیقوں پر بھی زیادہ اعتماد نہ تھا بلکہ ان میں سے نافرمانی کی بنا پر وہ اُنھی دنوں دو سرداروں کا مجبوراً درجہ توڑ چکا تھا۔ ان واقعات نے نواب کو کافی ہراساں کر دیا حالانکہ اب تک اس کی ہمت وسرگرمی میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ تاہم اس نے بلا تاخیر اپنے بڑے بڑے سرداروں سے درد انگیز التجا کی اور اپنی احسان مندی کا بہ عنوان شائستہ اعتراف کیا اور انھیں جو اس اڑے وقت کام آئیں، انعام واکرام دینے کے بہت کچھ وعدے کئے ساتھ ہی ظاہرداری سے یہ بھی اعلان کیا کہ جو لوگ میری رفاقت پر خوشی سے آمادہ نہیں ہیں میں ان کو مجبور نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے عام طور پر جوش وخروش سے جنگ میں چلنے کا اقرار کیا۔ اس طرح اکثر افراد کی تائید ہو گئی تو دور اندیش نواب نے اپنے بعض عمائد کی بے دلی سے اغماض کیا اور ایک زوردار حکمت عملی یہ اختیار کی کہ میر جعفر کو اعلیٰ عہدے پر بحال کیا اور پائے تخت کی حفاظت ایک اور بھتیجے کی شرکت میں عطاء اللہ خاں کے تفویض کر دی۔ ساتھ ہی باغیوں پر چڑھائی کرنے کی زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ نواب کے ایما پر بڑے سرمایہ دار اشخاص مرشد آباد چھوڑ کر گنگا کے دوسری جانب

چلے گئے کہ مرہٹوں کی دسترس سے باہر ہوجائیں۔ ایک سرکاری اعلان میں صاف صاف اعتراف کیا گیا کہ اس وقت میں شہر کو ان ڈکیتوں کے حملے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ پھر چالیس ہزار فوج کے ساتھ گھر کے دشمنوں کی تلاش میں نواب نے کوچ کیا۔ فوج کے واسطے آذوقہ اور ضروری سامان افراط سے فراہم کرکے کشتیوں میں لدوا دیا تھا کہ ان کا بیڑا فوج کے ساتھ ساتھ دریا میں بالائی رُخ بڑھے۔ کوچ کے ساتھ فوج کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا گیا اور ادھر باغیوں کے بڑے سردار نے ایک اور غداری کی حرکت ایسی کی کہ نواب کا آسانی سے اس پر قابو چل گیا۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ باغی پچاس ہزار کی تعداد میں مرہٹوں کی نوکری پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن انھوں نے جو بھاری مطالبات پیش کئے، ان کے متعلق گفتگو کرنے کی غرض سے میر حبیب ان کے پاس آیا۔ شمشیر خاں نے بہت معقول اور مادّی ضمانت سمجھکر انہی کو حراست میں لے لیا۔ اس پر ہنگامہ برپا ہوا اور علی وردی خاں کی فوج پہنچی تو مرہٹے ان باغیوں کا ساتھ چھوڑکر الگ کھڑے ہو گئے۔ نواب دوسرے ہی دن ان کے سر پر آپہنچا۔ سردار خاں مارا گیا۔ باغیوں میں کھلبلی پڑگئی علی وردی خاں کو قریب قریب قتل وخون ریزی کے بغیر فتح کامل حاصل ہوئی۔ باغیوں کا خیمہ وخرگاہ ہاتھ آیا اور وہ بیٹی جسے یہ باغی پکڑ لے گئے تھے، بخیر وسلامت مل گئی۔ مرہٹے تلوار چلائے بغیر بھاگ نکلے اور تھوڑے ہی دن میں کٹک کی معمولی جمعیت چھوڑکر نواب کی حدود سے نکل گئے۔

اب علی وردی خاں نے حتی الامکان کوشش کی کہ ان خانہ جنگیوں اور کشت وخون سے ملک کو جو نقصان پہنچے تھے، ان کی تلافی کی جائے۔ وہ خدا کی رحمت وفضل کی شکرگزاری میں رطب اللسان رہتا اور جس طرح، اڑے وقت میں ساتھ دینے والوں سے داد ودہش سے پیش آیا

اسی طرح مساکین اور مذہبی فرقوں کی خدمت کرنے میں بھی اس نے کوتاہی نہیں کی۔ اس کی یہ فیاضی عین حکمت علی پر مبنی تھی کہ ممتاز باغی سرداروں کے اہل وعیال کو جو گرفتار ہو کر آئے تھے، عزت اور حفاظت سے ان کے پسماندوں یا ہمدردوں کے پاس بھیج دیا۔ اسی قسم کے برتاؤ سے اس نے میر حبیب کو بھی دوبارہ اپنا بنانا چاہا تھا جو پرانا نمک حرام اور بھونسلے کی نوکری میں کارہائے نمایاں انجام دیتا رہا تھا، لیکن اس میں نواب کو کامیابی نہ ہوئی۔

آیندہ موسم میں وہ پھر میدان میں نکلا اور مرہٹوں کا جگہ جگہ تعاقب کرتا پھرا۔ اگرچہ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ انھیں بنگالے میں ٹکنے نہیں دیتا لیکن اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اِدھر اسی مصروفیت میں پریشانی کی ایک تازہ صورت یہ پیدا ہوئی کہ بدمزاج اور نالائق نواسے نے سرکشی کی حالانکہ وہی ریاست کا وارث قرار دیا جاچکا تھا۔ بوڑھے نواب کو فرط محبت میں اپنی تکلیف یا نقصان سے بڑھکر نواسے کی فکر تھی۔ بارے یہ بغاوت بلا دقت فرو کردی گئی اور باغی نواسے کو کوئی گزند بھی نہ پہنچا (اُس کی اس سلامتی کو بھی ہندوستان کے مستقبل کے حق میں خاص اہمیت حاصل ہے) پھر چند ہی روز میں نواب نے اسے دوبارہ اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا اگرچہ اُس نے اپنے اقتدار سے وہ کام لیا جو خود اس کی عاجلانہ اور ذلت آمیز تباہی کا سبب بن گیا۔

مرہٹوں سے کچھ مدت اور معرکہ آرائی کے بعد آخر کار چند معین شرطوں پر مصالحت کی ایک صورت یہ نکل آئی کہ کٹک اُن کے حوالے کردیا گیا اور بنگالے کی چوتھ کے عوض میں سالانہ بارہ لاکھ روپیہ ادا کرنا قرار پایا (۱۷۵۱ء) گویا علی وردی خاں کو میدان جنگ میں مسلمہ غلبے اور اپنی پیرانہ سالی[۱] میں بھی کمال قوت و مستعدی کے باوجود، اپنے ہمعصر صوبہ دار دکن کی تقلید

---

[۱] وہ اس وقت اٹھہتر (۷۸) سال کا تھا۔

کرنی پڑی اور مختلف دشمنوں کے پے در پے حملے روکنے کے باوصف، اگر گردن نہ جھکی تو کم سے کم اِن اڑیل اور لالچی دشمنوں کے لئے تھیلی کا منہ کھولنا اور اپنے ملک میں ایک چھاؤنی ڈالنے کی اُسے اجازت دینی پڑی۔

اس مصالحت کے بعد سے وہ امن و فراغت کے ساتھ حکومت کرتا رہا اگرچہ مستقبل کی خلش ضرور رہتی تھی۔ اپنے نواسے کی طبیعت کو وہ خوب پہچانتا تھا لیکن جب بوڑھا ہوگیا اور اجل نے زیادہ لائق عزیزوں کو ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا، تو معلوم ہوتا ہے پھر اس نواسے کو محروم کر دینے کی اس میں ہمّت نہ رہی یا ممکن ہے اُسے خوف ہو کہ ایسا کرنے میں پھر جانشینی کے واسطے کوئی تازہ جنگ کی آفت بپا ہوجائے گی۔ علی وردی خاں نے ہندوستان میں فرنگیوں کے ترقی کرنے کی بھی صاف الفاظ میں پیشین گوئی کی تھی لیکن انگریزوں سے اختلافات کے باوجود اُس نے انھیں جبراً نکال دینے سے انکار کردیا۔

علی وردی خاں کا نظم و نسق معلوم ہوتا ہے، اعلیٰ درجے کا تھا۔ حصول حکومت کے لئے اُس نے جو کارروائی کی وہ مشتبہ نوعیت رکھتی ہے۔ بھاسکر اور اس کے ساتھی سرداروں کو مہمان بلا کے مارنا یقیناً سخت دغابازی تھی لیکن ان واقعات کو چھوڑ کر، اس کا طرز عمل، جہاں تک معلوم ہے، ہمیشہ دیانت، خدا ترسی، فیاضی اور آشتی کا رہا۔ ہمعصر سوانح نگار نے اس کی سیرت اور معاشرت کی بہت دلچسپ کیفیت لکھی ہے، اور اس اعتبار سے کہ علی وردی خاں اُس ممتاز عہد کے سب سے ممتاز افراد میں تھا، یہ لاجواب قلمکاری اتنی طویل بھی نہیں ہے کہ اسے نقل کرنے میں تامل کیا جائے۔ وہ یہ ہے:—

"مہابت جنگ (علی وردی خاں) نوجوانی سے شراب و افیون، شاہد و مطرب وغیرہ مشاغل عیش و نشاط کا دلدادہ نہ تھا۔ وہ صوم و صلواۃ کا پابند اور جملہ منہیاتِ شرعی سے اجتناب کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ طلوع آفتاب سے دو گھنٹے قبل بیدار ہوتا اور

وضوا ور نماز کے بعد مخصوص ندیموں کے ساتھ بیٹھکر قہوہ پیتا۔ طلوع آفتاب کے بعد اجلاس عام شروع ہوتا جس میں فوجی سردار، دیوانی عہدہ دار اور ہر حیثیت کے آدمی کو جو عرضی پیش کرنا چاہے، آنے کی اجازت تھی کہ حاضر ہوکر اپنا مطلب بیان کریں اور اس کے فیض عام سے فیضیاب ہوں۔ دو گھنٹے کے بعد وہ تخلئے کے کمرے میں چلا آتا اور یہاں صرف وہ لوگ حاضر ہوتے جن کو نواب نے بلایا ہو۔ ان میں عموماً اس کے بھتیجے شہامت جنگ اور صولت جنگ۔ نواسہ، سراج الدولہ اور خاص احباب ہوتے تھے۔ اس صحبت میں شعر خوانی ہوتی یا تاریخ و محاضرات پڑھکر سنائے جاتے۔ بعض اوقات نواب دل بہلانے کے لئے بکاولوں کو بلاکر خود انھیں ہدایتیں بھی کرتا اور وہ اس کے ذوق و پسند کے کھانے پکا پکا کر پیش کرتے تھے۔ اگر ضرورت ہوتی تو مختلف محکموں کے حاکم بھی احکام لینے کی غرض سے حاضر ہوجاتے پھر دستر خوان بچھتا اور بہت سے لوگ اس کے خوانِ نعمت سے بہرہ مند ہوتے۔ کھانے کے بعد لوگ استراحت کے لئے اٹھ جاتے۔ اس وقت میں کوئی نہ کوئی داستان گو ضرور حاضر رہتا اور دلچسپ قصص و حکایات نواب کو سناتا۔ پھر عموماً نصف النہار سے ایک گھنٹے بعد وہ اٹھتا اور ظہر کی نماز پڑھکر چار بجے تک قرآن شریف کی تلاوت کرتا۔ پھر عصر کی نماز پڑھتا اور تھوڑا سا برف یا شورے میں لگا ہوا ٹھنڈا پانی پی کر علما سے ملاقات کرتا جن کی صحبت میں وہ روزانہ ایک گھنٹہ گزارتا اور مسائل شرعی پر ان کی بحث و گفتگو سنتا جو وہ لوگ نواب کی واقفیت کے لئے کیا کرتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مال کے عہدہ دار نواب کے ساہوکار جگت سیٹھ کے ساتھ حاضر ہوتے۔ دہلی اور سلطنت کے ہر صوبے کی اطلاعیں، نیز خود اس کے ملک کے ضلع ضلع کی خبریں سنائی جاتیں اور نواب اپنے عاملوں کو حسب ضرورت احکام دیتا تھا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزرتا اور بعض اوقات قریبی رشتہ داروں کو بھی آنے کی اجازت مل جاتی۔ تا آنکہ غروب آفتاب کے ساتھ روشنیاں اور کچھ نقال اور مسخرے حاضر ہوتے اور اپنی حاضر جوابی اور ہنسی دل لگی کی باتوں سے کچھ دیر

دل بہلاتے تھے ۔ پھر وہ نماز کے لئے اندر چلا جاتا اور نماز کے بعد نو بجے تک محلسرا میں کنبے کی بی بیوں اور بیگمات سے ملتا۔ نو بجے یہ سب بی بیاں رخصت ہو جاتیں اور جن لوگوں کو اس سے کام ہوتا، وہ باریاب ہوتے یہاں تک کہ وہ عموماً جلد اور بغیر کچھ کھائے سونے کے لئے چلا جاتا۔ اس طرح ہر کام کا وقت مقرر تھا اور وہ اسی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ عزیزوں، دوستوں، پرانے ملاقاتیوں پر اس کی نوازش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کے سابقہ اور مفلسی کے زمانے کے دوست آشنا، خصوصاً وہ لوگ جنھوں نے اس کے ساتھ لڑکپن میں جب وہ دہلی میں بُرے حالوں بسر اوقات کرتا تھا، ذرا سی بھی مہربانی کی تھی، ان کے ساتھ کمال فیاضی سے پیش آتا اور انھیں یا ان کی اولاد کو اپنے دربار میں بلا کر وہ نوازشیں کرتا جو ان کی توقع سے بڑھکر ہوتی تھیں جب تک وہ زندہ رہا اس کی نرمی اور شفقت سے عام رعایا کے ساتھ بھی ایسی خبر گیری اور رضاجوئی کا برتاؤ ہوتا تھا کہ شاید ماں باپ بھی اس سے بڑھکر رعایت نہ کریں گے اور اسی کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمین وعمال بھی اس کی ملازمت میں مالا مال ہو گئے۔ ہر معاملے میں وہ رائے صائب رکھتا اور ہر فن یا پیشے کے قابل قدر آدمی کی قدر دانی کرتا تھا۔ خلیق و متواضع، معاملاتِ ملکداری میں عاقل، بہ حیثیت سپہ سالار دلاور، غرض کہ وہ جملہ اوصاف حمیدہ سے متصف تھا۔ (منقول از ڈاسکائنس دکھن۔ مصنف)

بابِ نہم

مرہٹوں کے جتھے کی نشو ونما

مرہٹوں کے پیشوائے اعظم باجی راؤ اول کی وفات تک ہم ان کی ترقی پذیرفت کے حالات تحریر کر چکے ہیں۔ اس کے بعد پھر تاریخ کا رُخ بالکل بدل جاتا ہے۔ آئندہ بیس سال (سنہ ۱۷۴۰ء تا سنہ ۱۷۶۱ء) یعنی سیواجی کی قوم پھولتی پھلتی اور اپنے عمل اور تسلط کا دائرہ وسیع کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح مرہٹوں کا یہ عروج اُس وقت تک مسلسل ہے، جب کہ باجی راؤ کا بھتیجا اس دار السلطنت (دہلی) پر یورش کرتا خود ہو "بادشاہ گر" بننے کا دعویٰ بلکہ یہاں تک منصوبہ کرتا ہے کہ خطاب شہنشاہی کو اپنے گھرانے میں منتقل کر لے۔

ان واقعات کے وقت بالکل نئے اشخاص اسٹیج پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مرہٹہ رئیسوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی پہلی سی نہیں رہتی بلکہ بالکل بدل جاتی ہے۔ حسد ونفاق کے جراثیم کو وشوا ناتھ کی گہری چالیں بھی کہ کسی طرح پورے جتھے میں اشتراک مقاصد پیدا کر دیا جائے، دور نہ کر سکی تھیں، لیکن اب یہ جراثیم خطرناک قوت پکڑنے لگتے ہیں۔ ہر چند نیا پیشوا اپنے اقتدار کو قائم رکھتا ہے مگر اس کے لئے بار بار اور بہت اڑیل حریفوں سے نبرد آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ وہ کبھی مصلحت وقت کی بنا پر مصالحت۔ اور کبھی پُر فریب چالوں سے کام نکالتا ہے۔ یہ طرز عمل برہمنوں کے مشہور مذاق وعادت کے تو زیادہ مطابق تھا

باب نہم

لیکن اس کے پیشرو باپ کے علانیہ تفوق اور جرات سے اتنی مناسبت نہ رکھتا تھا۔
مرہٹہ سرداروں کی اس نئی نسل کے میدان میں آنے کے ساتھ معاملات کی صورت بھی بہت کچھ بدلی اور پیچیدہ ہو گئی کیونکہ مشرقی ساحل پر فرنگیوں کا دخل ہو گیا۔ دوپلے نے اپنا جال پھیلایا۔ بُسی نظام دکن کا مددگار بن گیا اور انگریزوں نے بھی سیاسی معاملات میں حصہ لینا شروع کیا۔ انھوں نے ابتدا میں بہت سستی کی لیکن پھر مقابلے میں ڈٹ گئے اور سخت کوشش کی بدولت بالآخر کامیاب ہوئے۔ ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ نادر شاہ کے شاگرد احمد شاہ ابدالی شاہ کابل نے اپنے اُستاد سے جو سبق سیکھا تھا، اسے دہرانا شروع کیا اور اس نئے افغانی حملہ آور سے سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ شمال کے مسلمانوں کی فوجیں اس کی سرگروہی میں مجتمع اور مرہٹہ قوت کے جزو اکبر سے ایک فیصلہ کن مقابلے پر صف بستہ ہو گئیں۔ شدید بیم و رجا کے وقفے کے بعد، جو اس یوم کبیر کے شایان شان تھا جس پر اس عظیم الشان معرکے کا فیصلہ منحصر تھا، ان کی پوری ایک صدی کی غارتگری کی تاریخ کا رُخ چند گھنٹوں میں اِدھر سے اُدھر پلٹ گیا۔ مرہٹوں کے قشون قاہرہ کو شاہ ابدالی نے تہ و بالا بلکہ تقریباً نابود و بے نشان کر دیا اور اس نو سر کی بلا (Hydra) پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ گو اس کے علٰحدہ علٰحدہ سر بعد میں بھی اُبھرے لیکن مجموعی طور پر وہ بلا کبھی پنپ نہ سکی اور پھر کبھی اس قابل نہ ہوئی کہ اسی عام تحکم کا لب و لہجہ اختیار کر لیتی جو کچھ مدت سے اس نے اختیار کر لیا تھا۔

اپنی وفات (اپریل ۱۷۴۰ء) سے کچھ روز پہلے باجی راؤ نے کرناٹک پر چڑھائی کرنے اور وہاں کے محاصل سے کام لینے کی منظوری دی تھی۔ اس کا حریف سری پت راؤ بہت پہلے یہ مشورہ دے چکا تھا۔ پیشوا نے بھی اب اسے قبول کر لیا، لیکن اس کے نتائج محض کرناٹک کی فتح و زرستانی تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے سیاسی بساط ہی کا رنگ بدل گیا کیونکہ اسی فوج کشی کے سلسلے میں فرانسیسی اور پھر ان کے سبب سے انگریز میدان میں آ گئے۔ میں اس یادگار فوج کشی کے واقعات کو بہت ہی مختصر طور پر بیان کروں گا کیونکہ اس وقت مرکوز خاطر یہ ہے کہ مرہٹوں کی دراز دستی کے تار و پود کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ اسی کے ساتھ چند امور پر خاص توجہ کرنی ضروری ہے کہ اگر ان کو صاف طور پر نہ سمجھ لیا جائے گا تو اوراق کی مستند تاریخ ناقص رہ جائے گی اور غلط فہمی

باب نہم

میں بھی مبتلا کردے گی۔

یہ بات کہ اُس نے حملہ آوروں کی تعداد کا تخمینہ اصل سے دُگنا بتایا ہے کچھ خلاف معمول نہیں ہے اور اس کا سبب یقیناً یہ ہے کہ اہل ہندوستان کسرت چھوڑ دیتے ہیں اور بلا لحاظ صحت "ایک لاکھ جوان" کا جملہ ان کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی سے اورم نے غلطی کھائی جیسا کہ اور موقعوں پر بھی لوگ اسی وجہ سے غلطی کر چکے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اُس نے یہ فوج کشی نواب نظام الملک کے حکم سے نہیں تو اجازت سے ہوئی، تحریر کی ہے اور یہ بھی منجملہ اور مثالوں کے ایک مثال ہے کہ اس قابل ستائش مورخ کے اقوال میں دکھن کی سیاسی حالت اور وہاں کی حریف حکومتوں کے باہمی تعلقات کے متعلق بالکل غلط خیال پایا جاتا یا ان سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

چونکہ انگریز دوپلے کے اس دعوے سے کہ دکن کا جنگ جو صوبہ دار مجھے قانونی طور پر اس علاقے کی حکومت تفویض کر چکا ہے، بہت پریشان ہو رہے تھے اور ساحلی جنگ میں جو خلاف معاہدہ طرز عمل انھیں اختیار کرنا پڑا، اس کی وجہ سے بھی خود ہی سٹ پٹائے ہوئے سے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ ان کا حق بھی کسی ایسی ہی سند پر مبنی ہو جائے۔ چنانچہ جب نواب نظام سے مفاہمت میں کامیابی ہو گئی، تو انھوں نے زیادہ شد و مد سے کوشش کی کہ دوپلے کی مثل انھیں بھی صوبہ دار دکن کی طرف سے کوئی سند مل جائے

غرض، اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ کرناٹک کے اس حملے کے متعلق اورم کا بیان بہت ہی بے محل ہے۔ پھر اس کے چند ہی مہینے بعد باجی راؤ دکن کا سارا علاقہ فتح کرنے کی فکر میں تھا اور اگر ناصر جنگ کی طرف سے خلاف عادت سرگرمی کا اظہار نہ ہوتا تو اس منصوبے کی کامیابی میں بھی کچھ ہی کسر رہ گئی تھی۔ دوسرے، جس وقت حملہ ہوا ٹھیک اس وقت، مرہٹوں کو قابو میں رکھنا تو ایک طرف، نظام الملک خود اُسی بیٹے کی بغاوت کے آثار دیکھ کر سخت متردد ہو رہے تھے۔

یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب سے سنتاجی گھورپڑے کو پیشوا نے کمینہ پن سے قتل کرایا، اس کی اولاد حکومت ستارا سے بالکل الگ اور بے تعلق رہی تھی (سنتاجی آزادی کی جنگ میں راجا رام راجا کا بڑا جیوٹ مددگار تھا) لیکن اس موقع پر پہلی دفعہ سنتاجی کے بھائی کے پوتے مرار راؤ نے ساہو کی حکومت تسلیم کی اور کرناٹک

کے اس حملے میں شریک کار ہوگیا جس کا فائدہ بھی آخر میں سب سے زیادہ اسی کے حصے میں آیا۔ شرکت کرتے وقت اس نے موروثی حق کی بنا پر سپہ سالار بنائے جانے کا مطالبہ کیا تھا لیکن پھر تنگ بھدرا کے قریب چند پرگنوں کے عوض میں اس حق سے دست بردار ہوگیا۔

جملہ افواج کی قیادت رگھوجی بھونسلے کو دی گئی۔ پیشوا کا منشا تھا کہ یہ منصب دے کر بھونسلے کی ہوس جاہ کی تشفی کر دی جائے کہ شمالی علاقے میں دست درازی اور فتنہ پردازی کے جو منصوبے بھونسلے سوچ رہا تھا، اُن سے ہٹ کر اس کی توجہ کرناٹک کی طرف بٹی رہے، لیکن ان شخصی مصالح سے قطع نظر، مجموعی طور پر دیکھیے تو یہ فوج کشی پوری طرح قومی تھی۔ وشواناتھ کی تدبیریں تمام مرہٹہ سرداروں کو زرستانی کی غرض سے ایک متحد جماعت بنا دینے کا جو پہلو رکھتی تھیں، کرناٹک کی اس فوج کشی میں اس کی بہت اچھی مثال نظر آتی ہے۔ چنانچہ سپاہیوں میں راجہ، پیشوا اور بھونسلے کی مختلف جمعیتوں کی جس قدر تعداد تھی، اسی قدر کثرت سے دوسرے سرداروں کے سپاہی بھی موجود تھے۔

جنگ کے نتائج حیرت خیز اور فیصلہ کن ہوئے مگر ان کی تہ میں اسباب کا کوئی تسلسل نہ تھا۔ ارکاٹ کا بوڑھا اور مضبوط نواب دوست علی مغلوب و مقتول اور اس کا وزیر میر اسد گرفتار ہوا۔ سارے علاقے سے نذرانہ وصول کیا گیا، لیکن نواب کا فرزند صفدر علی بچ کر نکل گیا گیا اور داماد چندا صاحب ترچناپلی میں قلعہ بند رہا۔ اس شہر پر اُس نے انھی دنوں دغا سے قبضہ کیا تھا اور شروع میں مرہٹے اسے فتح کئے بغیر ہٹ گئے لیکن دوبارہ محاصرہ کیا اور سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث آخر کار وہ مسخر ہوگیا (۱۷۴۱ء) چندا صاحب جس نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا تھا، رگھوجی کے پاس برابر سات سال تک قید رہا حتیٰ کہ وہ پلے نے اسے فدیہ دے کر چھڑایا اور اپنی حرص و آز کا آلۂ کار بنایا۔

مرارراؤ کو ترچناپلی کا حاکم بنا دیا گیا تھا۔ مگر قلعے میں جو فوج متعین تھی اس میں ایک حصہ پیشوا کے سپاہیوں پر مشتمل تھا اگرچہ انھیں راجہ (ساہو) کے خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ اور صوبے کی آمدنی کا ایک حصہ بھی باجی راؤ کے فرزند اور جانشین کے نام کر دیا گیا تھا۔ اس انتظام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ اور فتح مشترکہ نوعیت رکھتے تھے۔

یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ مغلوں پر مرہٹوں کی اس تازہ فتح میں بڑی آسانی اس وجہ

باب نہم

سے پیدا ہوئی کہ ان مسلمان امیروں میں باہمی حسد و نفاق تھا اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ یہ بھی سب کو اقرار ہے کہ دوست علی پر اچانک حملہ ہوا مگر وہ بڑے استقلال سے لڑا۔ البتہ چندا صاحب کے متعلق اختلاف ہے بعض تاریخوں میں یقین دلایا گیا ہے کہ وہ وفاداری سے نواب کی امداد کے لئے بہ عجلت بڑھ رہا تھا اور بعض مورخ بیان کرتے ہیں کہ یہ چالاک سیاسی شاطر اپنی ذاتی مقاصد کی خاطر جنگ کے میدان سے دور ہی دور رہا۔ اسی طرح گو یہ قریب قریب یا پوری طرح ثابت ہے کہ صفدر علی نے میر اسد کی وساطت سے دشمن کے ساتھ صلح ہی اس طرح کی کہ مرہٹہ فوجوں کا رُخ ترچناپلی اور اپنے پُرہوس بہنوی کی طرف پھیر دیا۔ لیکن بعض مصنف یہاں تک بڑھے ہیں کہ صراحتہً یا کنایتہً بیان کرتے ہیں کہ یہ فوج کشی صفدر علی کے اِغوا سے ہوئی کیونکہ صفدر اس تکلیف وہ اور چیرہ دست بہنوی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا جس کی مخالفت نواب دوست علی کو بھی یا تو منظور نہ تھی اور یا وہ چندا صاحب کے اقدام سے ڈرتا تھا۔ ان ریشہ دوانیوں کی اصلیت بجائے خود کچھ اہمیت نہیں رکھتی لیکن انھی کی بدولت بڑے اہم واقعات رُونما ہوئے اور اس لئے ان کا مختصر سا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوا۔

اسی کرناٹک کی فوج کشی کے دوران میں پیشوا نے وفات پائی اور اپنے بیٹے بالاجی باجی راؤ کو وارث چھوڑا جسے اس کے ہم وطن عام طور سے نانا صاحب کہتے تھے۔ وہ اپنے باپ کا جانشیں ہوا اگرچہ اس کی تھوڑی بہت مخالفت ضرور ہوئی۔

واضح رہے کہ برہمن پیشواؤں کی برتری کو دوسرے خاندانوں کے مرہٹہ سردار شروع سے بُری نظروں سے دیکھتے تھے۔ سندھیا اور ہلکر تو اُس پیشوائی خاندان کے جس کی بدولت انھیں عزت و شہرت ملی، ابھی تک پکے رفیق تھے لیکن مقتول ترمبک وھبڑے کا گروہ ابھی تک موجود تھا اور تلوار کے اُس معاکے سے جس میں ان کا سرگروہ ہلاک ہوا، رضامند نہ ہوا تھا۔ سری پت راؤ جسے مہاراجہ کی شبیہ صادق" کا خطاب حاصل تھا، باجی راؤ کا برابر حریف رہا۔ بعض پرانے اور ممتاز خاندان اِن برہمن پیشواؤں کے عروج میں بتدریج پست و بے وقعت ہوتے جاتے تھے۔ گائکواڑ کو اسی زمانے سے مرہٹہ جتھے کے زوال تک، گجرات میں اپنے اور پیشوا کے حقوق کے متعلق، برابر اختلاف رہا اور ادھر سب سے قوی طالبِ جاہ اور بے چین مرہٹہ سردار، رگھوجی بھونسلے بار ہا، حکومت ستارہ

میں باجی راؤ کی سیادت کا حق تسلیم نہ کرنے پر مائل نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب پیشوا نے نواب نظام الملک کو شمال میں شکست دینے کی بڑی بھاری تیاری کی تو اس وقت بھی بھونسلے نے اس جنگ آزما مدبر کی مدد کرنے سے پہلو تہی کی۔ پھر نواب نظام الملک کے اپنے صوبے فتح کرنے کے منصوبے میں پیشوا کو ناصر جنگ کے مقابلے میں جو دوبارہ خفت اٹھانی پڑی تو غالباً اس ناکامی کا بھی ایک اہم سبب بھونسلے ہی کا مبہم طرز عمل تھا۔ کرناٹک کی فوج کشی کے وقت اس کی مخالفت دُور کرنے کی غرض سے لطریق رشوت اُسے سپہ سالاری دے دی گئی تھی لیکن باجی راؤ کا مزاسنتے ہی وہ فوج کو چھوڑ کر بسرعت ستارا آیا اور پیشوا کے عہدے کے لئے ایک اور حریف تیار کر لیا۔ عیاری یہ کی کہ بابوجی نائک کو جو خود اس کا گرگا اور بہت دولتمند تھا، امیدوار نامزد کیا۔ نائک کا بہت سارا روپیہ متوفی پیشوا پر قرض تھا اور بھونسلے کو امید تھی کہ اس کی امیدواری سے بالاجی باجی راؤ بڑی پریشانی میں پھنس جائے گا۔ قرضخواہ کو اچھی طرح سکھا پڑھا دیا تھا چنانچہ اس نے فوراً حساب چکا دینے کا تقاضا کیا۔ متوفی باپ کے قرض سے انکار کرنا دیسیوں کے آئین شرافت کی رو سے نہایت شرمناک ہے اور خصوصاً اس موقع پر تو پہلو بچانے کا خیال بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ اُدھر بالاجی کو رقم ادا کرنے کی استطاعت نہ تھی۔ راجہ (ساہو) کو بھی اسی فریق مخالف (یعنی بابوجی) کی طرف سے ایک بڑی رقم پیش کی گئی تھی بشرطیکہ وہ باجی راؤ کے بیٹے کے موروثی حق کو مسترد کر دے۔

لیکن سری پت راؤ کو اپنے متوفی رقیب کے بیٹے سے اتنا حسد نہ تھا جتنا رگھوجی بھونسلے سے دوسرے متوفی پیشوا کے لائق بھائی چمناجی اپانے بھتیجے کی حمایت میں پوری قوت سے کوشش کی۔ بالاجی کو اپنے دیوان کی وساطت سے معقول رقم فراہم کرنے کا بھی موقع مل گیا۔ آخر اس کے ذاتی اوصاف اور شہرت، باپ دادا کی خدمات اور نام اور سب سے بڑھ کر اہل مشرق کی جبلی وراثت پسندی کا میلان بازی لے گیا۔ جانشینی کے بارے میں نئے پیشوا کو اس پہلے خطرے سے کہ کوئی اور حریف اس کے باپ کی جگہ لے لے گا، نجات مل گئی لیکن ابھی اسے اور مخالفت سے سابقہ پیش آنا تھا اور ان دوسرے مقابلوں میں وہ ایسی نیکنامی سے کامیابی حاصل نہ کرسکا جیسی مذکورۂ بالا قضیے میں اُسے میسر آئی تھی۔

نواب نظام الملک کے ساتھ اس نے نہایت دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور ناصر جنگ کے مقابلے میں اسے مدد دی۔ ناصر جنگ کی مخدوش بغاوت جلد فرو کر دی گئی

باب نہم

(سنہ ۱۷۴۱ء) اور مدد کے عوض میں نواب نظام نے پیشوا کی اس درخواست کی تائید کی کہ شہنشاہ دہلی مالوے کا انتظام پیشوا کے تفویض کر دے۔ درخواست کے بھیجنے کے چند ہی روز بعد چمناجی اپا جو اس کوشش میں شریک تھا، فوت ہو گیا۔ یہ دُہرا نقصان تھا کیونکہ اس کی پشت پناہی بھتیجے کے حق میں نہایت گراں قیمت چیز تھی اور دوسرے اس کا بیٹا سداشیو راؤ جوان دنوں دس برس کا لڑکا تھا، باپ کی تربیت سے محروم رہ گیا اور اس کے مزاج میں وہ بے جا غرور و جسارت نشوونما پانے لگی جس نے آخر میں خود سداشیو، اس کے عم زاد بھائی (یعنی پیشوا، بالاجی) اور ساری قوم کو تباہ کر دیا۔

آئندہ چند سال کے واقعات مرہٹہ قوت کے متضاد اجزائے ترکیبی اور مختلف اور عجیب نوعیت کا دلچسپ و مفصل مرقع پیش کرتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ قوت محض زرستانی اور فوجی قبضے کا آلہ تھی جب اور جہاں موقع ملا وہ ہندوستان کے صوبوں سے جبراً روپیہ وصول یا ان پر قبضہ کرتی گئی آج جس علاقے پر چڑھی تھی کل اسی کو آگے بڑھنے کی منزل بنا لیا۔ قطع منازل کی سہولت کے علاوہ، مرہٹے اس واقعے کو باضابطہ حق کی صورت میں بھی اپنے فائدے کے لئے خلط ملط کرتے رہے۔ یعنی ایک فصل کا ناجائز نذرانہ پہلے حسب توقع پھر حسب معمول اور آخر چند ہی سال میں آئندہ سنین کا باقاعدہ محصول بن جاتا۔ اس پر بھی، زمانۂ قدیم کے عیار و تراشخانوں منشیوں کی طرح یہ مطلب ہوشیار اور جمتی مرہٹے اس وقت تک چین نہ لیتے تھے جب تک کہ سابقہ ملکی انتظام سے اپنے تعلقات استوار نہ کرلیں اور اپنے آزاد پرچم کے پرے پر فرمان شاہی کا جھنڈا نہ چڑھالیں۔ مثلاً سیواجی نے اورنگ زیب سے خاص خاص اضلاع میں چوتھ لینے کا حق مانگا اور اسے اپنے باپ کے قدیم اصلی یا مزعومہ حقوق پر (جو اسے قدیم تر افغان حکومتوں کے زمانے میں حاصل تھے) مبنی کیا تھا۔ اسی طرح اپنے واقعی علاقے اور بہت سے دلپسند قلعوں کو اس شرط پر خوشی سے بادشاہ کے حوالے کر دیا کہ باقی ماندہ علاقے پر اس کو باضابطہ راجہ مان لیا جائے گا۔ اسی اصول پر سیواجی کے جانشین بھی برابر عمل کرتے رہے۔ چنانچہ زیر نظر زمانے میں پیشوا نے رگھوجی کی بنگالے میں دست درازی روک کر شہنشاہ سے صوبۂ مالوہ کی باقاعدہ سند حاصل کرلی جس پر بہت دن سے دانت تھا۔ اگرچہ بدنامی سے بچنے کے لئے دربار شاہی نے ظاہراً پیشوا کو شہزادۂ احمد (خلف محمد شاہ) کا صرف نائب مقرر کیا (سنہ ۱۷۴۳ء)۔ اس

باب نہم

عطیے کی خاص خاص شرطیں یہ تھیں کہ پیشوا ان اضلاع میں امن و انتظام رکھے گا۔ معافی اور جاگیر کی اراضی کو جو مذہبی مقاصد کے لئے وقف ہوں، ضبط نہ کریگا۔ دوسرے کسی مرہٹہ سردار کو نربدا کے پار نہ اُترنے دے گا اور بادشاہی سپاہ کے لئے ایک معقول جمعیت فراہم کرے گا۔ ان میں سے کئی شرطوں کی بجا آوری کے لئے اب بالاجی نے دھار کے پوار راجہ سے جو ترمبک کی طرف سے متوفی پیشوا کے خلاف صف آرا ہوا تھا، مصالحت کرلی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یہ راجہ مغرب میں گائکواڑ اور مشرق میں بھونسلے کے درمیان سد کا کام دے۔

مالوے سے بھی زیادہ اہم اور، سرگوں مغل کے حق میں، ذلت بخش رعایت یہ تھی کہ باقی ماندہ اُن سب صوبوں میں بھی، جن تک مرہٹوں کے قدم محض اتفاقاً پہنچے تھے، چوتھ کا عام حق عطا کیا گیا (۱۷۴۳ء)۔ عام حق، اس اعتبار سے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کسی باضابطہ سند کی صورت میں قلمبند نہیں ہوا تھا اور نیز اس لئے کہ یہ عطائے شاہی کسی خاص مقام سے مخصوص نہ تھی بلکہ بظاہر مرہٹوں کے عام طریق عمل کی ایک ہمہ گیر توثیق تھی۔ مگر مرہٹوں کے دعاوی کی پیچیدگی اور متضاد نوعیت یہیں ختم نہیں ہوتی۔ طرفہ تر بات یہ تھی کہ گو راجہ کا نظم ونسق میں عملاً بہت ہی کم اقتدار باقی رہ گیا تھا، پھر بھی مرہٹہ قوم پر اس کی فرماں روائی اور مغلیہ صوبوں اور ان کی مالگذاری کو جس طرح چاہے کام میں لینے کا حق بے تکلف تسلیم اور کمال خوش اعتقادی سے قائم رکھا جاتا تھا۔ ہر فوج کشی کے بعد پیشوا سالانہ حسابات اور آمد و خرچ کا تفصیلی گوشوارہ پیش کرتا، اور جب کبھی (جیسا کہ رگھوجی کے جھگڑوں میں ہوا) وہ اپنے مفوضہ اختیارات یا محصول گزار اضلاع میں اپنی حدود سے تجاوز کرتا تو فریق مقابل سے خود کوئی فیصلہ کرلینے کے بعد اسی کے مطابق اکثر راجہ سے حکم بھی حاصل کرلیتا تھا، اور یہ مصنوعی مگر مفید مطلب سند فریقین کے دعاوی کا تصفیہ کرنے یا حسب ضرورت ان کے حقوق میں قطع و برید کرنے کے کام آتی تھی، آخر میں، یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ مرہٹہ رئیسوں، جاگیرداروں کے باہمی معاہدے یا فعل، راجپوت وغیرہ متعدد اقوام میں سے، جو سلطنت مغلیہ کی وسیع حدود میں آباد تھیں، کسی مقتدر امیر سے عہد و پیمان کا بھی اثر پڑتا تھا اور انتزاع سلطنت کے دور میں اس قسم کے معاہدے مرہٹوں کی عجیب قوم کے سیاسی اور معاشری تعلقات میں ردّ و بدل، پریشانی اور اکثر سخت خلفشار پیدا کردیتے تھے۔ مثلاً، جب رگھوجی نے بنگالے پر لشکرکشی کی تو پیشوا نے پوری قوت سے اس کی مخالفت کی اور دربارشاہی نیز علی وردی خاں

باب نہم

کو اپنا ممنون بنایا، لیکن تھوڑے ہی دن بعد ستارا میں اس کے خلاف ایک تازہ سازش ہوئی جس کا سرگروہ بھونسلا تھا، تو اس وقت اسی پیشوا نے بھونسلے سے یہ معاملت کرلی کہ جہانتک علی وردی خاں کے علاقے کا تعلق ہے، نربدا اور مہاندی کے شمال میں جو حقوق پیشوا کو حاصل تھے، وہ رگھوجی کو حاصل ہو جائیں گے اور اس طرح رگھوجی کو اپنے منصوبے پورے کرنے کے لئے آزاد اور بے فکر چھوڑ دیا۔ (سنہ ۱۷۴۴ء)

یہ درحقیقت ایک نئی قرارداد تھی جیسے سابق میں ایسے ہی معاملے کے لئے نواب نظام الملک اور متوفی پیشوا کے درمیان طے ہوئی تھی جس میں فریقین نے حسب مراد کمی بیشی کرلی تھی، لیکن اس موقع پر معاہدے کو باضابطہ بنانے کی غرض سے راجہ کی منظوری بھی شریک کر لی گئی اگرچہ یہ معاملت کرتے وقت مغل شہنشاہ سے جو عہد کیا تھا اور جس شرط پر مالوے کی حکومت تفویض ہوئی تھی کہ پیشوا شمالی صوبوں میں کسی دوسرے مرہٹہ سردار کو نہ آنے دے گا، اس کی بالاجی نے صریحاً خلاف ورزی کی۔

جیساکہ اوپر بیان ہوا باجی راؤ کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد سیاسی دنگل کے اکثر پہلوان اٹھنے لگے اور بالکل نئے لوگوں نے ان کی جگہ لی۔ وہ سنہ ۱۷۴۰ء میں مرا۔ اگلے سال اس کے بھائی چمناجی نے قضا کی، اور جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں، اس وقت چمناجی کا نوعمر بیٹا سداشیوراؤ ملکی معاملات میں خوب حصہ لینے لگا تھا۔ سنہ ۱۷۴۶ء میں اسے اپنے عم زاد بھائی (پیشوا) کے تحت میں راجہ نے قومی افواج کا نائب سپہ سالار مقرر کیا۔ مگر وہ تو صرف دکن میں فوجی اور دیوانی دونوں محکموں میں نمایاں خدمات انجام دے رہا تھا، اور خود پیشوا کے بھائی رگھوناتھ نے (جسے انگریز عام طور پر رگھوبا کہتے ہیں) ہندوستان میں اپنی وہ زندگی شروع کی جو دوری امید و آرزو، بے جا حوصلہ مندی اور تباہ کن ناکامیوں پر مشتمل تھی۔ باجی راؤ کا حریف سری پت سنہ ۱۷۴۷ء میں فوت ہوا لیکن پرانے رجال سیاسی کو ختم اور نئے ارباب سیاست کی پود کو میدان میں لانے والا، سب سے بڑھ کر سنہ ۱۷۴۸ء کا سال تھا۔ اس سن میں افغان فرماں روا احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر پہلا حملہ ہوا۔ اسے وزیر سلطنت کے بھتیجے نے دعوت دی تھی وہ پنجاب میں بڑھا مگر شہنشاہ کے فرزند اور حملہ آور کے ہم نام شہزادہ احمد نے اسے لڑائی میں پسپا کردیا یہ شہزادہ واپس دہلی آیا تو اس کا باپ

باب نہم

رحلت کر چکا تھا اور اس کی تخت نشینی کو کچھ مدت نہ گزری تھی کہ آزمودہ کار جنگ جُو اور جہاں دیدہ مدبر نواب نظام الملک آصف جاہ نے جان جاں آفریں کو سپرد کی۔ دکن اور کرناٹک میں جو نئے نئے لوگ میدان میں آئے اُن کا یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کرناٹک کی فوج کشی میں میسور کا جو ادنیٰ لشکر بدقسمت ناصر جنگ کی طرف سے لڑنے آیا، اس میں حیدر علی بھی شامل تھا اور جب نواب موصوف کے قتل کر دے جانے پر فوج میں کھلبلی مچی اور وہ بے ترتیبی سے منتشر ہوئی تو دو اونٹ جن پر خزانہ لدا ہوا تھا، حیدر علی کے ہاتھ آئے اور اس روپے سے اسے اپنی ادنیٰ حیثیت درست کرنے میں کافی مدد ملی۔ آخری تغیر یہ ہوا کہ ۱۷۴۹ء سیواجی کے پوتے، اورنگ زیب کے اسیر و پروردہ، تین پشت تک برہمن پیشواؤں کے مربی یعنی مرہٹہ راجہ ساہو کا طویل عہد حکومت ختم ہو گیا اور اُس وقت جب کہ دہلی، ابدالی کے دوبارہ آنے کے خوف سے، جو شکست کھانے کے باوجود خطرناک و قوی دشمن تھا، لرزہ براندام تھی اور ادھر کرناٹک میں ہر طرف سخت خلفشار مچا ہوا تھا، ستارا کی راج دھانی میں اندر خانہ ایک عجیب اور پیچ در پیچ کشمکش ہونے لگی۔

ساہو کے کوئی بیٹا نہ تھا کہ گدی کا وارث ہوتا۔ وہ اپنے پُرانے حریف اور عزیز راجہ کولھاپور کو متبنیٰ کرنے پر مائل تھا لیکن اس راجہ کے بھی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس موقع پر مرہٹوں کی قرابت پرستی کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ لوگوں نے سیواجی (بانی ریاست) کے دادا کے بھائی وٹوجی کی اولاد میں سے کسی شخص کو وارث حکومت بنانے کی تجویز کی۔ ساہو کی بیوی سکھو بائی اس فکر میں تھی کہ کسی بچے کو گود لے کر، عملاً نہیں تو رسماً ہی، خود صغیر سن راجہ کی اتالیق بن جائے۔ اسے یہ منصوبہ چھوڑنا کسی طرح منظور نہ تھا اور نہ ابھی وٹوجی کی اولاد میں کوئی موزوں شخص ملا تھا کہ یہ نیا اور پُر اسرار شگوفہ کھلا کہ اسی موقع پر ریاست کے ایک (نام نہاد) اہم راز کا انکشاف کیا گیا۔ یعنی سیواجی کے چھوٹے بیٹے رام راجہ کی بیوہ تارا بائی نے جس کی پیرانہ سالی، طلب جاہ اور مستعدی میں کوئی کمی نہ پیدا کر سکی تھی، اعلان کیا کہ میرا ایک پوتا موجود ہے جو اپنے باپ سیواجی ثانی کی وفات کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک میں نے اسے چھپائے رکھا تھا۔ یہ سیواجی ثانی کولھاپور کا پہلا راجہ تھا۔ اب اس کے اصلی یا فرضی بیٹے کو تارا بائی نے پیش کر کے دعویٰ کیا کہ اسے رام راجہ ثانی

باب نہم

اور ساہو کے بعد مرہٹہ قوم کا فرماں روا تسلیم کیا جائے۔

یہ بات آج تک معرض بحث میں ہے کہ تارا بائی کی روایت صحیح تھی یا غلط لیکن اس میں تو کلام نہیں کہ اسے نئے وارث کو گدی پر بٹھا کر وہ سارا اقتدار خود حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بظاہر ہے کہ ساہو کی بیوی کو ایسے دعوے سے جس سے اس کے سارے منصوبے باطل ہوئے جاتے تھے، سخت غصہ آیا اور وہ بذریعۂ تبنیت، اپنا اقتدار قائم کرنے کی سازش کرتی رہی۔

غرض، بالاجی سپاہ کثیر کے ساتھ ستارا پہنچا تو خود اپنے اقتدار کے خلاف یہ دو دو زنانہ سازشیں ہوتی دیکھ کر بہت چکرایا۔ معلوم ہوتا ہے ایک وقت میں اس کا یہ بھی خیال ہوا تھا کہ راجہ کا منصب بالکل اڑا دیا جائے اور حکومت کی باگ علانیہ اپنے ہاتھ میں لے لی جائے لیکن عوام کے جذبات شد و مد سے سیواجی کے خاندان کے مؤید تھے اور برہمنوں کی سیادت سے ہر طرف ناراضی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اسباب مذکورۂ بالا ارادے پر عمل کرنے میں مانع ہوئے۔ بالاجی کو تارا بائی سے بھی بدگمانی تھی مگر دوسری خاتون بالاجی اور تارا بائی دونوں کے خلاف انتہائی کارروائی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ تاہم اپنے دنیاوی منصوبے چھپانے کی غرض سے اس نے کنایتہً کہنا شروع کیا کہ شوہر کی وفات پر میں ستی ہو جاؤں گی۔ بالاجی (بڑے معنی میں) پکا برہمن تھا یعنی اعلیٰ درجے کا فریبی، جسے فوری غرض حاصل کرنے میں کسی دین دھرم یا مآل کار کی بھی پروا نہ تھی۔ اس نے ذہن میں اپنا طریق عمل طے کر لیا اور جو کچھ کرنا تھا کمال سلیقے سے کر گزرا، اگرچہ دیسیوں کے بطلی الحس ضمیر نے بھی فیصلہ کیا کہ اس کا یہ فعل نہایت مجرمانہ عیاری تھی۔ بہر حال، اسے علم تھا کہ سکھور بائی وار کرنے پر آمادہ ہے اور ذی اثر اشخاص نیز ایک مسلح جمعیت اس کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بالاجی نے پہلے یہ فکر کی کہ جنگی مواقع اپنے ہاتھ میں آجائیں اور راجہ کی وفات پر بیوہ رانی کے حامیتی جدھر اقدام کریں، ان کا حفظ ماتقدم اور سد باب کیا جا سکے۔ اس نے یہ کام ایسے اہتمام سے کیا کہ جب کانٹے کا وقت آیا تو اہل سازش وار چلانے کی جرات نہ کر سکے۔ دوسری تدبیر پیشوا نے یہ کی کہ شکی اور آتش مزاج تارا بائی کو ایک طرف تو اس کی روایت کو قرین صحت کہہ کے تسلی تشفی دیتا رہا اور دوسری طرف اسے قابو میں لے آنے کا بھی انتظام کر لیا۔ اس کوشش میں سکھور بائی کے مقابلے میں تارا بائی کی تائید بھی حاصل ہو گئی اور خود راجہ سے اس نے حسب مراد زمام حکومت آئندہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی منظوری بھی لے لی

باب نہم

جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر اُس نے ان افواہوں کو روکنے کی عمداً کوئی کوشش نہیں کی جو عام طور پر پھیل رہی تھیں اور جن کا خلاصہ یہ تھا کہ تارا بائی کی روایت محض من گھڑت اور جس بچے کو وہ پیش کر رہی ہے، وہ بالکل جعلی ہے۔

یہاں تک تو پیشوا نے جو کچھ کیا، وہ اہل ہند کے مروجہ اصول ملک داری سے، جن کا اخلاقی معیار کافی پست ہے، ہٹا ہوا نہ تھا۔ لیکن ابھی اسے ایک اور استادانہ وار وہ کرنا باقی تھا، جس کے ذریعے اُس نے ٹھان لی تھی کہ اپنی نوجوان، اور اسی لئے زیادہ مخدوش حریف سے نجات حاصل کی جائے، اور یہی وہ کارروائی تھی جسے مرہٹوں تک نے ایسی خباثت پر مبنی سمجھا جس کا ارتکاب پیشوا ہی کر سکتا تھا۔ سکھو بائی نے جوش میں آکر جو کبھی کبھی شوہر کی لاش کے ساتھ جل مرنے کا خیال ظاہر کیا تھا، بالاجی نے اسی سے فائدہ اٹھایا اور ازرہ طعن وتضحیک یہ کہلا کہلا کے بھیجنا شروع کیا کہ رانی جی اس ارادے پر عمل کرنے کی تکلیف نہ اٹھائیں وہ خوب جانتا تھا کہ اس کی طرف سے، اور ایسے نازک موقع پر ایسی درخواست رانی کو خودکشی اور وہ بھی بہت ہی پُر ملال خودکشی پر آمادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور سکھو کا آگ میں جلنا ہرگز اصلی ستی یعنی محض شوہر کی خاطر، جذبۂ محبت اور شوق شہادت میں جان دینا نہیں ہو سکتا بلکہ اب اُس غریب نے ایسا کیا تو یہ دنیا کی شرم اور اُس بات کی لاج رکھنے کے لئے وہ محض مجبوری سے جان دے گی، جو واقعی ارادہ کئے بغیر اُس نے زبان سے کہہ دی تھی۔ مگر ظالم بالاجی نے اسے اور پکا کرنے کے لئے سکھو کے بھائی کو بھی ملا لیا اور کبھی روپے کا لالچ اور کبھی خاندان کی عزت کے نام سے آمادہ کر لیا کہ وہ بھی ستی کی تائید میں اپنے رسوخ واثر سے کام لے۔ اس طرح جب ساہو کی بیوی ہر طرف سے گھری اور خود اپنے جال میں پھنس گئی تو پھر اُس کا جو چند روز پہلے ایسی طاقتور نظر آتی تھی، ساتھ دینے والا کوئی نہ رہا وہ بدنصیب اس توہم پرستی کی رسم، یعنی ستی کی بھینٹ چڑھی اور آپ جل کر اپنے بے رحم قاتل کی کامل حکومت کا راستہ صاف کر گئی۔

پیشوا کے اس فعل کو سخت مذموم سمجھا گیا، لیکن اس نے دوسرے مرہٹہ رئیسوں کو راجہ سے مزید مالی حقوق اور نئے علاقوں کی منظوریاں دلوا کے دہن دوزی کا بند وبست کر لیا۔ تارا بائی بھی اب اس کے زیر اثر مضطرب نظر آتی تھی۔ اُسے حکومت میں معقول حصے کا وعدہ کر کے ٹھنڈا کیا گو اس وعدے کو پورا کرنے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا حفظاً ما تقدم

باب نہم

کی غرض سے اس نے اپنے آئندہ کامل اقتدار کا قانونی جواز یہ پیدا کیا کہ مرنے والے راجہ سے کسی نہ کسی طرح ایک دستاویز تحریر کرالی۔ یہ سچ ہے کہ ساہو کے مرض الموت میں وہ سکھوں اور اس کے ہواخواہوں کو راجہ کے پاس سے ہٹا دینے اور بدنامی مول لینے کی جرات نہ کرسکا تھا۔ تاہم اسے راجہ سے تخلئے کا موقع مل گیا اور اسی وقت مذکورہ بالا دستاویز مرتب ہوئی اس میں پیشوا کو اختیار دیا گیا تھا کہ "مرہٹہ سلطنت کا سارا نظم و نسق انجام دے۔ شرط یہ تھی کہ وہ راجہ کا نام اور سیواجی کے خاندان کا اعزاز اس طرح قائم و دائم رکھے گا کہ فرماں روائی تارا بائی کے پوتے اور اس کی اولاد میں متوارث رہے[1]"۔ دستاویز میں خاص خاص دفعات ایسی تھیں جن سے پیشوا کو ہر قسم کے، بلکہ بے انتہا اختیارات دے دیے گئے تھے۔

اس دستاویز کے مل جانے سے جسارت بڑھی اور پیشوا نے فوراً اپنی جنگی تدابیر مکمل کرلیں۔ راجہ کی بیوی کا بے تامل فیصلہ چکا دیا گیا۔ مرہٹہ رئیسوں کو اس طرح مٹھی میں لیا کہ انھیں اپنا فوری فائدہ پیشوا کی متابعت ہی میں نظر آنے لگا۔ تارا بائی کو بڑی ہوشیاری سے قابو میں رکھا۔ یہ سب اور پھر مجوزہ وارث کا مشتبہ ہونا، ایسے اسباب تھے جن سے پیشوا کے غصب حکومت میں مدد ملی۔ تارا بائی کے پوتے کی نسبت لوگوں کو جو شبہات تھے، اُن کو بالاجی نے زائل کرنے کی ذرا تکلیف نہ اُٹھائی۔ رہا، اس کا حکومت پر قبضہ تو اگر اسے "غصب" کہا جائے تو بھی واقعہ یہ ہے کہ مرہٹہ مملکت میں پیشوا کی قطعی سیادت و برتری کا میلان، اور وہ بھی صحیح میلان، پہلے ہی سے موجود تھا۔ بالاجی کی مذکورہ بالا کارروائی سے یہ شے صرف زیادہ ممتاز و نمایاں ہوگئی۔ اور آئندہ سے سلطنت کا اصلی جنگی اور سیاسی پائے تخت پونا بن گیا اور ستارا کی رفتہ رفتہ اس سے زیادہ وقعت نہ رہی کہ وہ مرہٹوں کے رسمی فرماں روا کا بندی خانہ رہ گیا۔ یہ فرماں روا سیواجی کا جانشین تو تھا مگر اس کی حکومت اور نسب دونوں مسلم نہ تھے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک سورما خاندان کا بگڑا ہوا اور نیز مشکوک وارث تھا۔ اسی انقلاب کی ایک اور علامت یہ تھی کہ دکن کے چھ صوبوں میں سردیش مکھی کی وصولی یا تنقیح حسابات کے لئے ساہو نے

[1] گرانٹ ڈف۔

باب نہم

ایک علیحدہ عہدہ دار مقرر کیا تھا، اب وہ عہدہ تو قائم رہا لیکن کام لے لیا گیا۔ عہدہ دار مذکور کا بعض جاگیروں کی آمدنی سے منصب مقرر ہو گیا۔

ساہو کے بعد جو کارروائیاں کی گئیں (۱۷۵۰ء) مجموعی طور پر ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کی قوت ان کے رئیسوں کی ایک متحدہ حکومت یا جتھا بن گئی جس کا مستقل اور علانیہ صدر نشین پیشوا تھا جو قریب قریب فرماں روا کی شان رکھتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی اطاعت لیت ولعل اور اکراہ کے ساتھ کی جاتی تھی لیکن بہ حیثیت پیشوا اس کی سیادت کو پہلے کبھی ایسا نہیں مانا گیا تھا جیسا صراحۃً اب تسلیم کیا جانے لگا۔ بجائیکہ لاادری مذہب کے خدا کی طرح، راجہ معطل ہوتا گیا اور ایسی پُراسرار عزلت میں چھپ گیا جس تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ تارا بائی اس انتظام سے رضامند نہ تھی اور حسد سے اپنا موقع تاک رہی تھی کہ جب ممکن ہوا سے درہم برہم کر دے۔

یہی زمانہ ہے جب کرناٹک کے میدانوں میں دوپلے کی حکمت عملی کی درخشاں کامیابی اور پے در پے چند حیرت انگیز اور پریشان کن واقعات نے سارے ہندوستان کو چوکنا کر دیا ذیل میں ان کی مختصر سرگزشت دہرا دینی کافی ہوگی کہ ناظرین اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ مرہٹوں کی تاریخ کے اس نئے دور پر جس میں بالاجی نے مذکورہ بالا جدید وظائف ومناصب حاصل کر لئے تھے، ان واقعات کا کیا اثر تھا۔

نواب نظام الملک نے اپنی وفات سے پانچ سال پہلے سپاہ کثیر کے ساتھ کرناٹک پر چڑھائی کی اور اس صوبے اور قلعۂ ترچناپلی کو مراری راؤ اور اس کے مرہٹہ لشکر سے خالی کرا لیا اور اس کے عوض میں مراری کو گوٹی کی جاگیر عنایت کی۔ انور الدین کو پہلے ارکاٹ کی صرف ایالت اور بعد میں نوابی عطا کی۔ یہ وہی شخص ہے جس کے بیٹے محمد علی کی آگے چل کر انگریزوں نے حمایت و تائید کی تھی۔ چندا صاحب نواب نظام الملک کی لشکر کشی کے وقت پونا ہی میں قید تھا۔ لیکن نواب نظام الملک کے انتقال کے بعد دوپلے کی ریشہ دوانی سے رہا ہوا اور پھر کرناٹک میں وہ کشاکش شروع ہوئی جسے اورم نے کمال تفصیل اور سچائی سے قلم بند کیا ہے۔ باپ کی وفات کے وقت ناصر جنگ شمال میں، اس کا سب سے بڑا بھائی دہلی میں، اور ایک بھانجا مظفر جنگ دکن میں فوج کا سر لشکر تھا۔

"جن دنوں انگریز تجور کے حاکم پر بلا کسی اشتعال کے چڑھائی کر رہے تھے،

تین جری قسمت آزماؤں نے آپس میں ایک ''اتحاد ثلاثہ'' قائم کیا۔ ان میں نوجوان مظفر جنگ تو مسند دکن کا دعوی دار تھا۔ جنگ آزمودہ اور سازشی چندا صاحب کرناٹک کے حاکم کی جگہ پر قبضہ کرنے کا آرزومند تھا۔ اور تیسرے، فرانسیسی صدر صوبہ دار (= گورنر جنرل) شریک تھا جس کے مقاصد اگرچہ اتنے معین نہ تھے مگر ساتھیوں میں کسی سے کم وسیع بھی نہ تھے۔ فرانسیسیوں کی بہادری اور مہارت جنگ نے دوبارہ لڑائی کا فیصلہ کیا۔ نواب ارکاٹ میدان میں کھیت رہا، لیکن اب اتحادیوں کو زیادہ طاقتور دشمن کا سامنا کرنا پڑا۔ بھانجے کی کوشش تھی کہ دکن میں خود ماموں کی جگہ لے۔ اب یہ ماموں یعنی ناصر جنگ بے حساب فوج لیکر چڑھا۔ انگریزوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اور عین نازک وقت پر فرانسیسی سردار انتہائی رذالت سے اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوپلے کا امدادی دستہ ہی اتحادی فوج کا گل سرسبد تھا۔ اسے افتاں وخیزاں پانڈی چری کی طرف پسپا ہونا پڑا اور اسی کے ساتھ ارکاٹ کی نوابی کا مدعی کافور ہوگیا۔ ممالک دکن کی صوبہ داری کے ناتجربہ کار امیدوار کو بہلا پھسلا کر لے گئے کہ ماموں سے معافی مانگ لے مگر ناصر جنگ کے ہاتھ پڑتے ہی اسے دغابازی سے طوق وسلاسل میں جکڑ دیا گیا۔

لیکن ناصر جنگ کی یہ کامیابی بہت عارضی ثابت ہوئی۔ فرانسیسیوں نے اپنی بدنظمی دور کی اور دوبارہ سنبھل کر کرناٹک کے سب سے مضبوط قلعے پر قبضہ کرلیا۔ ناصر جنگ کے امیروں میں بددلی پھیلی ہوئی تھی دوپلے نے اسی طرح جیسے آئندہ کلائیو نے بنگالے میں سازش کی ان امیروں کو اور بھڑکایا اور ان سے سازباز کرلیا۔ انھوں نے اپنے آقا کے خلاف سازش کی اور اس وقت جب کہ اس کی سپاہ کا وفادار حصہ فرانسیسیوں سے مصروف جنگ تھا، ایک سازشی امیر نے ناصر جنگ کا کام تمام کردیا۔ پھر اس کے قیدی حریف کو چھڑا کر صوبہ داری کی مسند پر بٹھا دیا گیا اور وہ پانڈی چری آیا جہاں شرقی تزک واحتشام کے ساتھ اس کی مہمانی کی گئی۔ دریائے کرشنا کے جنوب کے تمام وسیع علاقے کا، اس نے دوپلے کو نائب مقرر اور پے درپے اعزاز وخطابات اور جاگیروں سے سرفراز کیا۔ اتنی بڑی بازی میں اس فرانسیسی شاطر کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی یادگار میں ایک نئے ''شہر'' دوپلے فتح آباد'' کی بنیاد رکھی گئی اور ایک بڑے مینار پر اس کے کارنامے کندہ کرائے گئے۔

مگر اب ایک اور طوفان برپا ہوا۔ وہی امیر جنھوں نے ماموں کو مارا تھا۔ ابھی اس

باب نہم خون کا معاوضہ کافی نہ ملا تو بھانجے سے بھی بگڑ گئے اور واپس جاتے ہیں اُسے قتل کر دیا اور اسی ہنگامے میں خود بھی ہلاک ہوئے پھر ہر شے میں ابتری اور سخت پریشانی پھیل گئی۔ لیکن فرانس کا ستارہ عروج پر تھا بُسی کے اقتدار پر سب کو اعتماد رہا اور اسی نے بہت جلد امن امان قائم کر لیا۔ مسند فرماں روائی پر ایک اور گُڈا بٹھا دیا گیا۔ مظفر جنگ نے جو مراعات اپنے فرنگی مربیوں کے لئے کی تھیں۔ اُس نے بھی ان کی توثیق کر دی اور دکن کی طرف کوچ خاموشی سے جاری رہا۔

پیشوا کے لئے یہ بات فکر و تشویش سے خالی نہ تھی کہ اس نازک موقع پر کیا طریق عمل اختیار کرے۔ یہ سچ ہے کہ وہ کار آزمودہ اور ذی حوصلہ نواب نظام الملک اب زندہ نہ تھے اور ان کا بڑا بیٹا غازی الدین بھی ابھی تک دہلی میں رُکا ہوا تھا۔ لیکن اول تو وہ موجودہ حاکم صلابت جنگ کے مقابلے میں اپنا حق منوانے کی تیاریاں کر رہا تھا دوسرے پس منظر میں وہ اور بھائی تھے ہوئے تھے اور عجب نہیں کہ پیشوا کو پہلے سے گمان ہو، اور جیسا کہ آئندہ واقعات سے ظاہر ہوگیا۔ یہ دونوں بھی تاک میں تھے کہ موقع ملے تو دکن کی اسلامی ریاست کو حصے بخرے سے اور بھی تقسیم کریں اور اپنی ہوس اور سرکشی سے مزید فتنہ و فساد کا باعث ہو جائیں۔

خود صلابت جنگ میں کوئی مستعدی و قابلیت نہ تھی لہٰذا بالاجی کا بیرون ملک میں یہ امید کرنا بیجا نہ تھا کہ ان مغل امیروں کی باہمی عداوت اُس کے ازدیاد قوت و ملک میں مدد و معاون ہوگی ادھر اندرون ملک میں بھی وہ بعض قوی خطروں سے بچ گیا یا اُن پر غالب آچکا تھا اور مرہٹہ جتھے ہیں اس کی سیادت، کم سے کم ظاہری طور پر مسلم تھی رگھوجی نے شروع میں اس کے پیشوا ہونے کی مخالفت کی تھی، مگر اسے بنگالے اور آس پاس کے صوبوں میں من مانی کارروائی کرنے کی اجازت دے کر بالاجی نے باہمی مفاہمت سے رضامند کر لیا تھا۔ سکھو بائی نے حکومت میں عمل دخل حاصل کرنے کی جرات کی تو اس کا وہ خوفناک حشر ہوا جو دوسروں کے لئے بھی عبرت و تنبیہ کا سبق ہو سکتا تھا۔ تارابائی تو محر راجہ کی تحویل پر قانع اور اس کی غور پرداخت میں منہمک معلوم ہوتی تھی۔ ابھی تک

ؔ۔ یہ چند فقرے خود میری ایک مطبوعہ تقریر کا جس کا اوپر حوالہ آچکا ہے۔ خلاصہ ہیں۔

یہ لڑکا شہر ستارا میں راحت و آرام کے جملہ ساز و سامان کے ساتھ، آزاد رہنے دیا گیا تھا اور اس کی اصلی یا فرضی دادی شہر کے متصل قلعے میں رہتی تھی اور وہاں پیشوا کے سپاہی متعین تھے۔ یہ ضرور ہوا کہ ابھی دونوں پیشوا اور اس کے آزاد رو اور ناعاقبت اندیش عم زاد بھائی سداشیو میں سخت ان بن ہوگئی سداشیو عام طور پر بھاو کے نام سے مشہور تھا، ان کے اختلاف نے یہاں تک طول کھینچا کہ وہ کچھ روز کے لئے کولھاپور کے راجہ کے پاس چلا گیا اور اس کا پیشوا مقرر ہوگیا لیکن پھر یہ نزاع رفع دفع کردی گئی اور مغرور بھاو کو پونا میں مدار المہام بنا کے واپس بلالیا گیا۔

یہ سب تو تھا، لیکن ملک میں اندر ہی اندر مخالفت کا مادہ پک رہا تھا۔ رائے عامہ شد و مد سے تارا بائی کی اتالیقی کی موید تھی۔ اور قرینہ کہتا تھا کہ وہ اپنے اثر سے یہ کام لئے بغیر نہ رہے گی کہ رسمی عہدے کو اصلی بنائے اور اس فریبی برہمن کو جس سے مشترکہ حریف کے مقابلے میں سردست اشتراک عمل کرنا مصلحت سمجھتی تھی، آئندہ پچھاڑنے یا کم سے کم دبانے کی کوشش کرے۔

نواب نظام الملک کی نئی سپاہ نئے معاہدے اور حلیفوں کی نوعیت کو پیش نظر رکھا جائے تو پیشوا کے یہ اندرونی خطرے بہت زیادہ قوی تھے۔ پانڈی چری کا ساحر پورے ملک پر جادو چلا رہا تھا۔ اس نے ناصر جنگ کا خاتمہ کیا۔ خود اس کے حلیف مظفر جنگ کی موت اس کے منصوبے میں ایک دن بھی خلل نہ ڈال سکی۔ اس کا ذہین عامل اور قائم مقام بُسّی جنگی یا سیاسی اُلجھنیں سلجھانے میں یکساں ماہر نکلا۔ مرہٹوں کا اب تک جن دشمنوں سے مقابلہ ہوا تھا، ان سب سے فرانسیسی اسلحہ اور فوجی نظم بھی بالکل مختلف اور کہیں بہتر تھا۔ ابھی یہ تجربہ ہونا باقی تھا کہ دکنی قزاقوں کا برچھا ان فرنگی سنگینوں، بندوقوں اور سب سے بڑھ کر تیسنہ کار و تیز رفتار میدانی توپوں کے سامنے کب تک ٹھہر سکتا ہے۔

محض ایک بڑھیا (تارا بائی) کی ریشہ دوانیوں کی نگرانی اور سد باب کی خاطر پڑے رہنا اور صلابت جنگ کے اقدام یا محض نواب نظام الملک کے بیٹوں میں جنگ ہوتے دیکھ کر خاموش رہنا پیشوا کے لئے شرم کی بات تھی بلکہ اس کے تمام خاندان کی عادت، مزاج اور اغراض کے خلاف تھا نیز اس قوم کے، جس پر حکومت کرنے کا وہ آرزو مند تھا اور جس پر حکومت اسی وقت ہو سکتی تھی جب کہ اس قوم کی حریص اور بے چین طبیعت کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

باب نہم

غرض ان سب وجوہ سے، بالاجی نے فیصلہ کیا کہ صوبہ داری کے کلاں مدعی غازی الدین کا ساتھ دیا جائے۔ تارا بائی کو اپنی غیبت میں خاموش رکھنے کی غرض سے، راجہ کی ذات کا پورا اختیار سونپ دیا جائے اور قبل اس کے کہ صلابت جنگ کی حکومت پوری طرح قائم اور قوی ہو سکے، بلا تاخیر اس پر فوج کشی کی جائے۔ چنانچہ اس نے شہنشاہ کو عرضی لکھی کہ غازی الدین کو صوبہ دار دکن مقرر کر دیا جائے۔ کیونکہ آئندہ جنگ وراثت میں اس بادشاہی منظوری سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا تھا۔ پھر ستارا کے قلعے سے اپنی جمعیت ہٹا لی اور ناعاقبت اندیشی سے یہ سمجھ لیا کہ میرے اعتماد و دوستی کا یہ ثبوت ایک حاسد و غضب ناک عورت کو دھیما کئے بغیر نہ رہے گا۔

اورنگ آباد پہنچ کر اس نے وہاں کے صوبہ دار سے پندرہ لاکھ روپیہ نذرانہ وصول کیا۔ یہ صوبہ دار حقیقت میں غازی الدین کا طرفدار تھا اگرچہ اس نے ظاہر یہ کیا کہ مرہٹوں کے جبر سے روپیہ دے رہا ہے۔ پھر بالاجی بہ سرعت چلا کہ فرانسیسیوں کے ساختہ پرداختہ نظام اور اس کے فرنگی حلیفوں کا مقابلہ کرے۔ لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی تھی کہ یکایک خبر ملی کہ اتنے دن سے جو سرنگ تیار ہو رہی تھی اور جسے آگ لے جانے میں خود اس کا فعل ممد ہوا، وہ اس کے پس پشت بھک سے اڑ گئی۔ تب صلابت جنگ سے جس طرح بنا وقت کے وقت صلح کر کے وہ اور کئی کئی منزلیں طے کرتا ہوا ستارا واپس گیا اور تیرہ دن میں چار سو میل کی مسافت طے کی۔ وہ عین ایسے وقت وہاں پہنچا جب کہ نہایت مخدوش قضیہ چھڑ رہا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر فتنہ فرو کرنے میں کامیابی پائی اگرچہ اس میں ایسی تدبیریں بھی اختیار کرنی پڑیں جو اس کا زیادہ دلیر و عاقل باپ شکل سے پسند کرتا۔ واضح رہے کہ رام راجہ نے تمام نظم و نسق چند شرائط کے ساتھ پیشوا کے حوالے کیا تھا یہ شرطیں کبھی پوری نہیں ہوئیں۔ پس جس وقت بالاجی اورنگ آباد کی جانب کافی دور نکل گیا، تو تارا بائی نوجوان راجہ سے خود ملی۔ جوانی کی حرارت کو مشتعل کرنا چاہا اور ترغیب دی کہ وہ اس قید و بند سے جس میں خود مبتلا ہوا ہے، اپنے کو آزاد کر لے۔ مگر جب دیکھا کہ وہ لڑکا کسی طرح نہیں ابھرتا تو اس آتش مزاج و خود رائے رانی نے اسے دھوکے سے قلعے میں بلایا اور وہاں اس پر خوب کڑکی کہ تو جھوٹا وارث بدلا ہوا چھوکرا ہے۔ پھر اسے سخت حراست میں لے لیا جو سپاہی قلعے میں موجود تھے وہ پرانی وضع کے مرہٹے اور قدیم طور طریق کے دل سے عقیدت مند تھے۔ وہ برہمنوں کے تسلط سے مخالفت رکھتے تھے۔

باب نہم

تارا بائی کو ان کی تائید فرماں برداری پر پورا بھروسہ تھا۔ لہذا اس نے نوجوان راجہ کے آدمیوں پر جو سپاہیوں کے آس پاس موجود تھے، آتش باری کا حکم دیا۔ حالانکہ ان ملازمین کو اس گرماگرم استقبال کی مطلق توقع نہ تھی۔ اس کے بعد رانی کے حکم سے قلعے کی توپوں کا رُخ شہر اور پیشوا کے سپاہیوں کی قیام گاہ کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تارا بائی نے دناجی گائکواڑ کو طلب کیا کہ چند سال پہلے ترمبک کو جس منصوبے میں ناکامی ہوئی تھی، اب وہ اس کی تکمیل کریں۔ سابق پیشوا کی مستعدی نے ترمبک کو تو راستے ہی میں جا لیا تھا مگر دناجی کے لئے اب وقت زیادہ سازگار تھا کہ دارالحکومت پر چڑھائی کرے اور ملک کو سازشی برہمنوں کی جماعت سے آزاد کرائے۔ چنانچہ اسی موقع پر اعلان ہوا کہ دناجی پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ آپہنچا ہے۔ پیشوا کی سپاہ لڑنے کے لئے میدان میں نکلی مگر تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود پسپا ہوئی۔ گائکواڑ اور تارا بائی کی ملاقات ہوئی۔ چند قلعے بھی قبضے میں لے لئے گئے۔ نیا "پرتھی ندی" (یا سپہ سالار) بھی ان سے آملا جو سری پت کے عہدے کا موروثی دعویٰ دار تھا اور پیشوا کے اقتدار و منصب کا حسد اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس نے بالاجی کی مخالفت بھی کی تھی مگر اسے مرعوب و مغلوب کر لیا گیا تھا۔ غرض، تارا بائی اور دناجی نے مختلف مقامات سے کافی کمک آنے تک، ستارا میں قلعہ بند ہو کر لڑنے کا انتظام کیا کیونکہ یہاں کافی ساز و سامانِ رسد پہلے سے موجود تھا۔

لیکن انتظامات کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی اور یہ ابھی پس و پیش ہی کر رہے تھے کہ کوکن کے صوبہ دار کی عقب سے زد پڑی اور عین نازک وقت پر سامنے سے دفعتہً پیشوا نمودار ہوا۔ حسب معمول نامہ و پیام شروع ہوئے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ پیشوا نے حلفیہ قول قرار کر کے گائکواڑ کو دھوکے سے اپنے قریب پڑاؤ ڈالنے پر آمادہ کیا اور فوراً عہد توڑ کر اس پر حملہ کیا اور لشکرگاہ لوٹ کر خود دناجی کو گرفتار کر لیا اس دغابازی کی کارروائی نے پیشوا کی اقتدار کے دوسرے حریفوں کو بغاوت کرنے سے روک دیا اور وقت کے وقت جنگی خطرہ دفع ہو گیا۔ (۱۷۵۱ء)

مگر تارا بائی اب بھی قلعے پر قابض اور مقابلے پر کمربستہ نظر آتی تھی۔ نوجوان راجہ کو اس نے سخت بلکہ گندی قید میں ڈال رکھا تھا۔ گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ یہ قید خانہ ابھی تک موجود ہے۔ یہ ایک سنگ بستہ، مرطوب و تاریک حجرہ تھا اور قیدی راجہ کو کھانا بھی

باب نہم

ادنیٰ ترین غلے کا دیا جاتا تھا"۔[1] اس حیرت انگیز عورت کے انوکھے اور حاکمانہ مزاج کی اور مرہٹوں کے نرالے اور متضاد محسوسات و اطوار کی کوئی مثال اتنی عجیب نہ ملے گی جتنی تارا بائی کے طرز عمل اور اس زمانے میں اثر و اقتدار حاصل کر لینے سے ہمیں نظر آتی ہے۔ احکام کی بجا آوری کے لئے کوئی فوج اُس کے پاس نہ تھی۔ بایں ہمہ وہ یہ ہمت رکھتی تھی کہ پیشوا اور اس کی فتحمند افواج کو خاطر میں نہ لائے۔ وہ عہدۂ اتالیقی کی مدعی تھی اور عوام الناس کا فتویٰ بھی اس کی تائید میں تھا۔ اگرچہ قلعۂ ستارا کے دروازوں کے باہر اس کی حمایت میں کسی نے انگلی تک نہ ہلائی۔ طرہ یہ ہے کہ اُس کا دعویٰ رام راجہ ثانی کے اصلی اور حلالی ہونے پر مبنی تھا حالانکہ سب جانتے تھے کہ وہ خود اُسے علانیہ کم ذات، بدلا ہوا بچہ کہہ چکی ہے۔ اس لڑکے کو اپنی غرض کے لئے خود ہی تیار کیا اور پھر اس کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا وہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ لوگوں کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ اُس پجارن کی اطاعت کرنی حماقت ہے جس نے اپنے ہاتھوں اپنا بُت توڑ دیا۔ اپنے موجودہ مسکن کی حدود کے باہر وہ پیشوا کے اقتدار کا کوئی مقابلہ اور مزاحمت نہ کر سکتی تھی بایں ہمہ اطاعت قبول کرنے کی ہر تحریک و فہائش سے اس نے انکار کیا اور قلعے کے سپاہیوں کو جمع کر کے ہر شخص کو حلف دیا کہ آخر دم تک اس کا ساتھ دے گا۔ اسے کامل اعتماد سمجھئے یا مشتبہ قسم کی عیاری کہ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ جو کوئی حلف لینے سے انکار کرے گا اسے ایک "روٹی" نہیں، "بہر فوج سے علٰحدہ کر دیا جائے گا۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ کسی نے اس بیان کی صداقت آزمانے کی جسارت بھی کی یا نہیں۔

بہر حال، یہ یقینی ہے کہ بالاجی نے اس کے مقابلے میں جبراً فیصلہ کرنے کے جوکھوں سے پہلو بچایا۔ اور ایک عجیب نرچ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کے خاص خاص اسباب تھے۔ اول تو برہمنوں کی چیرہ دستی سے عام طور پر لوگ جلتے تھے۔ اس کے علاوہ تارا بائی سخت ضدی اور خود رائے تھی پھر وراثت اور تبنیت کے ویسی عقائد اور ویسی ہی عام اور قوی اوہام پرستی کو بھی مذکورہ بالا نتیجہ پیدا کرنے میں کافی دخل تھا۔ نوجوان راجہ سیواجی ثانی کا واقعی بیٹا تھا یا نہ تھا، اس میں تو کچھ شک نہ تھا کہ سن رسیدہ رانی راجہ رام اول کی بیوہ اور اپنے شوہر کے مسلمہ حق کی وارث مختار تھی متروکہ جایداد وغیرہ کے عام معاملات میں اسے اپنے

[1] گرانٹ ڈف۔

شوہر یا بیٹے کی اجازت کے بغیر کسی کو متبنیٰ کر لینے کا پورا حق حاصل نہ بھی ہو تو بھی بائی ریاست کی وراثت کو بذریعہ تبنیت قائم رکھنے میں اُس کی بہت کچھ تائید کی جا سکتی تھی اور متبنیٰ بنانے کا حق مان لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ خود اسے اتالیق یا نائب السلطنت بننے کا حق حاصل ہو جیسا کہ اپنے شوہر (رام راجہ اول) کی وفات کے بعد وہ فی الحقیقت اس منصب پر فائز ہو گئی تھی۔

اس طرح تارا بائی کا دعویٰ دراصل موجودہ راجہ کی ولدیت اور حق وراثت سے بھی آگے تک جاتا تھا۔ گویا وہ راجگی کے منصب و اعزاز کا مستقل سرچشمہ اور اس بات کی اہل تھی کہ اگر ضرورت ہو تو بذریعہ رسم تبنیت کسی نئے خاندان کی حکمران خاندان کے خون میں مصنوعی آمیزش کر دے اور اُسے پستی سے اٹھا کر مسند حکومت کی بلندی تک پہنچا دے۔ رہی حکومت کی وہ سند یا دستاویز جو ساہو نے بالاجی کے نام لکھدی تھی تو ظاہر ہے اس کو تارا بائی وہی وقعت دیتی تھی جتنی ہیر اللہ نے ولیم حرامی کے نام ایڈورڈ نائب کے ہبہ نامے کو دی تھی۔

مزید برآں یوں تو مرہٹوں میں بارہا عورتیں اونچی خدمات و مناصب پر سرفراز رہی تھیں لیکن یہ بوڑھی مگر جوان ہمت رانی اس قیاست کا مزاج اور طور رکھتی تھی کہ ہر شخص اس کے سامنے پڑنے سے گھبراتا اور اسے بلائے بے درماں سمجھتا تھا۔ چنانچہ پیشوا کے سپاہی خواہ اسے فرشتہ سمجھتے ہوں یا شیطان، اس کا مقابلہ کرنے سے قطعی طور پر پہلو تہی کرنا چاہتے تھے۔

غرض، وقت کے وقت تو یہ نزاع بظاہر ایک ملتوی جنگ بن کر رُک گئی۔ ملک کا نظم و نسق اور فوج کی قیادت بدستور پیشوا کے ہاتھ میں رہی۔ تھوڑے دن بعد اس نے گائکواڑ کو بھی رہا کر دیا مگر اس سے بالکل من مانی اور بہت ذلت آمیز شرطیں قبول کرائیں۔ چنانچہ عہد لیا کہ آئندہ ہمیشہ پیشوا کی ہدایت پر کاربند رہے گا اور نیز یہ کہ گجرات کی مالگزاری میں سے نصف مستقل طور پر پیشوا کے حوالے کر دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی سخت شرطوں کا اسے پابند بنا لیا۔ دوسری طرف تارا بائی قلعۂ ستارا پر قابض رہی اور وہ بدنصیب گدا راجہ اور اس کا جو کچھ اعزاز باقی رہ گیا تھا وہ بھی اُسی کے پاس رہا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ نفع میں بالاجی ہی رہا۔ اس نے خود تارا بائی ہی سے نامی گرامی سیواجی کے بدقسمت جانشین کو جھوٹا مدعی کہوایا اور اسے قید میں ڈالنے کی نظیر بھی قائم کرا دی۔ یہ درست ہے کہ تارا بائی

باب نہم

نے آئندہ بعض مغل یا مرہٹہ ارباب سیاست اور ٹسی سے بھی نامہ وپیام کئے جس سے بالاجی کو خاصی تشویش اور زحمت پیش آئی لیکن بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوگیا کہ تارا بائی کو سمجھا بجھا کر اپنی سیادت تسلیم کرا دے، اس قرار داد پر کہ "راجہ کی ذات اور ذاتی عملہ تارا بائی ہی کے قبضے میں رہے گا" پیشوا کا دلی منشا تھا کہ یہ نام نہاد راجہ عوام الناس کی نگاہوں سے دور رکھا جائے تاکہ اسے دیکھ دیکھ کر پیشوا کے غصب حکومت کی یاد تازہ نہ ہوتی رہے۔ سو اس مطلب کو بالاجی نے اپنی برہمنی عیاری کا یہ آخری اور باریک پیچ کھیل کر حاصل کرلیا کہ تارا بائی سے درخواست کی کہ راجہ کو قید سے آزادی دے دی جائے جس کے جواب میں تارا بائی نے حسب توقع اور بھی اہتمام کیا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔

پیشوا کے ہاتھ سے ملکی اقتدار چھین لینے کی یہ تیسری اور آخری کوشش تھی جس کے بعد وہ بلاشرکت وخرخشہ اُس قوت کا سردار ہوگیا جسے اب صحیح معنی میں "مرہٹہ جتھا" کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ عہدہ انیسویں صدی میں بھی سالہا سال تک قائم رہا تاآنکہ فتحمند انگریزوں نے اسے نابود و بے نشان کیا اور مرہٹہ وفاق کے دوسرے شرکا کو اپنے دیرینہ سرگروہ کی اطاعت سے باضابطہ نجات وآزادی حاصل ہوگئی۔

باب دہم

مرہٹوں کی طاقت کا انتہائی عروج

اب مرہٹے پھر ایک مرتبہ پیشوا کی سرگروہی میں متحد قوم ہو گئے۔ پیشوا کو مرہٹہ رئیسوں کے جتھے پر جو سیادت حاصل تھی، دوبارہ مسلم اور خاصی طرح معین و واضح ہو گئی۔ اکثر قدیم خاندان، اب یا تو قابلِ لحاظ نہ رہے یا صفوف پائیں میں ہٹ گئے۔ گھوڑپڑوں کے خاندان کا سرخیل مُرار راؤ ضرور موجود اور کبھی کبھی پیشوا کی افواج کے ساتھ جنگی خدمات انجام دیتا رہا۔ لیکن اسے بھی جتھے کا باقاعدہ شریک سمجھنا مشکل ہے۔ دوسرے وہ نواب نظام الملک کا باج گزار دوست نگر سمجھا جاتا تھا اسی طرح کولھاپور کا راجہ اپنے چھوٹے سے علاقے میں حکومت کرتا رہا مگر اس کا جنگی یا سیاسی اقتدار بہت کم تھا۔ البتہ بھونسلے اپنے رسوخ و زرستانی نیز مقبوضات کا دائرہ گونڈوانے سے بنگالے تک، شمال مشرق کی جانب وسیع کر رہا تھا۔ اس کا صدر مقام برار میں تھا اور یہ سرگرمیاں پیشوا کی تائید اور اس معاہدے کے مطابق تھیں جو ان کے مابین پہلے ہوا تھا۔ گائکواڑ سے یہ طے ہوا تھا کہ گجرات کی نصف مالگزاری اپنے حریف غالب (یعنی پیشوا) کو ادا کرتا رہے گا۔ مگر اس صوبے میں مغلوں کا ستقرا بھی تک مرہٹوں کے قبضے میں نہ آیا تھا البتہ بڑودے میں، جو آج بھی اس خاندان کی راج دھانی ہے گائکواڑ

باب دہم

حملہ ہوا۔ اس کا دارالملک زد میں آگیا۔ اس کی کثیر و عمدہ سپاہ پر غنیم نے چھاپہ مارا اور صفیں کی صفیں کاٹ کر اسے بھگا دیا۔ پھر غنیم بھی وہ جسے پیشوا کے اوہام پرست ہم وطن شاید اسی خوف و توہم سے دیکھنے لگے تھے جو میکسکو کے جنگجو اور سابق میں ناقابل فتح باشندوں کے دل میں اہل ہسپانیہ کی طرف سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیشوا کو میکسکو کے معاملے کی طرح یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا ہو کہ براعظم (ہند) کی سلطنت بالآخر سمندر کے انھی سفید فام بچوں کے قبضے میں پہنچ جائے گی۔ بایں ہمہ کم سے کم وقت کے وقت، شمشیر نہیں تو اس پرفن برہمن کی تدبیر اور ایک اور مرہٹہ رئیس کی آزادانہ مگر برمحل دست اندازی آڑے آگئی اور اُن فرنگیوں تک کی اُس کے آگے کچھ پیش نہ جا سکی جن کو دوپلے جیسا اُستاد اور بسی جیسا سپہ سالار میسر تھا۔

پیشوا کے سپاہی بھی، واقعہ یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کے باوجود جو نئے نظام حکومت کا نتیجہ تھیں، مجموعی طور پر خوب خوب لڑے۔ پُونا کی فوج کشی کے وقت وہ صلابت جنگ کی سپاہ کے گرد برابر منڈلاتے اور بڑی دلیری سے اس کا راستے روکتے رہے۔ فرانسیسی توپوں پر بھی انھوں نے حملہ کیا اور پچھلے شبخون کے بعد، دوبارہ حواس اور ہمت درست کر کے بڑے زور شور سے دشمن پر آپڑے۔ ان کی یہ یورش ضرور کامیاب ہو جاتی اگر فرنگیوں کی تیز اور آڑ میں لے بیٹھنے والی توپیں تباہ کن آگ نہ برسا دیتیں۔ پھر بھی، اگر انھیں فرانسیسیوں سے ڈرنے کا سبق ملا تو فرانسیسیوں نے بھی ان کے استقلال و پامردی کا لوہا مان لیا اگرچہ مرہٹوں کی یہ دلیری بے ضابطہ تھی اور آخر میں ناکام رہی، البتہ اس اثنا میں بالاجی کے قاصد اور بعض رفیق نواب نظام الملک کے لشکر میں پہنچ گئے اور ایک طرف تو مغل سپاہ کے حملہ حالات سے پیشوا کو اطلاع دینے لگے اور دوسری طرف اس کے سرداروں میں اختلافات آرا اور ذاتی جھگڑے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مغل امیر ایک دوسرے سے جلے مرتے تھے مگر اس سے بھی بڑھ کر صلابت جنگ کی حکومت کے حق میں خرابی یہ ہوئی کہ ان امیروں کے دل میں مشترکہ طور پر ذہین و نمائش پسند بسی اور اس کے فرنگیوں کی طرف سے وہ سوئے ظن ابھی سے پیدا ہو گیا جس نے تھوڑے دن بعد ایک سازش کی صورت اختیار کر لی جس کا مقصود یہ تھا کہ ان فرنگیوں کو دکن سے بالکل نکال باہر کیا جائے۔

باب دہم

دوسرے بالاجی کا بھونسلے کو مراعات دینے اور ایک مشترکہ دشمن کے مقابلے میں باہمی رشتۂ وفاق قائم کرنے کی خوبی اب نمایاں طور پر ظہور میں آئی۔ پیشوا مغل سپاہ اور اس کے فرانسیسی رفیقوں کی پوتا پر مسلسل پیش قدمی روکنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر کچھ نہ بن پڑتی تھی۔ اسی طرح غازی الدین خاں کو جنوب کی طرف کوچ پر آمادہ کرنے اور خود اپنے بھائی رگھوناتھ کو گجرات سے اور ہلکر و سندھیا کو ہندوستان سے بلانے کے لئے اس کے قاصد دوڑ ہی رہے تھے کہ سب سے پہلے رگھوجی بھونسلے میدان میں آپہنچا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس نے لڑ جھگڑ کر علی وردی خاں سے شمال میں بالاسور تک "کٹک کا صوبہ" اور بنگالے و بہار کی چوتھ کے عوض میں ایک مقررہ رقم کا اقرار لے لیا تھا۔ اب وہ یکایک صلابت جنگ کے عقب میں فوج لے کر پہنچا اور اس کی فوج کشی کا رُخ ہی بدل دیا۔ گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ اس نے گاوِل اور نرنالے کے قلعوں پر یکایک حملہ کر کے انھیں لے لیا، مانک دُرگ اور اس کے توابع پر قبضہ جمایا اور پین گنگا اور گوداوری کے درمیان کے سارے علاقے سے نذرانہ ہی نہیں لیا بلکہ مغلی تھانوں کو اُٹھا کر اپنے تھانے قائم کر دیے

بھونسلے کی ایکا ایکی اس دشمن اور جنگی کارروائی کی پریشان کن خبریں اسی زمانے میں موصول ہوئیں جب کہ سپاہیوں میں روز افزوں ناراضی اور سرداروں میں بددلی کے آثار پائے جاتے تھے۔ پس صلابت جنگ کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ بسی کی صلاح مان لے اور پیشوا سے عارضی صلح طے کر کے اپنے ملک کو واپس پھر جائے (دسمبر ۱۷۵۲ء) اس طرح، اگرچہ یہ معرکہ آرائی آئندہ مرہٹوں کے لئے، جب کہ فرنگیوں سے مقابلہ ہو، کچھ فال نیک نظر نہ آتی تھی۔ تاہم قریبی نتائج خاصی طرح بالاجی کے حسب دلخواہ برآمد ہوئے اور مرہٹہ جتھے کی مجموعی کارکردگی پر جسے خود اس کی حکمت عملی کا ثمرہ کہنا چاہئے۔ اس کا ناز کرنا بیجا نہ تھا۔

ادھر شمال میں مرہٹہ فوجیں تازہ فتوحات سے بہرہ مند ہوئیں۔ یہ سچ ہے کہ

لہ۔ گرانٹ ڈف۔ بنگالے اور بہار کی یہ چوتھ بھی مرہٹوں کی تازہ دست درازی کا نتیجہ تھی۔

باب دہم

رگھوناتھ کو گذشتہ معرکہ آرائی میں پیشوا کی مدد کے لئے واپس آنا پڑا اور اسی مجبوری سے وہ گجرات میں وہ کامیابی نہ حاصل کر سکا جو آئندہ اس کے حصے میں آئی۔ لیکن ہلکر و سندھیا کو بادشاہی وزیر اور صفدر جنگ نواب اودھ نے رُہیلوں کے مقابلے میں مدد دینے کے لئے بُلایا اور ان کے لشکروں نے رہیلوں کے علاقے پر تاخت کی۔ اور انھیں شکست دے کر کماوں کی پہاڑیوں میں دھکیل دیا۔ اس کارنمایاں کے صلے میں مفتوحہ اضلاع کا بڑا حصہ مرہٹوں کو مرحمت ہوا۔ پھر ایک طرف تو ان سے وعدہ کیا گیا کہ احمد شاہ ابدالی کے مقابلے میں مدد دینگے تو اور زیادہ انعام واکرام دیا جائے گا اور دوسری طرف ہدایت ملی کہ پیشوا کے حلیف غازی الدین خاں کی ہمراہی میں جنوب کی جانب روانہ ہوں۔ ان وجوہ سے انھیں بہت جلد روہیل کھنڈ کا علاقہ چھوڑنا پڑا، لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ اپنے معمول کے مطابق علاقہ چھوڑنے سے قبل انھوں نے ہر دو فریق سے ایک ہی کام کے معاوضے میں پیشگی کے نام سے پچاس لاکھ روپے کی معقول رقم ضرور وصول کر لی اور اس کے بعد روہیل کھنڈ سے رخصت ہوئے۔

آصف جاہ اول کے بیٹوں کی باہمی کشمکش اب کسی حتمی فیصلے پر پہنچتی نظر آتی تھی۔ غازی الدین خاں لشکر کثیر کے ساتھ دکن روانہ ہوا۔ برہان پور کی مغل فوج اس سے جا ملی سندھیا اور ہلکر کے امدادی دستے ساتھ ہو لیے اور پیشوا کی کمک کے آ ملنے سے اس کی سپاہ کی کل تعداد بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔ اس اعانت کے عوض میں صوبہ دکن کا حریص امیدوار آمادہ ہو گیا کہ اپنے آئندہ علاقے میں مزید کمی گوارا کرے گا اور برار کے مغرب کے وہ اضلاع جو گوداوری اور تاپتی کے درمیان واقع تھے، پیشوا کے حوالے کر دے گا۔ اور پیش آنے والے حوادث کو لکھنے سے قبل ہی یہ کھہ دینا مناسب ہو گا کہ اس عطیے کی صلابت جنگ نے بھی، بادلِ ناخواستہ، توثیق کر دی جو مرہٹوں کے سیلابِ اقتدار کی ایک اور بلندی کا نشان ہے۔

حسب معمول تلوار کھینچنے سے پہلے نامہ و پیام کا ہنگامہ گرم ہوا۔ بڑے بھائی کے دعاوی کو ٹالنے کی کوئی صورت نہ رہی تو صلابت جنگ نے چار و ناچار اعتراف کیا کہ مجھے ان میں کوئی قابل گرفت سقم نہیں ملتا۔ اب کسی دوسرے داؤ کی ضرورت تھی جو ایک ضرب میں یہ قضیہ چکا دے۔ چنانچہ دوستانہ ضیافت کی پُر فریب کفالت میں کسی عورت کے ہاتھ سے

باب دہم

کوئی کھانا جس میں زہر تھا دلوا دیا گیا کہ پھر کوئی خرخشہ باقی نہ رہا۔[1]

دکن کی صوبہ داری میں اب صلابت جنگ کا کوئی حریف نہ رہا۔ اس اطمینان کے بعد ہی اُس کے وزیر نے فرانسیسی حلیفوں کو نکال باہر کرنے کی وہ سازش کی جسے بسّی نے اپنی فطری مستعدی، موقع شناسی اور قوت سے نہ صرف باطل کیا بلکہ اسی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے ہم قوموں کے لئے مشرقی ساحل پر ایک بڑی جاگیر لکھوالی (۱۷۵۳ء) ہندوستان میں فرانسیسیوں کی تاریخ کا یہ باب اورم نے حسبِ معمول کمال جامعیت، صفائی اور جوش سے تحریر کیا ہے اور اس بارے میں صرف اتنا اضافہ کرنے ضرورت ہے کہ دوسرے مورخ بھی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ علاقہ جو فرانسیسی فوج کی خدمات کے معاوضے میں عطا ہوا تھا، اس کے انتظام اور فلاح و بہبود کے لئے بسّی نے پوری سلیقہ مندی اور فیاضی سے کام لیا۔

اس اثنا میں مرہٹہ افواج کی فوقیت کا مختلف سمتوں میں ظہور ہو رہا تھا۔ قلیل عرصے میں پیشوا کا لشکر کرناٹک اور بالاگھاٹ میں دو دفعہ گشت لگا گیا۔ گراں قدر نذرانے وصول کئے۔ جن قلعوں سے مقابلے کی جراءت کی گئی، انھیں یورشس کرکے فتح کیا اور قلعے

---

[1] نواب غازی الدین خاں (فیروز جنگ) آصف جاہ اول کے سب سے بڑے فرزند تھے اور ان کے انتقال کے وقت دربار دہلی میں سپہ سالاری کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں یہ بات ناگوار ہوئی کہ صلابت جنگ نے ان سے مشورہ کئے بغیر دکن کی صوبہ داری کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہ دعویٰ کہ انھیں صلابت جنگ کے اشارہ پر اورنگ آباد میں زہر دلوایا گیا تاریخی حیثیت سے ثبوت کا محتاج ہے۔

نواب نظام علیخاں آصفجاہ دوم نے جن حالات میں ریاست حیدرآباد پر اقتدار حاصل کیا وہ اسی حکمت عملی کے مقتضی تھے جو ممدوح نے اختیار کی صلابت جنگ کے عہد حکومت میں فرانسیسیوں لوگ دکن کے دروبست پر پوری طرح حاوی ہوگئے تھے جس کی وجہ سے ریاست کے خطرے میں پڑنے کا اندیشہ تھا۔ نواب نظام علیخاں نے برسر اقتدار ہوکر ریاست کو فرانسیسی اثر سے آزاد کیا۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صلابت جنگ کو نظام علیخاں کے اشارے پر مروا دیا گیا۔ اگر نواب نظام علیخاں صلابت جنگ کو برطرف کرکے اپنا اقتدار نہ جماتے تو ریاست حیدرآباد فرانسیسیوں یا مرہٹوں کے ہاتھ بالکل بے بس اور بے اختیار ہو جاتی۔

باب دہم

کی ساری فوج کو بیدریغ قتل کرا دیا۔ اور (بہت کچھ اہل پروشیہ کے تازہ طریق کی مثل) کھلے دیہات کے مقدموں کو پکڑ پکڑ کے خوب زدوکوب کی اور اہل دیہات سے جبراً روپے وصول کئے۔ میسور میں اُس وقت تک ہندو راجہ کی عملداری تھی۔ اس کی راج دھانی سرنگاپٹم کو جاگھیرا اور جب تک زرنقد، مرہٹوں کے حقوق مالگزاری کا اقرار اور یہ لجاجت آمیز وعدے نہیں لے لئے کہ آئندہ یہ رقم پابندی سے ادا ہوگی، اس وقت تک اہل شہر کی گلوخلاصی نہ کی۔ گجرات میں بھی رگھوناتھ کا جو کام ادھورا رہ گیا تھا، اس کو ازسرنو ہاتھ میں لیا گیا۔ دُناجی گائکواڑ نے بالآخر پیشوا سے صلح اور قید سے نجات حاصل کر لی تھی، اب اس کی مدد سے رگھوناتھ نے مغلیہ تسلط کے جو رہے سہے آثار باقی تھے، اُن کو مٹانا شروع کیا۔ صوبے کا شاہی مستقر احمدآباد تھا۔ اسے گھیر لیا اور اہل قلعہ کو ان کی جاں بازانہ مدافعت کے بعد ہتیار ڈالنے پر مجبور کیا (۵۵۔۱۷۵۳ء) اموال غنیمت اور شہر کی حفاظت میں اپنے شریک کار کو بھی حصہ دیا۔ یہ تقسیم بھی مرہٹوں کی مشترکہ جنگ آرائی کی ایک مثال ہے جسے بیان کئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ مالگزاری دو مساوی حصوں میں پیشوا اور گائکواڑ کے درمیان تقسیم کی گئی لیکن قلعے میں پوری فوج پیشوا کی مقرر ہوئی بجز ایک دروازے کے، جس میں گائکواڑ کے سپاہی متعین تھے۔ بریں ہمہ اسے ان سپاہیوں کے خرچ مد میں ۶ ہزار روپیہ سالانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

پھر سندھیا اور ہلکر خاندان کے نوجوان افراد کو ساتھ لے کر رگھوناتھ شمال میں بڑھا کہ نام نہاد شہنشاہ سے آخر میں جو سندیں لکھوالی تھیں، اُن سے حسب دلخواہ کام لیا جائے۔ چنانچہ مضافات دہلی میں شہنشاہی علاقے سے چوتھ اور سردیش مکھی کے دو دو محصول وصول کرنے شروع کئے۔ راجپوت، جو ہندوؤں کے ہندو اور خاندان پیشوا کے قدیم حلیف تھے، وہ بھی نذرانے سے نہ بچے۔ جاٹ بڑے لڑنے والے اور سرکش تھے اور اصل نسل، سیرت اور قومی تاریخ کے اعتبار سے انھیں مرہٹوں کے ساتھ بڑی مماثلت تھی۔ وہ بھی مجبور ہوئے کہ "مرہٹوں کے دعاوی کو تسلیم کریں" اور یہ وہ نرم پیرایہ ہے جس میں اُن کی محصول گزاری بیان کی گئی ہے حالانکہ ایسے محصلوں کے سامنے حقیر سے حقیر مالگزاری کا بھی اقرار کرنا، آئندہ اُنھیں بے پناہ دست درازی کا بہت خطرناک

باب دہم

حیلہ بہم پہنچانا تھا۔

اسی زمانے میں رگھوجی بھونسلے نے وفات پائی (۱۷۵۵ء) وراثت کے متعلق اس کے بیٹوں میں جھگڑے قضئے تو ہوئے لیکن ان سے مرہٹہ جتھے کو مستقل طور پر کوئی نقصان نہ پہنچا۔ جانوجی سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اسے پیشوا نے باضابطہ رگھوجی کا وارث اور مرہٹہ ریاست میں متوفی کو جو منصب حاصل تھا، اس کا جانشین تسلیم کرلیا۔ اسی کے ساتھ جانوجی نے اپنی قابلیت اور میلان خاطر کا بھی یہ ثبوت دیا کہ فوراً فرانسیسیوں کے ساحلی اضلاع پر تاخت کی اور انھیں خوب لوٹا۔ اس تاخت کی کیفیت بھی آورم نے تحریر کی ہے۔ لیکن یہ نیا بھونسلا رئیس صلابت جنگ کے علاقے پر حملہ کرنے میں اس قدر کامیاب نہ ہوسکا۔

فرانسیسیوں کی جنگی شہرت اُن کے اضلاع کو تاخت تاراج سے محفوظ نہ رکھ سکی تو زوال پذیر شہنشاہی کی عزت ان گستاخ اور بےچین و سرگرم حملہ آوروں کو کب تک مرعوب کرسکتی تھی۔ ادھر نواب غازی الدین مقتول نے دہلی میں ایک بیٹا چھوڑا تھا، جو سن و سال میں کم ہونے کے باوجود ہوس جاہ و اقتدار میں اپنے اجداد سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے بلا تاخیر وہی روش اختیار کی جس پر دادا کمال ہوشیاری سے چلتا رہا، اور باپ چلتے چلتے یوں ناگہانی طور پر روک لیا گیا تھا یعنی انھی دونوں کی شکل اس نے اپنی مورثِ اعلیٰ کا لقب منتخب کیا اور آئندہ غازی الدین ہی کے نام سے شہرت پائی بلاشبہہ باپ ہی کے سیاسی رجحان کی بنا پر، اس نے اپنی مدد کے لئے ہلکر اور خاندان سندھیا کے ایک نوجوان فردجیا پا کو طلب کیا۔ پھر اپنے محسن و مربی صفدر جنگ سے یہ کافر نعمتی کی کہ وزارت سے معزول کرا کے اسے شہنشاہ کے ساتھ ایک طویل اور پیچ در پیچ نزاع میں پھنسا دیا اور پہلے اپنے کسی رشتہ دار کو اور پھر تازہ جھگڑا کھڑا کرکے، اپنے آپ کو وزارت پر فائز کرالیا۔ اس میں سہولت اس لئے پیدا ہوگئی کہ اسی زمانے میں ہلکر نے بغیر حکم و ہدایت کے یک بہ یک بادشاہی لشکر پر حملہ کرکے اسے بھگا دیا اور خیمہ وغرگاہ لوٹ لیا مرہٹوں کی ناجائز سینہ زوریوں کا یہ آغاز تھا اور جب تک نصف صدی بعد انگریزوں نے لارڈ لیک کی قیادت میں فتوحات نمایاں حاصل کرکے کامل سد باب نہ کیا، اس وقت تک ان کی دربار دہلی کے معاملات

باب وہم

میں براہ راست دست اندازی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ القصہ اس قسم کی مدد سے رتبہ وزارت پر پہنچنے کے بعد نوجوان غازی الدین نے بادشاہ گری کے زینے پر قدم رکھنا چاہا اور بدنصیب احمد شاہ کو اندھا اور معزول کر کے تخت شاہی پر ایک ننھے گڈے کو متمکن کیا اور کمال ظالمانہ ستم ظریفی کہئے کہ اسے عالمگیر ثانی کے لقب سے ملقب کیا (۱۷۵۴ء) یہ تاریخ کا بڑا اسجاری انتقام ہے۔ عالمگیر اول جسے ہم (۔ انگریز) عام طور پر اورنگ زیب کہتے ہیں۔ اس نے اسی مایوسانہ جد وجہد میں اپنی زندگی ختم کردی کہ جس طرح ہو سکے اُس مرہٹہ طاعون کو بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکے جسے خود اُس کی بے پناہ ہوس اور غلط حکمت عملی نے پیدا کیا اور پھیلایا تھا۔ غریب عالمگیر ثانی کی نہ کوئی حکمت عملی تھی نہ غالباً کوئی ہوس اقتدار، لیکن اس کی تخت نشینی خاص اُس عہد کا آغاز ہے جس میں وہی طاعون سلطنت کے جسم بھر میں عرصے تک بے روک پھیلنے اور غلبہ پانے کے بعد بالآخر اس کے قلب تک پہنچا اور کہنا چاہیے کہ انجام کار اس کی (۔ سلطنت مغلیہ کی) موت کا پیام بن گیا۔

معزول وزیر اور نواب اودھ صفدر جنگ نے بھی دربار شاہی کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور اس عالم سے باہر نکل آیا جس کی ہر شے اب حد درجہ پراگندہ ومنتشر تھی اور اس میں ربط وتناسب پیدا ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی بلکہ وہ سرعت سے خستہ ہوئی جاتی تھی۔ چنانچہ زوال پذیر سلطنت کا مورخ ان پُر ملال اور جامع الفاظ میں اس وقت کی کیفیت بیان کرتا ہے کہ "ہندوستان میں جور وجبر، ابتری وغارتگری یوماً فیوماً بڑھتی رہیں۔"

اطراف واکناف میں مرہٹوں کے اقتدار کے بڑھنے اور دور دراز خطوں تک نفوذ پانے کے ساتھ ساتھ وطن کے قریب بھی ان کی قوت کو قابل ذکر فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ چنانچہ کرناٹک کے پہاڑی علاقوں سے چوتھ وغیرہ محاصل وصول کرنے کی غرض سے جو مہم روانہ ہوئی وہ جنگلوں کے خطے سے نکلکر بدنور تک جا پہنچی۔ تجارت اور پُرامن حکومت کے طفیل وہاں بڑی دولت جمع تھی جس پر آئندہ حیدر علی نے ڈاکہ مارا، مگر اس وقت مرہٹوں ہی نے اس تر مال میں انگلیاں ڈالیں۔ اسی طرح یہی زمانہ ہے جب کہ بمبئی کی انگریزی حکومت کے ایما سے انگریزوں نے واٹسن اور کلائیو کی قیادت

باب دہم

میں پیشوا کی افواج سے اشتراک عمل کیا اور بحری قزاق انگریا کی قوت کا، جس نے مدت سے اودھم مچا رکھا تھا، اس کے قلعے چھین کر اور بیڑے کو آگ لگا کر، قلع قمع کر دیا (۱۷۵۶ء) اس مہم کے تفصیلی حالات اورم کی تاریخ میں موجود ہیں، مگر مرہٹوں کے زور کا ایک اور ثبوت وہ معاہدہ ہے جسے اورم نے نقل نہیں کیا یہ پیشوا اور حکومت بمبئی کے مابین ہوا تھا اور اس سے مرہٹوں کے بلند بانگ دعاوی اور زبردست قوت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، مزید برآں پیشوا کے چچا چمنا جی اپا نے پرتگیزوں کو کمزور و ذلیل ہی نہیں کیا بلکہ اب وہ فی الواقع اس فکر میں تھے کہ گوا چھین کر اُن فرنگی مہاجرین کی اولاد کو بالکل ملک سے نکال باہر کریں جو سب سے اول سواحل ہند پر آکر بسے اور کچھ مدت قبل اس قدر مشہور و طاقتور تھے۔ مرہٹوں نے اس منصوبے کا پورا اظہار نہ سہی صاف صاف اشارہ ضرور انگریزوں سے کر دیا تھا۔ اور گو اس کی سیاسی اہمیت بلا واسطہ بہت ہی کم ہو۔ تاہم یہ بات کچھ کم دلچسپ نہیں ہے کہ ان ہلکے پھلکے، ہر جگہ دخل جمانے والے، جنگی پھیری پھرنے والوں پر چند ہی سال بعد جو تباہ کن مصیبت پڑی، اس کے بہت سے نتائج میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شاید مرہٹوں کی اسی، اور محض اسی تباہی کی بدولت پرتگیزوں کی موجودہ گوا کی بستی آئندہ کی تحقیق و تصنیف کے لئے محفوظ رہ گئی جو تاریخ کی عجیب و غریب باقیات میں داخل اور تمدن کا ایک سبق آموز کرشمہ ہے۔

اسی دوران میں نواب نظام کا دربار باہمی رقابت و عناد سے مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا۔ فرنگی حلیفوں سے حسد کی آگ بہت دن سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ پہلے ایک مرتبہ اس کا ظہور بھی ہوچکا تھا۔ اب دوبارہ اس پیرائے میں ظاہر ہوئی کہ نواب صلابت جنگ سے ان کی مرضی کے خلاف، دباؤ ڈال کر ایک قطعی حکم لکھوا لیا گیا کہ بسی نواب نظام الملک کی ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے اور وہ اپنے سپاہیوں کو دکن سے لے کر چلا جائے۔ (۱۷۵۶ء) اس کے بعد کے عجیب کوائف یعنی بسی کا صبر و استقلال۔ مرہٹہ جمعیت کی جو بطور بدرقہ ساتھ کی گئی تھی، دلیرانہ رفاقت۔ تعاقب کا خطرہ دور ہونے کے بعد جب اس دستے کو شکر گزاری کے ساتھ رخصت کر دیا گیا، تو نظام الملک کے لوگوں کا تعاقب میں دوڑ پڑنا۔ بسی کا حیدرآباد پہنچ کر شجاعت و استقامت اور کمال خوبی سے مقابلہ کرنا۔ انتہائی خطرہ جس میں وہ

باب دہم

گھرا ہوا تھا۔ مشرق کی طرف سے اس کی کمکی فوج کا عین وقت پر آجانا۔ آخر میں اس کی فتح اور اقتدار کی بازیابی وغیرہ وغیرہ بہت سی جزئیات ہیں جن کو اورم نے اپنی حد درجہ دلچسپ تاریخ میں بے موقع بے موقع مندرج کردیا ہے۔ البتہ دو تین معاملوں میں اس ہندی انگریزی داستان کا توسی ویدس بظاہر غلطی کھا گیا ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ اورنگ آباد چھوڑنے کے بعد بسی کی حفاظت جس مرہٹہ بدرقے کے سپرد تھی، وہ پیشوا کی ملازمت میں نہ تھا بلکہ نواب نظام الملک کا نوکر تھا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ سیواجی نے بارہا قومیت کے جذبات کو ابھارا اور ہم مذہبی کے واسطے دئے۔ پھر بھی ایک عرصے بعد تک مرہٹے بیجاپور، سلطنت مغلیہ یا نواب نظام الملک کی رعایا بنے رہے۔

(۲)۔ اورم لکھتا ہے کہ پیشوا نے بسی سے اپنی ملازمت میں داخل ہونے کی استدعا کی لیکن اس امر کی معقول شہادت پائی جاتی ہے کہ یہ خیال محض بمبئی کے انگریز حکام کے خوف و توہم کا نتیجہ تھا۔ بجائیکہ بسی کا ایسی تجویز کو پسند کرنا تو درکنار، یہی پوری طرح ثابت نہیں ہے کہ بالاجی کی طرف سے واقعی ایسا کوئی پیام بھیجا گیا تھا۔ یہ بات تو بے شبہہ بالکل صریحی ہے کہ پیشوا کو ان فرنگیوں کے آپس میں لڑا دینے کا مناسب موقع ملتا تو وہ اسے کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اس کا ساحل ملیبار کے انگریزوں سے سابقہ پڑتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ گو ابھی دونوں عارضی صلح ہوگئی تھی، لیکن ساحل کورومنڈل پر فرانسیسیوں اور انگریزوں میں پشتینی عداوت چلی آتی تھی۔ بایں ہمہ یہ کچھ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ پیشوا جیسا محتاط شخص ہر دو فریق سے خفیہ ایسے تعلقات قائم کرے جس میں خود اسے فریق مقابل کے ساتھ جنگ کرنا لازم ہوجاتا۔ دوسرے اس میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ آئندہ دونوں فریق (یعنی فرانسیسی اور انگریز) خود پیشوا سے نہ بگڑ جائیں۔

(۳)۔ اورم نے بیان کیا ہے کہ بسی فی الواقع ابتداءً ساحل کے فرانسیسی اضلاع میں جانا چاہتا تھا لیکن کمک پہنچ نہ سکی اور تعاقب کرنے والوں نے ایسی سرگرمی دکھائی کہ وہ ٹھیرنے پر مجبور ہوگیا اور حیدرآباد میں منزل کی جو آگے چل کر اس قدر مشہور ہوئی، مگر گرانٹ ڈف کی (جو ایک جنگ آزمودہ فوجی نقاد ہے) قطعی رائے ہے کہ بسی نے شروع ہی سے نواب نظام الملک کے موجودہ دارالملک کو اپنے سنبھل کر لڑنے کا مقام تجویز کرلیا تھا اور رفن جنگ

باب دہم

کے اعتبار سے یہ اس کی عین دانائی تھی۔ حالانکہ اگر وہ سیدھا شمالی سرکاروں کی طرف روانہ ہو جاتا تو یہ صورت مقصد کے اعتبار سے بھی غیر عاقلانہ ہوتی اور اس اعتبار سے بھی کہ اس کو بروے کار لانے کے جو ذرائع بسی کے پاس مہیا تھے، وہ کسی طرح کافی اور مناسب نہ تھے۔ بہر حال یہ مسئلہ، اس مواد سے جو ہمیں میسر ہے، غالباً قطعی طور پر طے نہیں ہو سکتا اور محض قیاس و رائے کی بات ہے۔

اسی عروج کمال کے زمانے میں پیشوا نے شاہ انگلستان کے نام دو خط لکھے اور بمبئی کی انگریزی حکومت کے ذریعے ولایت بھجوائے تھے۔ ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں مرہٹوں کے دعاوی کس قدر بلند آہنگ اور میدان سعی کس قدر وسیع ہو گیا تھا۔ دوسرے خط سے یہ بھی مترشح ہو گیا کہ کرناٹک میں ہمارے (= انگریزوں کے) معاملات کی مشکوک حالت اور بنگالے میں انھی دنوں جو مصائب پیش آئے تھے، ان کی اطلاع پا کر پیشوا کو یہ دلیری ہوئی کہ وہ انگریزوں کی مقامی حکومت سے پہلے کی نسبت کم گرمجوشی کا لب ولہجہ اختیار کرے۔ مگر انھی حالات کا اور بھی صریح ثبوت جس سے ہمارے ہم وطن (انگریزوں) کو سخت صدمہ پہنچا، یہ ہے کہ مرہٹوں نے محمد علی سے صوبۂ ارکاٹ کی چوتھ وصول کی۔ مدراس کے حکام نے جہاں تک ممکن تھا، اسے روکنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ محمد علی اپنے خطرناک ہمسایوں سے پوری طرح لرزہ براندام تھا اور انگریزوں کا اس پر یا اس کی ریاست پر اتنا قابو نہیں ہوا تھا کہ وہ مرہٹوں کا مطالبہ مسترد کر دیتے کیونکہ تلوار کے زور سے مرہٹوں کو روکنے کی ان میں کوئی قابلیت نہ تھی۔

میسور اس وقت تک ہندو ریاست تھی۔ اگرچہ وہاں کے دیوان ننجی راج نے راجہ کو محض شاہ شطرنج بنا دیا تھا۔ یہ دیوان ابتدا میں حیدر علی کا مربی تھا اور آخر میں اسی کے ہوس پرست اور کافر نعمت ہاتھوں سے خود بھی اسی انجام کو پہنچا جو اس نے پہلے اپنے محسن (یعنی راجہ) ہیبولا کا کر دیا تھا۔ حیدر علی کی ابتدائی سرگزشت سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ میسور و سرنگا پٹم کی مرہٹہ یورشوں پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے لیکن ہمارا منشا صرف یہ رہا ہے کہ اس رہزنی پیشہ قوم کی ہر سمت میں فروغ و ترقی کا مجمل ذکر کر دیا جائے۔ اس لئے یہاں اتنا لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس ہندو ریاست کی راج دھانی محصور کر لی گئی۔ کئی عمدہ پرگنوں پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا اور گویہ ریاست ان دنوں کچھ بہت بڑی

باب دہم نہ تھی مگر ایک ہی موقع پر پیشوا کے سپاہیوں نے پورے بتیس لاکھ کا خراج جبراً وصول کر لیا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ آنے والے واقعات کا پہلے سایہ پڑنے لگتا ہے، یہی موقع تھا جب کہ میسور کے آئندہ غاصب و جابر نے پہلی دفعہ اپنی اعلیٰ کی نیز جنگی مہارت و مستعدی کا نمایاں ثبوت دیا اور مرہٹوں کے بے پناہ سیلاب کو روک روک لیا تھی کارناموں نے اسے ایک طرف تو اقتدار کامل کے زینے پر چڑھنے میں مدد دی اور دوسری طرف مرہٹہ حملہ آوروں کو، جنھیں گئی جگہ زک ملی، اس کا ابدی دشمن بنا دیا۔

پیشوا کا ایک اور جنگی منصوبہ، جس کی تکمیل غالباً پورے جزیرہ نما کی تاریخ کا رخ بدل دیتی ایک اور ہندو ریاست بدنور کو مسخر کرنا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور کرنل ولکس کے نزدیک اس خاص موقع پر بدنور کی تسخیر غالباً حیدر علی کی آئندہ ساری ترقی کا سد باب کر دیتی۔ اس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ پنپلا نو دولت اتنی جلد اس قدر زیادہ ترقی نہ کر سکتا اگر قبضۂ بدنور کے ساتھ وہاں کے کثیر خزائن اور دوسرے جنگی اسباب و وسائل اس کے ہاتھ نہ آجاتے۔ اس کا خود حیدر علی اعتراف بھی کرتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ پیشوا کا سرلشکر فتح بدنور کے احکام پر عمل نہ کر سکا اور چند ہی روز بعد سعی و کوشش اور فکر و تشویش کے دوسرے مواقع نے اسے پھر ادھر توجہ کرنے کی مہلت نہ دی۔

بسی کا رسوخ ابھی تک حیدرآباد پر محیط تھا۔ لیکن اس کی میعاد پوری ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ لالی روانہ ہو چکا تھا اور بے تاب تھا کہ یہ طویل بحری سفر ختم ہو جس کے بعد ہی اس نے اپنے مددگار کو فوراً دکن سے واپس بلا لیا۔ پھر انگریزوں سے ایک کرب آمیز کشمکش کا آغاز، اور انجام کار فرانسیسیوں کے ہند میں منصوبۂ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

مگر اس خاتمے کی ابتدا لالی کے پہنچنے سے بھی پہلے ہو گئی تھی۔ نواب نظام الملک کے دونوں چھوٹے بھائی ریشہ دوانی اور شورش کر رہے تھے کہ انھیں بھی منصب و جاہ میں حصہ دیا جائے اور وہ بھی ان کے مزے سے بہرہ یاب ہوں۔ فرانسیسیوں کی رقابت میں جملہ وزرا متحد الخیال تھے۔ بسی کو ایک سازش کا پتہ چلا جو صلابت جنگ کو مارنے کے لئے نہیں، تو مجبور و مقید کرنے کے لئے مرتب کی جا رہی تھی۔ اس موقع پر اس فرانسیسی سردار نے ویسی عیاری سے کام لیا اور شرمناک دغابازی کر کے دولت آباد کے ناقابل تسخیر پہاڑی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ مدار المہام شاہنواز خاں کی تحویل میں تھا اور اسے بسی سے سخت عداوت تھی۔ بسی کا ارادہ

باب دہم

تھا کہ ضرورت ہو تو صلابت جنگ کو اسی قلعے میں محفوظ کر لیا جائے مگر پیچ در پیچ سازشوں کی بدولت نئے نئے خلفشار پیدا ہو گئے۔ مدار المہام کی نسبت خیال تھا کہ بسی کے دیوان کے قتل کی سازش میں شریک ہے لہذا فرانسیسی فوج کے ایک دیسی سپاہی نے جواب میں، اُسے (= شاہ نواز خاں کو) قتل کر ڈالا۔ بسی سوچ ہی رہا تھا کہ نواب نظام الملک کو اُس کے مجرم اور مفرور بھائی کے تعاقب میں لے چلنا کس حد تک قرین مصلحت ہوگا، کہ اتنے میں خود اس کے اور فرانسیسی دستے کے مشرقی ساحل کو واپس جانے کے فوری احکام پہنچ گئے جو لالی کے مخصوص حاکمانہ لہجے میں تحریر تھے۔ (۱۷۵۸ء) واقع ہیں شمالی سرکاروں میں فوج رکھنے کی ضرورت تھی مگر جو دستہ وہاں متعین کیا گیا، اس پر کرنل فورڈ نے فوراً بنگالے سے بڑھ کر حملہ کیا اور وہ منتشر ہو گئی۔ نواب نظام الملک اپنے چھوٹے بھائی بسالت جنگ کے ساتھ جسے ابھی دنوں مدار المہام مقرر کیا تھا، فرانسیسی حلیفوں کی دستگیری کے لئے بڑھے کیونکہ وہ اس وقت بری طرح گھر گئے تھے۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور مدد دینے کی بجائے خود ان بھائیوں کے یہ سن کر ہوش گم ہو گئے کہ نواب نظام علیخاں نے شمالی اضلاع میں بڑا بھاری لشکر فراہم کر لیا۔ راستے میں مرہٹہ سپاہ پر ایک بڑی فتح حاصل کی اور اب اپنے دونوں بھائیوں کے عقب میں آپہنچا ہے۔ انگریزوں نے اس موقع پر نواب نظام علیخاں سے اظہار دوستی کیا کیونکہ وہ مشترک دشمن کا دشمن تھا۔ یہ دیکھکر صلابت جنگ اور بھی جلد انگریزوں سے مصالحت اور اتحاد پر آمادہ ہو گیا جس نے لازماً فرانسیسیوں کے دکن سے تعلق کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ انگریزوں کو ایک وسیع اور سرسبز پرگنہ بطور انعام عطا ہوا اگرچہ اس کی حیثیت جاگیر کی سی نہ تھی جیسا کہ فرانسیسیوں کو پورا صوبہ (= شمالی سرکاریں) جاگیر میں مل گیا تھا۔ البتہ جاگیر کے عوض میں فوجی خدمات انجام دینا، فرانسیسیوں پر لازم کیا گیا تھا، اس سے ان کے حریف انگریزوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مستثنیٰ کرا لیا۔ اب صلابت جنگ کو اس کے پرانے حلیفوں نے چھوڑ دیا اور نئے رفیق بھی آڑے نہ آئے تو پھر وہ بہت جلد اپنے بے اصول مگر صاحب عزم بھائی نواب میر نظام علیخاں کے قبضے میں آگیا اور بسالت کی بجائے جو فرانسیسیوں کی جانب مائل تھا نواب نظام علیخاں ہی کو دیوان مقرر کر دیا۔ معزول بسالت جنگ اپنی جاگیر واقع ادونی میں چلے آئے۔

یہ بہت ہی سرسری کیفیت ہے کہ کس طرح نواب نظام الملک کے دربار میں بسی کی

باب ۴ہم

بجائے نواب نظام علیخاں کا تفوق اور فرانسیسیوں کے عوض انگریزوں سے دوستانہ روابط قائم ہوئے مگر اسی سے آئندہ مرہٹوں کے جنوب میں انتہائی فروغ و کامیابی، اور بسالت جنگ کی مصیبت و بدنصیبی کے اسباب سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ اس زمانے میں انگریز نہ آمادہ تھے نہ اس قابل تھے کہ فرانسیسیوں کی جگہ لے لیتے جو اتنے دن تک شمالی دکن میں محسود اور صاحب رسوخ رہے اگرچہ انھیں کسی وقت بھی پورا اطمینان اور استقلال میسر نہیں ہوا۔ البتہ انگریزوں نے اب کمر ہمت باندھ کر پورا تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے قدیم یورپی دشمنوں سے ساحل کارو منڈل پر نمٹ جائیں اور قطعی فیصلہ ہوئے بغیر جنگ سے ہاتھ نہ اٹھائیں پس اپنے نئے حلیف نواب نظام علیخاں کی امید و بیم سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے نہایت معقول اور پُر نفع تجارتی مراعات اور علاقہ تو اینٹھ لیا لیکن اس کی کوئی امداد و دستگیری نہیں کی۔

اسی زمانے میں پیشوا کا بھائی رگھوناتھ شمال سے واپس آیا۔ اس نے وہاں بعض مغالطہ آمیز فتوحات تو حاصل کیں مگر جان و مال کا بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑا۔ اپنی پر چچیرے بھائی سداشیو سے (جو اب عام طور پر بھاؤ کہلانے لگا تھا) سخت اختلاف و مناقشہ پیدا ہوا اور آخر صلح کی صورت یہ نکلی کہ رگھوناتھ نے بھاؤ کا دیوانی عہدہ ہاتھ میں لیا اور بھاؤ نے رگھوناتھ کی فوجی سپہ سالاری سنبھال لی۔ جیسا کہ رگھوناتھ نے بگڑ کر تعریضاً تجویز کیا تھا۔ پونا دربار کے اس خاندانی جھگڑے میں کہا جاتا ہے کہ گھر کی بی بیوں اور اوپر والوں نے بھی حصہ لیا۔ بہر حال آئندہ جو کچھ ہوا، وہ بہت کچھ اسی خانگی مناقشے کا نتیجہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ خود پیشوا کو اپنے چچیرے بھائی (بھاؤ) کی خود رائی اور بے وفائی کہ وہ سب کو چھوڑ کر کولھاپور چل دیا تھا، فراموش نہ ہوئی تھی اگرچہ اس قصور کو وہ معاف کر چکا ہو اور گو بھاؤ کولھاپور سے آجانے کے بعد پیشوا کی دل سے خدمت گزاری کرتا رہا اور خلوص کے ساتھ ساعی رہا کہ پیشوا کے بیٹے سرکاری کاروبار میں نمایاں حصہ لینے لگیں، بایں ہمہ پیشوا کی بیوی اس سے سخت حسد رکھتی تھی۔ ادھر بھاؤ نے جو رگھوناتھ کی شمالی معرکہ آرائیوں پر صاف صاف نکتہ چینی کی کہ ان سے کچھ نفع حاصل نہ ہوا اور مرہٹوں کی نظر میں ایسی لڑائیاں فقط عیش پسندوں کو زیبا ہیں، تو اس پر رگھوناتھ اور اس کی جماعت بہت کبیدہ خاطر ہوئی۔

سداشیو نے نئے میدان عمل میں داخل ہوتے ہی کمر ہمت چست باندھی اور ثابت

باب دہم

کرو یا کہ فوج کی رہ نمائی میں وہ کچھ کم مستعد اور دلیر نہیں ہے ۔ اس میدان میں قدم ران ہونے سے کچھ پہلے اس کی جان لینے کی بھی کوشش ہوئی اور وہ ایک خونی کا شکار ہونے سے بال بال بچ گیا۔ یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ اس شیطانی سازش سے خود اس کے کنبے کے لوگ کس حد تک تعلق رکھتے تھے، لیکن ظاہری سبب یہ ہوا کہ بھاؤ نے ایک شخص مظفر خاں کے پیشوا کی ملازمت میں رہنے کی مخالفت کی اور اس کے ایک رشتہ دار ابراہیم خاں گاردی کو اپنی ملازمت میں داخل کیا جسے مظفر کی ذکی الحس، بدگمان طبیعت اپنا حریف سمجھی اور اُسے ذاتی، نیز عجب نہیں کہ دوسروں کے مقاصد پورا کرنے کی سب سے بہتر شکل یہی نظر آئی کہ بھاؤ کا خاتمہ کردے۔ بارے ایک سلح دار کے اوسان درست رہے اور یہ سردار معمولی سا زخم کھاکے بچ گیا۔ مظفر خاں اور اس کے کارکن کو سزائے موت دی گئی ۔

اس جگہ سلسلۂ تاریخ کو کچھ دیر کے لئے موقوف کرکے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جو کچھ بیان ہوا، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ مرہٹوں کے نئے سپہ سالار کی کیفیت اور وہ حالات تحریر کردیے جائیں، جن میں اس کی نتیجہ خیز و بوقلموں زندگی کا آغاز ہوا ۔

یہ مرہٹہ سپہ سالار سداشیو عرف بھاؤ، چمناجی اپّا کا بیٹا تھا چمناجی تادم مرگ اپنے بھائی باجی راؤ کی حکمت عملی کی جوش و خروش اور قابلیت کے ساتھ تائید کرتا رہا ۔ مرہٹہ تاریخ کا سب سے مشہور وطویل محاصرہ اور اسے فاتحانہ انجام تک پہنچانا، اور پرتگیزوں کے مقابلے شاندار کامیابیاں چمناجی ہی کا کارنامہ تھیں معلوم ہوتا ہے اس فتح و کامرانی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ باپ بیٹے دونوں کے دل میں سواروں کے مقابلے میں، باقاعدہ پیادہ فوج و توپ خانہ کی اہمیت نقش ہوگئی۔ حالانکہ اب تک ان کی قوم میں سوار فوج ہی سب سے بہتر تھی اور زیادہ تر اسی کی بدولت انھیں یہ کچھ ترقی نصیب ہوئی تھی۔ لیکن زمانۂ قریب میں فرانسیسی اور انگریز دونوں کی جنگی کامیابیوں نے اسی خیال کو بہت پھیلایا کہ فوج کی تمام تر نہیں، تو اصلی قوت وکارگری کا مدار ہی اس کے قواعد داں پیادوں اور توپوں پر ہے۔ نواب نظام الملک اور اُن کے بھائی نے بھی یہی رائے قبول کرلی تھی اور گو ٹھیک ٹھیک کام لیا جائے تو، اس کی صحت میں بھی شک نہیں لیکن

باب دہم

اس زمانے میں جو مواقع پیش آئے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کی ان دونوں حریف طاقتوں پر مذکورۂ بالا نظریے کے طفیل نوبت بہ نوبت تباہی نازل ہوئی۔

چنانچہ پہلے نواب نظام علیخاں نے ابراہیم خاں گاردی کو نوکر رکھا جو توپخانے کے فن کا ماہر تھا اور بسی کے زیر تربیت رہا تھا۔ پھر وہاں سے نوکری چھوڑ کر وہ سداشیو کے پاس چلا آیا (اسی سے مظفر خاں کو وہ ناگواری پیدا ہوئی جس کا ذکر اوپر ہماری نظر سے گزرا) اور بھاؤ کا سب سے معتبر سردار بن گیا جس طرح چارلس ڈی بوائڈ کا سردار کیمپو باسو تھا کہ آخر میں اُس کے آقا ہی کی مثل بھاؤ کا انجام بھی سراسر دردناک ہوا۔ بایں ہمہ مرہٹہ سواروں کی قوت پورے عروج پر تھی اور ان کی تعداد میں بھی کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اور ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ نئے طریق جنگ کی خاطر مرہٹوں کے قدیم اور پسندیدہ طریقے میں کس حد تک ترمیم کی جاتی یا اسے بالکل ترک کر دیا جاتا ہے کیونکہ باضابطہ اور بڑا ادعا ہونے کے باوجود، اس نئے طریقے کا لوگوں کی فطرت اور مرہٹہ سرداروں کے موجی اور متلون مزاج کے مطابق ہونا ہنوز بحث طلب تھا۔

سداشیو کی دلیری تہور کے درجے کی تھی مگر ابھی تک اُسے جنگی تجربہ زیادہ نہ تھا بلکہ شاید ہی کسی فوج کو میدان میں لڑانے کی نوبت آئی تھی۔ طبیعت میں بڑی خودپسندی اور ہلکر نے دکن کے بعض انتظامات کے متعلق قیل وقال کی تو اس سے سداشیو کو کاوش سی ہو گئی تھی، دوسری وہ ٹھانے ہوئے تھا کہ رگھوناتھ کے طعنوں کی تردید میں اپنے آپ کو حوصلہ مند و کاروان سپہ سالار ثابت کرے پس شروع سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ عجب نہیں کہ وہ سخت غلطیاں کھائے۔ کیونکہ ایک تو توپ خانے کی بہت ہوا بھری ہوئی تھی اور اس پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا۔ دوسرے اپنے مشیروں کے انتخاب میں قابلیت کے بجائے ذاتی تعلقات کا زیادہ لحاظ رکھتا تھا۔ یہ بھی قرین قیاس تھا کہ کوئی ابتدائی کامیابی پا کر وہ بہت پھول جائے گا اور اپنی جنگی لیاقت اور اصابت رائے کی نسبت جو حسن ظن رکھتا ہے وہ یقین کا درجہ حاصل کر لیگا۔ اور یہ سب آئندہ نقصان اٹھانے کے آثار تھے

اِس کے علاوہ گو دیوانی انتظامات میں وہ نا اہل ثابت نہ ہوا بلکہ اس کے دور میں ملک کی حالت بہتر ہو گئی لیکن معلوم ہوتا ہے یہ تجربہ اور تعلقات مقامی اور

باب دہم

محدود قسم کے تھے۔ ہندوستان خاص کے باشندوں میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سلطنت مغلیہ کے انحطاط کے باوجود بادشاہی سے جو عقیدت راسخ تھی، اسے یا دوسرے تعصبات کو سمجھنے یا ان کی رعایت ملحوظ رکھنے کا کوئی میلان سداشیو میں نہ پایا جاتا تھا اور اس معاملے میں وہ تاریخ عالم کے ایک مماثل دور کے عاقل استروگوتھ یا موقع شناس فرنیک کی بجائے وحشی ونڈال سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔

باقی ذاتی برتاؤ میں، رگھوناتھ سے رقابت کے باوصف وہ پیشوا اور اس کے خاندان کا وفادار رفیق اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اپنے دائرۂ معلومات کے اندر کافی ہوشمند و صائب الرائے تھا مستعد ہونے کے علاوہ اسے یہ بھی پورا یقین تھا کہ مرہٹوں پر کوئی، کم سے کم ایشیائی قوم غلبہ نہیں پا سکتی۔ غرض اس قسم کا سرلشکر تھا جسے تیس برس کی عمر اور مرہٹہ طاقت کے انتہائی عروج کے زمانے میں، اس طاقت کی تقدیر تفویض کی جا رہی تھی۔

اسے ابتدائی معرکوں میں ایسی درخشاں کامیابیاں نصیب ہوئیں اور جن آخری منصوبوں میں اس کا چچا باجی راؤ ناکام رہا تھا، ان کی قریب قریب ایسی تکمیل ہوگئی کہ اگر سداشیو کا سر پھر گیا اور ساتھ ہی اس کا اور اس کی قوم کا بُرا انجام زیادہ سرعت سے قریب آگیا، تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ غالباً وہ بخوبی آگاہ تھا کہ صلابت جنگ اور اس کا ذی اقتدار بھائی نواب نظام علیخاں دوبارہ جنگ میں گھس پڑنے پر تیار نہ ہوں گے، لہذا بذریعۂ رشوت قلعہ احمد نگر کا قبضہ اپنے کارندوں کو دلوا دیا، جو ایک زمانے میں نظام شاہی سلطنت کا پائے تخت اور اکبر کی دکن میں طویل جد وجہد کا نشانہ رہا تھا۔ ایسے شہر کو قسمت کے حوالے کر دینا، نواب نظام علیخاں کی دائمی رسوائی کا موجب ہوتا، لہذا دونوں بھائی اس گستاخ ہندو کو سزا دینے کے لئے بہ عجلت روانہ ہوے اور محاصرے کا بھاری بھر کم سامان بھی ساتھ لائے۔ لیکن فوج کی تعیناتی اچھی نہ تھی اور کئی سخت غلطیاں بھی ہوئیں جن میں سب سے بڑھ کر یہ تھی کہ انھوں نے دوبارہ لشکر کو تقسیم کیا اور آخر کار توپ خانے پر بھروسہ کرنے کے باعث یہ مصیبت اُٹھائی کہ تھوڑی سی جماعت کے ساتھ دشمن کے چالیس ہزار سواروں میں گھر سے رہ گئے۔ ادھر ابراہیم اور اس کا میدانی توپ خانہ آگے بڑھا کہ جس ہتیار پر مغلوں کو ناز تھا اس کا ان سے بھی بہتر اسلحہ اور مہارت

سے جواب دے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ گریز پا اور ٹڈی دل مرہٹہ سواروں کے مقابلے میں مغلوں کا بھاری توپ خانہ پہلے بھی اکثر کچھ نہ کر سکا تھا۔

جیسا کہ قدیم حریفوں کے معرکوں میں ایک زمانے سے ہوتا آیا ہے، وہی اب بھی ہوا لیکن مغلوں کو ایک نئے خطرے سے بھی سابقہ پڑا یعنی ایک جدید دہشت آفریں آلہ اُن کے دشمنوں کا یاور و مددگار نظر آیا۔ مرہٹوں کے سریع السیر رسالے سامان رسد پر پہلے ہی چھاپے مار رہے تھے اور نواب نظام الملک کے سپاہیوں کو لشکرگاہ سے باہر نہ نکلنے دیتے تھے بلکہ جب کبھی وہ ایسا ارادہ کرتے تو اپنے قزاقانہ حملوں سے انھیں تنگ اور تعداد کو جو پہلے ہی کم تھی، اور کم کرتے چلے جاتے تھے۔ ان گھٹاؤں کی طرح آنے اور آندھی کی طرح نکل جانے والے سواروں پر مغلوں کی بھاری توپیں کچھ زیادہ اثر نہ کرتی تھیں۔ بخلاف اس کے صلابت جنگ کی پیوستہ صفوں میں ابراہیم کی ہلکی توپوں نے قیامت بپا کر رکھی تھی اور بے شبہہ اس خیال نے سفر و مسلمانوں کی تلخ کامی کو اور زیادہ گہرا کر دیا کہ وہی توپ خانہ جس پر انھیں خاص طور پر ناز اور بھروسہ تھا، اب زیادہ کارگر صورت میں خود اُن کا دشمن جان ہو گیا ہے۔ اس آفت سے گلو خلاصی نہ ہو سکی تو نواب نظام الملک اور اس کے بھائی کو من مانی شرطوں پر ہتیار ڈال دینے پڑے۔ انھوں نے علانیہ ایسا کرنے سے انکار کیا لیکن طرز عمل سے ایسا ہی ظاہر ہو گیا چنانچہ صلابت جنگ کی سرکاری مہر، شاداں و فرحاں بھاؤ کے ہاتھ میں رکھ دی گئی جس کے معنی یہ تھے کہ شرائط صلح کا اس کو کامل اختیار دے دیا گیا۔ یہ شرطیں سخت ہی نہ تھیں بلکہ کہنا چاہیے کہ ان سے علاؤ دکن کی ان دو حریف طاقتوں کی برابری کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ دشمن کے رہے سہے علاقے کا بڑا جزو مرہٹوں کی طرف منتقل ہو گیا یعنی بیجاپور کا پورا اور اورنگ آباد کا قریب قریب سارا صوبہ، بیدر کا ایک جزو، دولت آباد کا مشہور و مستحکم قلعہ، جس کی پیشواؤں کو مدت سے تمنا تھی، اور بہت سے وہ مقامات جو آئندہ انگریزوں اور مرہٹوں کی لڑائیوں میں مشہور رہے، اس موقع پر بے تکلف مرہٹوں کے حوالے کر دئے گئے۔ (دسمبر ۱۷۶۰ء) اس طرح جو مالگزاری حاصل ہوئی، وہ باسٹھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اس میں سے حسب دستور اکتالیس لاکھ ان سرداروں میں تقسیم کر دی گئی جن کی مشترکہ سعی سے یہ فتح حاصل ہوئی تھی جس نے مرہٹہ سلطنت کو جنوبی ہند میں اپنی انتہائی رفعت کو پہنچا دیا۔

باب دہم

مگر کوہستان ہالیہ میں ایک گھٹا گھر رہی تھی جس کے نصیب میں تھا کہ شمالی میدانوں میں وہ موسلا دھار مینہ برسائے اور ایسی تباہ کن طغیانی لائے کہ یہ مغرور فاتح اور اس کے لشکر اسی میں غرقاب وفنا ہو جائیں اور جزیرہ نما پر مرہٹہ تسلط کی نوخیز امید کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

باب یازدہم

حیدرعلی کا عروج

اُن حملہ آوروں کے طویل سلسلے میں، جنھوں نے شمال مغرب کے معروف راستے سے ہندوستان پر حملہ کیا، آخری حملہ آور تو مقابلے کے لئے اپنی سپاہ فراہم کر رہا ہے، لیکن اس وقفے میں مناسب ہوگا کہ ہم اپنے ناظرین کو بالکل دوسری قسم کی ایک اور داستان بھی سنادیں۔

انگریزی فتح کے قریب ہندوستان کی حالت کا بیان بالکل ناتمام رہ جائے گا۔ اگر حیدرعلی کے عروج کا تذکرہ کافی تفصیل سے نہ کردیا جائے۔ یوں بھی، اول تو اس شخص کے ذاتی کارنامے سُننے سنانے کے لائق ہیں دوسرے ان کارناموں کے ضمن میں غصب حکومت کے جملہ مدارج کی قدرتی تاریخ اس طرح نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ ایسی عجیب مثال اور کہیں نہ ملے گی۔ مزید براں اُس عہد کا رنگ۔ سلطنت کی تباہی کے بعد جو سیاسی عوامل ظہور میں آئے، ان کا آپس میں لازم ملزوم ہونا۔ ایک ایسی سیرت کا نشوونما اور ایسی تنظیم کا آغاز جو تکمیل پانے کے بعد سالہا سال تک، ہمارے (انگریز) ہم وطنوں کی ہندوستان اور خود اپنے وطن میں سخت حیرانی اور خوف کا موجب ہونے والی تھی۔ یہ سب باتیں حیدرعلی کی ابتدائی

باب یازدہم

سرگزشت میں اس طرح آئینہ ہو جاتی ہیں کہ گو ہمارے خاکے کے عام معیار کے مناسب نہ ہو تاہم اسے کافی تفصیل سے درج کرنا مفید بلکہ ضروری نظر آتا ہے۔ دوسرے میرے خیال میں ایسی بلائیں جن کا ہندوستان میں وارد ہونا ناگزیر تھا، اور جن سے دولت برطانیہ کے تسلط نے ملک کو نجات دلائی، ان کی کبھی کبھی تفصیلی کیفیت ذہن نشین کی جاتی رہے تو قوی امید ہے کہ اس دبرطانی، حکومت کی اضافی خوبیوں کی بابت زیادہ صحیح رائے قائم کی جاسکے گی۔

حیدر علی کے تذکرے میں جو عام دلچسپیاں پائی جاتی ہیں، ان کو ایک دوسرے موقع پر میں نے بتانے کی کوشش کی تھی وہی عبارت ذیلی حاشیے میں نقل کئے دیتا ہوں اور یہاں اس یادگار سوانح کے ابتدائی مراحل سے قصے کا آغاز کرتا ہوں:۔

لہ "حیدر علی کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ناخواندہ مسلم آفاقی اپنی ہمت اور نت نئی عیاری سے ہندوؤں کے علاقے میں حکومت کے سب سے بلند مرتبے تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم اس کی عیاریوں کو کتنا ہی برا کہیں، ستائش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ خارجی واقعات سے بارہا مجبور ہوا مگر ہر ناکامی پر غالب آیا اور ہر مصیبت کے بعد راسخ تر عزم اور مخدوش تر قوت کے ساتھ پھر نمودار ہوا۔ پھر اپنی سلطنت میں ایسے نظام حکومت کے ذریعے امن و انتظام قائم کرنے میں کامیاب رہا جو مساوی طور پر سادہ، کارگر اور پُر رعب تھا۔ وہ اپنی مملکت کی حدود بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ وہ تقریباً دونوں طرف سمندر سے جا ملیں اور جنوبی ہند کا بڑا علاقہ اس میں شامل ہو گیا۔ مہاراشٹر کے رقیب اور مہیب لشکروں سے اُس نے کشتیاں کیں اور ایسے ایسے معرکے لڑا جن کی سرگزشت میں حیرت انگیز داستانوں کا رنگ ہے اور جو الفریڈ کے ڈین قوم سے معرکوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ بالآخر برابر کی قوت کے ساتھ انگلستان کے مقابلے میں آیا اور اس جنگ میں بھی منصور و مظفر رہا۔ دوسری مرتبہ اُس کا مقابلہ ہمارے ایسے جرنیل سے پڑا تھا۔ جو (شاید بہ استثنائے کلائیو) سب سے بہتر انگریز سپہ سالار تھا اور گو ان معرکوں میں اسے ایک سے زیادہ مرتبہ شکست ہوئی، تاہم آخر میں تقریباً کامل فتح اسی کے حصے میں آئی۔ غرض آخری دم تک اسی چالاکی، خطرناکی اور زورمندی کی بدولت وہ اپنے پیچھے "وہ نام چھوڑ گیا جسے سن کر دنیا کے دل کانپ جاتے تھے" اور وہ شہرت پائی کہ مشرق میں ہمارا دہ انگریزوں کا) مقابلہ جس قدر جنگی قسمت آزماؤں سے ہوا، ان میں کسی سے بھی کم درجے کی نہ تھی۔" (دی مسلمان اینڈ سٹرا)

جہاں تک تحریری سند ملتی ہے، حیدر علی کا مورث اعلیٰ اس کا پردادا تھا۔ اور بہت سی مشکوک روایات ہیں، اتنا صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام محمد بہلول تھا، وہ شمالی ہند سے ضلع گلبرگہ کے ایک قصبے میں آیا۔ عابد زاہد آدمی تھا۔ ایک چھوٹی مسجد اور اس کے ساتھ سرائے تعمیر کی اسی کی بدولت مالی حیثیت کچھ درست ہوگئی اور اس کے فرزند علی محمد کی شادی گلبرگہ کی مشہور درگاہ کے ایک مجاور سے ہوئی۔ بہلول نے اسی نئے وطن میں، تقدس کی شان کے ساتھ انتقال کیا۔

علی محمد اپنے باپ کی طرح اور جنوب میں چلا آیا اور کچھ عرصے بعد سیرا میں مالگزاری کے پیادوں میں نوکری کرلی۔ اسی جگہ اس کا بیٹا فتح محمد پیدا ہوا جو حیدر علی کا باپ تھا۔ علی محمد نے دوبارہ نقل مکان کیا اور کولار چلا آیا جہاں کچھ کھیتی کیا رہی، اور کچھ سرکاری ملازمت کے ذریعے اس کی خاصی حیثیت ہوگئی۔ یہیں اس نے عمر طبیعی کو پہنچ کر وفات پائی۔ اس کے بعد فتح محمد پر مختلف احوال گزرے لیکن پہلی مرتبہ اسے قلعۂ بالی پور کی یورش میں شہرت حاصل ہوئی۔ (۱۷۲۰ء)، قلعہ لینے کی کوشش میں پہلے ناکامی ہو چکی تھی، مگر اسی کو فتح محمد نے دوبارہ تازہ کیا اور قلعہ تسخیر ہوگیا جس کے صلے میں سیرا کے نام نہاد صوبہ دار درگاہ قلی خاں نے اسے وہیں نائک یعنی فوج بے قاعدہ کے پیادوں کا سردار بنا دیا۔

فتح محمد کو بھی دینی عمارت کا شوق ہوا اور اس کی پہلی بیوی مری تو اس کا مقبرہ، ایک مسجد، تالاب اور باغ بنائے۔ اسی مقبرے میں حیدر علی کے خاندان کی ابتدائی سرگزشت لکھی ہوئی محفوظ تھی۔

فتح محمد کی فوجی نقل و حرکت اور حکم احکام کے حالات بہت متضاد ہیں، لیکن قرائن کہتے ہیں کہ وہ سیرا کے ضلعے کرناٹک کے میدانی علاقے میسورا اور پھر سیرا میں کام کرتا رہا۔ دایک دیسی مصنف کا بیان ہے کہ میسور میں اسے حیدر نامی ایک بھتیجے نے جو میسور کی ہندو حکومت کا ملازم تھا، بلایا تھا) بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اسے کافی شہرت حاصل ہوئی اور عمدہ فوجی عہدوں پر فائز رہا۔ اس کے بیٹے کے سوانح نگار نے فتح محمد کے جو کام اور مناصب بیان کیے ہیں، ان کو بلفظہ درست سمجھنا تو مشکل ہے مگر اس میں شک نہیں کہ خود حیدر علی کی زندگی میں جو یہ طریقہ ہوگیا تھا کہ ہمارے (انگریز) ہم وطن اُسے محض مجہول الاحوال نو دولت بتایا کرتے تھے، وہ صحیح نہ تھا بلکہ حقیقت میں فتح محمد نے جیتے جی ایسا نام اور مرتبہ حاصل

کرلیا تھا کہ جو آگے چل کر اس کے بیٹے کا ممد و محرک ثابت ہو۔ البتہ فتح محمد کی ناگہانی موت پر، جو سیرا کے محاصرین پر شب خون کے سلسلے میں واقع ہوئی، اس کا خاندان مصائب و آلام کا شکار ہوا، جن سے نکل کر حیدر علی ایک نئے مقام اور نئے سرپرستوں میں نظر آیا اور یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی میں ایک خود ساختہ آفاقی کی شان پیدا ہوگئی جو ادنیٰ درجے سے خود بڑھا اور اُس شاندار مرتبے تک پہنچا جس سے حیدر علی آخر میں بہرہ مند ہوگیا تھا۔

باپ کی طرف سے اس کے خاندانی حالات یہ تھے۔ ان میں مذہب، ملکی خدمات، جنگی کارنامے سبھی شامل ہیں، جن کا آئندہ اس کی زندگی میں زیادہ شان و نمود کے ساتھ ظہور ہوا۔ اس کی ماں کا ابتدائی زمانہ بھی، حیدر کی شکل، طوفانی حالات میں گزرا۔ اس کے اجداد اپنے عقائد پر قائم رہنے کے باعث طرح طرح کے مظالم کا شکار ہوئے اگرچہ خود بیٹے (حیدر علی) نے اپنے زمانے میں ایسے ہی مذہبی مظالم کا ارتکاب کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہ بیوی بھورے بالوں والے نوایت قوم سے تھی یعنی بنی ہاشم کے نامی گرامی قبیلے کی اولاد میں۔ اور اس کے اجداد زمانۂ دراز پہلے، یعنی آٹھویں صدی مسیحی ہی میں جور مذہبی سے تنگ آکر عراق عرب چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ ہندوستان چلے آئے اور دیسی لوگوں میں شادی بیاہ کرنے سے پورا اجتناب کیا اور اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے رنگ کی اصلیت کو محفوظ رکھا، اُس کے ماں باپ کوکن سے مشرق کی طرف جاتے ہوئے لٹ گئے اور باپ بدنور کی سرحد پر مار ڈالا گیا۔ ماں مصیبتیں اٹھاتی ہوئی ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ کولار پہنچی۔ جہاں تنہائی اور غریب الوطنی میں خاندانی پابندیاں نہ نبھ سکیں اور اس نے پہلے بڑی بیٹی کو، اور جب وہ لاولد فوت ہوگئی تو دوسری کو فتح محمد کے عقد میں دینا قبول کرلیا ان لڑکیوں کا بھائی جو کوکن سے اس پُر مصائب سفر میں اپنے والدین کے ساتھ تھا، اس کا نام ابراہیم صاحب تھا اور وہ بھی کچھ عرصے بعد خاصا باوقعت آدمی ہوگیا۔ غرض اسی ابراہیم صاحب کی بہن سے حیدر علی اور اس کا بھائی شہباز تولد ہوئے۔

سیرا میں درگاہ قلی کے بعد اس کا بیٹا عبدالرسول باپ کا جانشین ہوا۔ فتح محمد بدستور اس کی ملازمت میں رہا اور اُس نے فتح محمد کے آخری معرکے میں مارے جانے سے

باب یازدہم

پہلے اس کے اہل و عیال کو بالی پور کلاں کے قلعے میں بطور یرغمال رکھ لیا کہ فتح محمد کوئی بے وفائی نہ کرنے پائے۔ اِس میں کوئی خاص بدگمانی مضمر نہ تھی بلکہ یہ مشرق کا عام دستور ہے اور خود حیدر علی اور اس کا بیٹا (ٹیپو سلطان) بھی عادتاً ایسا ہی کرتے تھے۔

صوبہ دار عبدالرسول بھی لڑائی میں کام آیا اور بالی پور کلاں کا قلعہ اس کے بیٹے عباس کے ہاتھ پڑا۔ اُس نے فتح محمد کی بیوہ پر اس بے کسی اور مصیبت میں یہ ظلم کیا کہ اس کے بچوں کو اور شاید خود اسے طرح طرح کی سخت تکلیفیں دیں کہ جو کچھ روپیہ پیسہ اس (بیوہ) اور حیدر علی کے پاس ہو، وہ حوالے کر دے۔ اُن دنوں شہباز کی عمر آٹھ سال کی اور حیدر علی تین چار سال کا تھا۔ کہتے ہیں ان دونوں کو بڑی دیگوں میں ڈال کر اوپر سے یہ دیگیں زور زور سے بجائی جاتی تھیں اور بہانہ یہ تھا کہ ان بچوں کا دل مضبوط کیا جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کمسن بچوں پر ان آوازوں سے کیا گزرتی ہوگی۔ کم سے کم حیدر علی کے حافظے میں تو یہ ٹھنا کے ایسی اچھی طرح محفوظ رہے کہ تیس برس سے زیادہ مدت گزرنے پر بھی وہ ان کو نہ بھولا اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو اصل و سود ملا کے ایسا غیظ و غضب کے ساتھ بدلہ دیا گویا وہ ظلم بالکل تازہ تھا۔

القصہ اس پریشانی میں فتح محمد کی بیوہ اور بچوں کی (حیدر علی کے ماموں) ابراہیم صاحب نے دستگیری کی جو اُن دنوں بنگلور کے قلعہ دار کے ماتحت پیادوں کا کمیدان تھا۔ نوعمر شہباز جوان ہوا تو ایسا ہی عہدہ اُسے میسور میں مل گیا اور بتدریج وہ ترقی اور شہرت ہوئی کہ دو سو سوار اور ہزار پیادے اس کی ماتحتی میں تھے۔ حیدر علی بھائی کے ساتھ تھا مگر اٹھائیس برس کی عمر تک بے کار و بے ضابطہ سی زندگی بسر کرتا رہا۔ کرنل ولکس کا بیان ہے کہ "بارہا وہ ہفتوں گھر سے غائب رہتا۔ اور کبھی تو چھپ کے انتہا درجے کی عیاشی میں غرق رہتا، اور کبھی، جیسا کہ اس کی پوری زندگی کا طور تھا وہ بے تکلف دوسری انتہا یعنی کمال زُہد اور شقت و ریاضت میں وقت گزارتا تھا۔ اور ان دلپسند مشاغل میں ایسے ایسے جنگل چھانتا کہ جن میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

اس طرح، عجیب اور مختلف حالات میں بھی اشخاص و واقعات میں مماثلت نظر آتی ہے۔ یہاں اور اکثر دوسرے موقعوں پر ہیں رو بدا کے سیواجی اور اس کی غیر معمولی تربیت، نت نرالی فطرت، اور روز افزوں ہوسِ جاہ کی دُھن میں، حالات حاضرہ سے

باب یازدہم

حسب دلخواہ کام نکالنے کی لطیف صلاحیت یاد آجاتی ہے۔

اب جنگ کے کھیل سے جس میں ایک دن اس کا ماہر کامل ہونا مقدر تھا حیدر علی کا طبعی لگاؤ بھی ظاہر ہونے لگا اور اس کا پہلا ظہور دیون ہلی کے محاصرے میں ہوا، جہاں وہ اپنے بھائی کی جمعیت میں رضاکار بنکر لڑنے آیا تھا۔ سیواجی کی طرح، اس کی صید افگنی بھی جنگ آرائی سکھانے میں رائیگاں نہ گئی تھی چنانچہ اس معرکے میں "ہر خطرناک کام میں وہ سب کے آگے آگے دیکھا گیا اور ایسے اطمینان اور جمعیت خاطر سے لڑتا رہا جو کسی نوجوان سپاہی میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔" (ولکس)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نہ صرف سواروں میں بلکہ پیادوں کے ساتھ خندقوں میں بھی اس نے جنگی خدمت انجام دی۔ اسی پر نجی راج نے اس ہونہار نوجوان کو اپنی خاص سرپرستی میں لیا اور دو سو پیادہ اور پچاس سوار کی سرداری عنایت کی۔ یہ نجی راؤ ان دو بھائیوں میں سے ایک تھا، جنھوں نے میسور کے راجہ کو شاہ شطرنج بنا کے خود ساری حکومت غصب کر لی تھی۔ اس نے حیدر علی کو اپنی جمعیت بڑھانے کی بھی اجازت دی اور مفتوحہ قلعے کے ایک دروازے کی حفاظت اس کے تفویض کی۔ چنانچہ وہ پہرہ دینے لگا اور تھوڑے ہی دن میں خود اپنی ملازمت کے لئے تین سو بے ڈر پیادے یا برقنداز بھرتی کئے۔ یہ قوم اپنے ملازم رکھنے والوں کے لئے اور خود اپنے لئے لوٹ مار کرنے میں خاص قابلیت رکھتی تھی اور اتفاق سے ان اوصاف سے کام لینے اور آقا کے دندان حرص و آز تیز کرنے کا بہت اچھا موقع بھی جلد ہی میسر آگیا، یعنی نواب ناصر جنگ نے مظفر جنگ اور چندا صاحب پر فوج کشی کی تو میسور کی سپاہ کو بھی حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ حیدر علی اور اس کا بھائی اپنی اپنی جمعیت لے کر حاضر ہو گئے۔ پھر کڑاپا کے پٹھان نواب نے اپنے ولی نعمت ناصر جنگ کو عین میدان جنگ میں قتل کیا اور لشکر بھر میں سخت ہلچل اور پریشانی پیدا ہوئی، تو یہ حیدر علی اور اس کے تازہ بھرتی کئے ہوئے سپاہیوں کے عین حسب مذاق و صلاحیت صورت تھی۔ وہ تاک میں رہے اور جیسے ہی خزانچی نے روپے پیسے کو سنبھال کر ہنگامے کے مقام سے لے جانے کا بندوبست کیا، انھوں نے کسی تدبیر سے اشرفیوں سے لدے ہوئے دو اونٹ اڑا لئے۔ پھر یہ مال اور بہت سے اسلحے لے کر کہ انھیں بھی ایسی ہی عیاری سے حاصل کیا تھا۔ وہ بخیریت دیون ہلی میں کھسک آئے۔

باب یازدہم

اس واقعے کے تھوڑے دن بعد ترچناپلی کے دو مشہور محاصرے ہوئے۔ پہلے محاصرے کے دوران میں جب کہ نواب محمد علی مدد کے لئے ہر طرف تگ و دو کر رہا تھا اور اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ اس کے عہد و پیماں ایک دوسرے کے مطابق اور سچے ہوں اور لڑائی کا اصلی یار انگریز اظہار ہے تھے اس نے میسور سے بھی مدد مانگی اور خفیہ طور پر قرارداد کر لی کہ فرانسیسی محاصرین جبراً ہٹا دئے گئے تو یہ شہر ریاست میسور کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس عہد و پیمان کی انگریزوں کو خبر بھی نہ تھی مگر اسی قرار داد پر میسور کا سپہ سالار ننجی راج خوشی سے مدد دینے کے لئے آمادہ ہو گیا حالانکہ میسور کا راجہ اور خود اس کا بھائی، دونوں کی رائے خلاف تھی۔ پھر جہاں تک فوج کی تعداد اور ساز و سامان کا تعلق ہے اس نے اپنی طرف سے وعدہ پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی چنانچہ توپ خانہ، اور سوار و پیادہ کا بڑا لشکر، کافی روپیہ پیسہ اور ہر قسم کی رسد اپنے ہمراہ لایا، لیکن اس گراں قیمت مہم میں کچھ کامیابی نہ ہوئی اور دوسرے محاصرے کے موقعے پر جو طول طویل معرکے ہوئے ان میں اور بھی سخت نقصان اٹھایا۔ چنانچہ زیادہ تر انھی ناکام قسمت آزمائیوں کا نتیجہ تھا کہ حکومت میسور مشکلات میں مبتلا ہو گئی اور ننجی راج کی شہرت ایسی خاک میں مل گئی کہ خود اس کے ناشکر گزار آورده (حیدر علی) ننجی راج کی جگہ پر قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

ترچناپلی کے پہلے محاصرے میں، حیدر علی کے کارناموں کو اس کے ہم وطن سوانح نگار میر علی حسین نے بڑی دھوم دھام سے، اور بے شبہ مبالغہ آمیز الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ہم اسے ناظرین کی قوت متخیلہ پر چھوڑے دیتے ہیں لیکن دوسرے محاصرے کے آخر میں حیدر علی نے جو کام کئے، ان کی ہمیں زیادہ موثق اطلاع ہے۔ اس محاصرے کا سبب یہ ہوا کہ محمد علی نے انگریزوں کی تائید سے خفیہ معاہدے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ ننجی راج کی عیاری اور فوجی قوت دونوں کی ناکامی اس تمام معرکہ آرائی میں نمایاں ہوئی البتہ فرانسیسیوں اور مرہٹوں نے بار بار ترچناپلی اور اس کے انگریز مدافعین کو حد سے زیادہ تنگ کیا اور ان مصائب سے اکثر اوقات ڈالٹن وغیرہ سرداروں کی مستعدی، لارنس کی قابلیت اور انگریز سپاہیوں کی بہادری نے انھیں نجات دلائی۔ ان میں بھی جانبازوں کا ایک جوق (موسوم بہ "گرے نے ڈیئر کمپنی") سب سے ممتاز تھا جس نے بہت سے مارکے میدانوں میں نام کیا۔ انجام کار مرارراؤ شمال کی طرف ہٹ گیا اور دو پلٹے کی

باب یازدہم

کی معزولی اور گوڈیو کی مصالحت پسندی سے ننجی راج بے یار و مددگار تنہا رہ گیا۔ اس نے جوش تو بہت دکھایا اور شیخیاں بگھاریں کہ انگریزوں کو تن تنہا نیچا دکھاؤں گا لیکن چار و ناچار جنگ سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ ادھر بھائی کے پاس سے یک بہ یک سخت تاکید ی طلاوہ پہنچا کہ فوراً آئے اور سرنگا پٹم کو ایک نئے دشمن سے بچائے جس کی وجہ سے اُسے اور بھی جلدی جانا پڑا۔

اسی دوسرے محاصرے کے آخر میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو حیدر علی سے خاص تعلق رکھتا ہے اور جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسے ہر موقعے سے کام نکالنے کا کیسا ڈھنگ آتا تھا۔ اسی کے ساتھ اپنے ایک رقیب سے بھی اس کے تعلقات معلوم ہوتے ہیں جو اب اتنا بڑھ چلا تھا کہ خود حیدر علی کی ترقی میں رکاوٹ کا اندیشہ ہونے لگا تھا۔[1]

واضح رہے کہ انگریزوں کو سب سے زیادہ اور اکثر یہ وقت پیش آتی تھی کہ قلعے کی فوج کو رسد پہنچائی جائے۔ ترچنا پلی کے جنوب مشرق میں اور قریب ہی ٹونڈمی من نامی ایک رئیس کا علاقہ تھا جس میں گھنے جنگل تھے اور اسی علاقے سے اکثر رسد فراہم کی جاتی تھی۔ مذکورۂ بالا موقعے پر بہت سی رسد لائی جارہی تھی اور جنگل کے سرے تک قافلہ آپہنچا تھا۔ بدرقے میں کثیر جمعیت، جس میں گرے نے ڈیر کمپنی بھی شامل ہے، ہمراہ تھی مگر پھر بھی یہ جمعیت کافی نہ تھی۔ سوئے اتفاق سے ایک نالائق سردار سرلشکر تھا جس نے (اورم اور دوسرے مورخوں کے قول کے مطابق) سپاہیوں کی بدترین ترتیب قائم کی تھی اور جب حملہ ہوا تو اس کے حواس بھی بالکل گم ہوگئے۔ میسوری فوج اور مرہٹے اس قافلے کی گھات میں لگے ہوئے تھے اور جنگل سے آنے والے راستے کے دونوں طرف ان کا رسالہ متعین تھا۔ میسوری فوج میں حیدر علی اور اس کے سواروں کے علاوہ ایک دلیر راجپوت حلیف ہری سنگھ کی جمعیت بھی تھی اور یہ سوار دیوراج کا سپاہی اور اُس کا منظور نظر تھا جس طرح حیدر علی ننجی راج کا ساختہ پرداختہ تھا۔ حملے میں ہری سنگھ پیش پیش رہا اور بڑی ناموری پائی گولہ اندازوں کے جوق (یا گرے نے ڈیر کمپنی) کا تو ستھراؤ ہوگیا۔ سارا سامان رسد لٹ گیا اور دست بدست جنگ میں تمام کی تمام انگریزی فوج ماری گئی

[1] اس سے پیشتر ہی ایک معرکے میں حیدر علی کا بھائی شہباز مارا جا چکا تھا۔

باب یازدہم

یا قید ہوگئی۔ اگرچہ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ حیدر علی معرکے میں کسی سے ہیٹا رہا ہو لیکن قابل بیان بات یہ ہے کہ اپنی طبعی چالاکی سے انگریزی توپوں پر سب سے پہلے اسی نے قبضہ کیا۔ ہری سنگھ راجپوت اس رقیب کی شجاعت کا ہمیشہ استخفاف کرتا، فوجی کام میں اس کے دعوئ ترقی کو غلط بتاتا اور اس کی کامیابی کو محض درباری فن فریب کا نتیجہ کہا کرتا تھا۔ اُسے سخت ناگوار گزرا کہ لڑائی میں توسب سے آگے وہ (یعنی ہری سنگھ) رہے اور دشمن کا زور بھی اُنھوں نے ہی توڑا مگر فتح کی سب سے زیادہ پُرشکوہ غنیمت یہ گھٹیا ساتھی لے اُڑے۔ اس پر جھگڑے نے طول کھینچا جو بہت بڑھا اور بالآخر حیدر علی نے یہ قضیہ اس طرح چکایا کہ ایک توپ ہری سنگھ کے حوالے کی اور تین اپنے پاس رکھیں اور بے شبہ اس معاملے کو بھی احتیاط سے یاد رکھا کہ آئندہ کسی موقع پر زیادہ اچھی طرح سمجھ لیا جائے گا۔

ترچناپلی کے محاصرے نجی راج اور ریاست میسور کے حق میں کیسے ہی نقصان رساں ثابت ہوئے ہوں، حیدر علی کا مستقبل تو ان سے بہت بہتر ہوگیا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے نوبت بہ نوبت واسطہ پڑنے کے باعث اُسے بہت کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ کچھ مدت بعد اس نے فرانسیسیوں سے اسلحہ، ساز و یراق، اور کاریگر بھی لئے اور عجب نہیں کہ انھی کے ساتھ اگر سردار نہیں تو بھولے بھٹکے سپاہی بھی اُسے مل گئے ہوں جو اس کی ترقی پذیری دیکھ کر رفاقت پر آمادہ ہوگئے۔ لیکن یہ بات غالباً مشکوک ہے کہ اسی وقت سے وہ پوری حکومت میسور پر قبضہ جمانے کا صاف صاف طور پر منصوبہ قائم کر چکا تھا اگرچہ استقلال اور یکسانی کے ساتھ اُس کے قدم ضرور اسی سمت پڑ رہے تھے۔ وہ بالکل اُمی شخص تھا مگر حافظہ غیر معمولی اور تخمین کی قوت بھی غضب کی پائی تھی۔ آدمی کی سیرت پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کھائی اور سوجھ بوجھ نے کسی موقع پر جواب نہیں دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی قوت بازو پر کامل اعتماد رکھتا تھا۔ اپنے منصوبوں کی عاقلانہ تائید اور تصویب میں اسے ایک عیار برہمن محاسب سے مدد ملتی تھی جسے کچھ دن قبل ہی اس نے اپنا دیوان یا سارے کاموں کا منتظم مقرر کر دیا تھا اور جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ دیوان کھنڈے راؤ کے نام سے حیدر علی کی تاریخ میں بہت اہم حصہ لے گا۔

اس زمانے میں حیدر علی نے جو انتظام کیا تھا، اس کا کرنل ولکس نے ایسا سبق آموز اور قابلِ تعجب حال لکھا ہے کہ میں بلفظہ ذیل کے حاشئے میں

باب یازدہم

نقل کرتا ہوں[1]۔

اب ننجی راج کو نئے نظام کے خلاف اپنی مدافعت کرنی تھی۔ صلابت جنگ بسے کی خدمات سے بلا تاخیر فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ از روے معاہدات میسور بھی اس کی باج گزار ریاستوں میں داخل تھا۔ لہٰذا جس طرح ناصر جنگ نے میسوری فوج کو میدان میں طلب کیا تھا

---

[1] ان دونوں شخصوں کی رائے اور مشورے سے بالکل باقاعدہ ایک نظام مرتب ہوگیا جس میں غارتگروں کو مقررہ تنخواہ کے علاوہ لوٹ کا نصف مال بھی دیا جاتا تھا اور باقی نصف حیدر علی کی جیب میں جاتا۔ جانچ پڑتال کی مختلف تدبیروں سے یہ تقریباً غیر ممکن ہوگیا تھا کہ کوئی اس لوٹ کے مال کو کلاً و رکنار، جزءً بھی غائب کرسکے۔ لوٹ میں ہر قسم کا مال منقولہ داخل تھا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا انھیں اس میں بھی کچھ تامل نہ تھا کہ دوستوں کی چیز غائب کردیں بشرطیکہ ان پر شبہ نہ ہو اور دشمن پر ہاتھ ڈالنے کی نسبت ایسی چوری میں زیادہ سہولت نظر آئے۔ پھر کسی شے کے لینے میں انھیں عار یا انکار نہ تھا۔ غلے کے قافلوں سے لے کر معمولی مسافروں اور دیہات کے مرد یا عورت بلکہ بچوں تک کے معمولی زیور، کپڑے اور پگڑیاں تک یہ لوگ اڑا لیتے تھے۔ بیل گائے، بھیڑ بکری بہت پُر نفع غنیمت شمار ہوتی تھی۔ گھوڑے اور بندوقیں کبھی قزاقی سے اور کبھی قیمت سے حاصل کی جاتی تھیں۔ ان مداخل میں اضافے کے ساتھ ساتھ حیدر علی کی جمعیت بھی بڑھتی تھی چنانچہ ترچناپلی کو چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے شایانِ شان و منصب ہاتھی، اونٹ، خدم و حشم کے علاوہ، اسے ضروری ساز و سامان کے ساتھ پندرہ سو سوار، تین ہزار باقاعدہ اور دو ہزار بے قاعدہ پیادے اور چار توپوں کا سردار شمار کیا جاتا تھا۔ ان میں سے پانسو سوار اس کی ذاتی ملکیت تھے۔ ریاست کی طرف سے جو مشاہرہ ملتا، اس کی بچت اور نیز دانہ گھانس کی رقم حیدر علی کا نفع تھی۔ توپ خانہ، گولہ بارود، بندوقیں اور باقاعدہ پیادہ فوج، ساز و یراق سے آراستہ رکھنے کے باعث ہر سو سپاہی اور ایک توپ پر اسے علٰحدہ رقم دی جاتی تھی اور معمولی جوانوں سے تنخواہ وغیرہ طے کرنے کا خود اسے اختیار دیا گیا تھا۔ باقاعدہ سپاہیوں کی طرح ان جوانوں سے بھی حیدر علی آدھی لوٹ لے لیتا تھا۔" (ولکس جلد اول صفحہ ۲۵۵ و ۲۵۳)

باب یازدہم

اسی حق سے دکن کے نئے صوبہ دار نے خراج کی باقیات کا مطالبہ کیا اور ان سب کا حساب جوڑا گیا تو وہ اتنی بڑی رقم تھی کہ میسور اپنی گزشتہ کرناٹک کی معرکہ آرائی کے بعد کسی طرح ادا نہ کرسکتا تھا۔ دیوراج نے تہیہ کرلیا کہ مقابلہ کیا جائے اور جب تک اس کا بھائی مدد کو پہنچ سکے، وہ سرنگاپٹم میں قلعہ بند ہوکر نواب نظام کو روکے رکھے۔ میسور کی ریاست کا پانڈی چیری کے فرانسیسیوں سے بھی اتحاد تھا اور اس لئے پسے کو اس کے خلاف جنگ میں حصہ لینے میں بہت تامل ہوا لیکن چونکہ وہ ذاتی طور پر اقرار کرچکا تھا کہ صوبہ دار دکن کی ہر قسم کی خدمت بجالائے گا لہذا تیار ہوگیا۔ یہ بھی اُس زمانے کی سیاسی پیچیدگیوں کی ایک مثال ہے۔ بہر حال، ارادہ کرلینے کے بعد، پھر بسے ادھورا کام کرنے والا شخص نہ تھا۔ اور جس سُرعت اور خوبی سے وہ فوج لے کر بڑھا اُس نے دیوراج کے سارے انتظامات درہم برہم کردیئے ادھر مرہٹوں کے آنے کی خبر گرم تھی کہ وہ بھی اِسی بے محل موقعے پر خراج طلب کریں گے۔ غرض دیوراج کو فوراً صلح صفائی کرنی ضروری ہوئی۔ سخت کشمکش و کوشش سے بہت سا روپیہ جمع کیا گیا۔ مزید کا وعدہ کیا تب صلابت جنگ وہاں سے ٹلا۔

اس عرصے میں ننجی راج دو دو تین تین منزلیں کرتا ہوا سرنگاپٹم سے صرف ۲۵ میل کے فاصلے پر پہنچ گیا تھا، جب مذکورۂ بالا تصفیئے کی اطلاع ملی۔ ریاست کی مالی مشکلات دیکھ کر اس نے سپاہ کی بڑی تعداد کو جسے اب تنخواہ دینا محال تھا، برطرف کردیا۔ حیدرعلی کو موقع ملا کہ ان میں سے بہترین سپاہیوں کو اپنی جمعیت میں بھرتی کرے چنانچہ آئندہ سرکاری خدمت کے موقع پر اس کی قیادت میں پانچ ہزار باقاعدہ اور دو ہزار بے قاعدہ پیادے، ڈھائی ہزار سوار اور چھ توپیں تھیں۔ یہ خدمت ڈنڈی گل کی فوجداری تھی جس میں دیوانی اور فوجی دونوں اختیارات شامل تھے۔ ہر طرف بے انتظامی دیکھ کر اس مقام پر حکومت میسور نے چند ہی سال سے خود قبضہ کیا تھا اور کرناٹک میں خلفشار کی وجہ سے، نواب محمد علی ان حملہ آوروں کو نکالنے سے قاصر رہا تھا۔ غرض حیدر علی، ڈنڈی گل گیا لیکن کھنڈے راؤ سرنگاپٹم میں رہا کہ اپنے آقا کے مفاد کی نگرانی رکھے۔

ڈنڈی گل کے آس پاس کئی پولی گار سرکاری لگان ادا کرنے سے انکاری تھے

باب یازدہم

کہ یہ بہت بھاری رقم ہے۔ حیدر علی نے اول اول ان سے ہمدردی ظاہر کی اور وعدہ کیا کہ حکومت سے کہہ کر اسے کم کرا دونگا۔ اس طرح علاقے کے اندر وہ اور اس کی فوج امن وسلامتی سے داخل ہوگئی۔ پھر اُس نے نہایت اہتمام سے سارے مویشی پکڑوائے اور انھیں بھاری بھاری قیمتوں پر، بعض دفعہ خود ان کے مالکوں کے ہاتھ فروخت کیا۔ اس کے بعد ہی بچارے پولی گاروں پر باقاعدہ یورش کی وہ مدت تک بہت پامردی سے لڑے مگر کشت وخون کے بعد حیدر علی کو پوری فتح ہوئی۔ پھر اس نے حکومت سے داد وستد کرنے میں ان فتوحات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ذیل کے اقتباس سے جس کی مصنف نے عینی شاہدوں سے بہ احتیاط تصدیق کرائی تھی، حیدر علی کی ڈھٹائی کا بخوبی اندازہ ہوگا۔ یہ اس لئے اور بھی قابل ذکر ہے کہ آئندہ خود حیدر علی کے عہد حکومت میں دوسروں نے اسی قسم کے فریب سرنگاپٹم میں کئے تو اس کے طرفدار سوانح نویس میر علی کا بیان ہے کہ حیدر علی نے بہت پیچ وتاب کھایا۔

لہ "حیدر علی کے ڈونڈی گل کے مراسلات، اور مقتولین ومجروحین کی طویل فہرست سرنگاپٹم پہنچی تو ننجی راج نے حیدر علی اور اس کے سرداروں کو جنھوں نے کارنمایاں انجام دئے تھے گراں بہا تحائف ارسال کئے اور خاص قاصدوں کے ہاتھ زخمیوں کی مرہم پٹی کا روپیہ بھیجا۔ اس قاصد کو بہت جلد سمجھا دیا گیا کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔ واضح رہے کہ مرہم یا مدزخم پٹی" کے نام سے جو روپیہ بھیجا جاتا وہ زخمی سپاہیوں کے علاج معالجے اور بسلسلے میں دیا جاتا تھا۔ کیونکہ ہندوستانی سپاہ میں سرکاری ہسپتال یا جراحوں وغیرہ کے بھیجنے کا دستور نہ تھا۔ اس موقع پر ننجی راج نے جو رقم بھیجی وہ چودہ روپیہ ماہانہ فی کس کے حساب سے تھی جب تک کہ زخمی سپاہی کو آرام ہو۔ حیدر علی نے سرکاری قاصد کے معائنے کے لئے اپنے زخمیوں کو فراہم کیا۔ ان کی اصلی تعداد ۶۷ تھی مگر سات سو کے قریب ہاتھ یا پاؤں پر زرد پٹیاں باندھے ہوئے آئے اور نہایت کامیابی سے سوانگ بھرا۔ اسی تعداد کے مطابق نیز جراحوں نے علاج کی مدت جس قدر تخمین کی، اسی حساب سے چودہ روپے فی کس فی ماہ روپیہ دیا گیا۔ جس میں سے حیدر علی نے واقعی زخمیوں کو صرف سات روپیہ فی کس دیا۔ اسی طرح سرداروں کے واسطے جو تحائف آئے تھے، ان کو حیدر علی نے بڑی ہوشیاری سے تقسیم کیا اور لطف یہ ہے کہ ہر سردار کو یقین دلا دیا کہ وہی فوجدار کا سب سے پسندیدہ آدمی ہے۔ اس

باب یازدہم

اس کا دیوانی انتظام بھی اُس غرض کے لئے جسے بظاہر اب اُس نے قطعی طور پر سامنے رکھ لیا تھا، بخوبی مناسب تھا۔ یعنی اب وہ اتنا معقول سرمایہ فراہم کرنا چاہتا تھا کہ اپنے ذاتی لشکر کے لئے کافی ہو اور اس لشکر سے ملکی اقتدار کا پلڑا اپنی طرف جھکایا جا سکے چنانچہ کرنل ولکس ہی کے قول کے مطابق سب سے پہلے ڈنڈی گل میں سرنگھم، ترچناپلی اور پانڈی چیری سے اعلیٰ درجے کے کاریگر بلائے جو فرانسیسی استادوں کے ماتحت کام کرتے تھے اور ان سے باقاعدہ توپ خانہ، گولہ باروت سازی اور سمل تیار کرنا شروع کیا۔" مگر بعض دوسرے مصنف جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا، حیدر علی کی ان کوششوں کو، جن میں آئندہ جدوجہد کی تیاریوں کا اہتمام مضمر تھا، اور بھی کئی سال پہلے کا بتاتے ہیں۔

سپاہ کی کثرت کو کھنڈے راؤ اور خود حیدر علی اپنی حسن کارگزاری بتاتے تھے حیدر علی مفوضہ آمدنی ہی سے کسی نہ کسی طرح اس کے مصارف پورے کر لیتا تھا۔ دوسرے اور اس میں بھی شک نہیں کہ پرانے اصول پر اتنی بڑی سپاہ مہیا کی جاتی تو وہ بھی اتنی کارگزار نہ ہو سکتی تھی جتنی حیدر علی کے عمدہ انتظام اور ہمہ وقت نگرانی کی بدولت یہ فوج ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ سوال بالکل الگ ہے کہ کارگزار کس کے لئے اور کس غرض سے ؟

القصہ تقریباً دو سال (۱۷۵۵ء و ۱۷۵۶ء) اسی طرح گزرے کہ حیدر علی ڈنڈی گل میں اضافۂ سپاہ سے اپنی قوت مضبوط کرتا رہا اور کھنڈے راؤ کی وساطت سے فوج کے مصارف کے لئے مزید مالگزاری کی منظوریاں ملتی رہیں۔ ساتھ ہی حسن انتظام اور سپاہیوں سے کام لینے کی سلیقہ مندی میں اس کی شہرت بڑھتی رہی۔ تاہم ابھی باقاعدہ جنگ میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ تمام زمانے میں کھنڈے راؤ برابر اپنے آقا کے کارنامے نُنجی راج کے سامنے بڑھا چڑھا کے بیان کرتا اور علاقے میں فتنہ و فساد کی مبالغہ آمیز کیفیت سنا کر مزید افواج کی ضرورت ذہن نشین کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایسے اضافے کی وقتاً فوقتاً اجازت اور ان کے مصارف کے لئے دوسرے اضلاع سے مالگزاری کی منظوریاں دی جاتی تھیں۔ نئی بھرتی کے معاینے کے واسطے ہمیشہ خاص آدمی مقرر کئے جاتے تھے چنانچہ ایک موقع پر جہاں خاں نے یہ عیاری جسے وہ "گشتی جائزہ" موسوم کرتا ہے خود دیکھی کہ دس ہزار آدمیوں کو پھرا پھرا کے اٹھارہ ہزار کی گنتی کھوا دی گئی۔" (ولکس جلد اول۔ صفحہ ۲۵۳ و ۲۵۴)۔

باب یازدہم

اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اُس کے دشمن اور نکتہ چیں رقیب کہتے تھے کہ یہ قابلیت اس میں مفقود ہے۔ دیوراج اسے مہربانی کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا اور دیوراج کا منہ چڑھا سردار ہری سنگھ بھی ''حیدر علی نائک'' کی تحقیر و تنقید میں ویسا ہی سرگرم تھا۔ بہرحال، دو سال ختم ہونے پر مُلکی پیچیدگیوں کی وجہ سے اسے سرنگا پٹم آنا پڑا۔ اصل یہ ہے کہ ریاست کا اصلی وارث ان برہمن بھائیوں کی قید سے نکلنے کا میلان ظاہر کرنے لگا بلکہ خود انھیں قید کرنے کے مشوروں پر کان دھرنے لگا تھا (کیونکہ کسی برہمن کو قتل کرنا ایک ہندو ریاست میں انتہائی کارروائی ہوتی۔) ان مشوروں کی خبر دونوں بھائیوں کو بھی ہوگئی۔ دیوراج نے ڈانٹ ڈپٹ کی نرم تدبیر آزمائی لیکن راجہ نے کلّہ بکلّہ جواب دیا اور اپنے پاس بھروسے کے سپاہی جمع کرنے شروع کئے۔ تب اس کی رانی کو جو دیوراج کی بیٹی تھی، مشورہ دیا گیا کہ زہر کھلا کے اپنے شوہر کا خاتمہ کردے۔ یہ اطلاع اور پھر رانی کا سخت ناراضی اور سراسیگی سے اس تجویز کو مسترد کرنا تو یقینی ہے لیکن یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ ننجی راج نے کس حد تک اس تجویز میں خود حصہ لیا یا یہ کہ دیوراج بھی اس کو پسند کرتا تھا یا نہیں۔ غرض یہ منصوبہ نہ چلا تو حیدر علی کے مربی (ننجی راج) نے خود اپنے بھائی کی رائے اور مرضی کے خلاف، راجہ کے محل پر سخت و گستاخانہ حملہ کیا۔ زنان خانے کے احترام تک کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور راجہ کے نوکروں کی بجائے جبراً اپنے آدمی مقرر کردیے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ بےبس راجہ کو مجبور کیا کہ سرکاری طور پر ان کارروائیوں پر اظہار خوشنودی کرے۔ یہ سانگ اور ذلتیں دیکھکر اس کے بدنصیب خسر کو بھی سخت اذیت ہوئی اور وہ غصے میں اپنے بال بچوں کو لیکر سرنگا پٹم سے چلا گیا اور مغربی گھاٹ کے دامن کوہ میں بہ مقام ستی منگلم بود و باش اختیار کرلی۔ چونکہ روپیہ کم تھا اس لئے وہیں سے دیوراج نے بعض پرگنوں کی مالگزاری جو حیدر علی کے تفویض کئے جاچکے تھے، اپنے واسطے طلب کی۔ اسی پر کھنڈے راؤ نے اپنے آقا کو صلاح دی کہ ڈنڈی گل سے خود آئے اور صدر مقام پر اپنے حق کے لئے جد و جہد کرے۔

لیکن ایک دوسری مصیبت جس کی وجہ سے اس کا سرنگا پٹم آنا اور بھی ضروری ہوگیا، یہ آئی کہ مارچ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے لشکر کشی کی جس کا بہت دن سے

باب یازدہم

اندیشہ تھا۔ پہلے کی طرح پھر انھوں نے بھاری نذرانہ طلب کیا اور ادھر سے عذر ہوا کہ اتنا روپیہ بھرنا غیر ممکن ہے۔ پھر سرنگا پٹم کو انھوں نے آگھیرا اور چونکہ فرنگی بھی حملہ آوروں کے ساتھ تھے لہذا خود نجی راج کی قیادت میں محصورین کے پُرجوش و استقامت حملے بھی کارگر نہ ہوے اور تھوڑے ہی دن میں اسے صلح بغیر چارہ نظر نہ آیا۔ بہت کم روپیہ اور زیورات فراہم ہو سکے تھے، لہذا میسور کے شمال میں کئی بڑے بڑے پرگنے مرہٹوں کو کفالت میں دیے گئے۔ تب ان کا بڑا لشکر رخصت ہوا لیکن چھ ہزار سوار اور پیشوا کے دیوانی محصل اُن پرگنوں میں متعین کر دیئے گئے۔ یہی زمانہ تھا جب حیدرعلی صدر مقام میں پہنچا۔ اُس نے وثوق سے کہا کہ اگر مجھے اور میری فوج کو پہلے سے بُلا لیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ برسات آنے پر مرہٹہ سواروں کو جبراً نکال دینا چاہیے تاکہ بارش اور ندیوں کے چڑھ جانے سے کافی مہلت میسر آسکے اور خود حیدرعلی کمک پہنچانے کی تیاری کرلے۔ اور اتنے دن حیلے بہانوں سے مالگزاری روک رکھی جائے۔ یہ مشورہ قبول ہوا اور اب اس نے دیوراج سے خود اپنے پرگنوں کا تصفیہ کرنے کی فکر کی۔ کچھ مدت پہلے پال گھاٹ کے نائر راجہ نے حیدرعلی سے اپنے دشمنوں کے خلاف مدد مانگی تھی اور حیدرعلی نے اپنے ایک سردار مخدوم صاحب کو فوجی جمعیت دے کر وہاں بھیجا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ پہلی مسلمان فوج تھی جو پال گھاٹ کے علاقے میں داخل ہوی۔ اگرچہ کنانور کا رئیس یقیناً مسلمان تھا۔ القصہ مخدوم صاحب نے راجہ پال گھاٹ کی طرف سے کوچین اور کالی کٹ کی ریاستوں پر حملہ کیا اور وہاں کے رئیسوں نے دب کر دو لاکھ روپیہ دینے کا اقرار کیا۔ یہ رقم قسطوں میں ادا ہونے کی قرار داد ہوئی تھی لہذا مخدوم صاحب نے جو اپنے آقا کی طرح روپے پیسے کے معاملے میں رورعایت کرنے والا شخص نہ تھا، جب تک پوری قسطیں وصول نہ ہوجائیں اس وقت تک ان علاقوں سے جانے سے انکار کیا۔ تب اِن راجاؤں نے دیوراج سے درخواست کی کہ اگر وہ اِن تکلیف دہ مسلمانوں سے نجات دلادے تو جو روپیہ انھیں دینے کا وعدہ تھا، وہ دیوراج کو ادا کر دیا جائے گا۔

یہی زمانہ تھا جب حیدرعلی موقع پہ پہنچا اور یہ قرار داد ہوئی کہ مذکورۂ بالا رقم دیوراج لے لے اور جن پرگنوں کی مالگزاری اس نے حیدرعلی سے چھین لی تھی۔ وہ واپس

باب یازدہم

اس کے حوالے کرے۔ کیونکہ واقع میں پال گھاٹ کے جنگی مصارف کے تین لاکھ روپے بھی حکومت میسور پر واجب الادا تھے پھر دیوراج کی طرف سے ہری سنگھ، کوچن (ملیبار) بھیجا گیا اور یہ دوسرا موقع تھا جب کہ اس راجپوت نے نمایاں طور پر اپنے رقیب کا راستہ کاٹا اور اس کی جگہ لی۔

حیدرعلی واپس ڈنڈی گل آیا اور اپنے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہوگیا۔ اس کا مقصد فی الوقت یہ تھا کہ مدورا کو اپنے علاقے میں شامل کرلے۔ مگر وہاں محمد یوسف سے مقابلہ پڑا جو خود بھی اس عہد کا ممتاز شخص گزرا ہے۔ یہ انگریزوں کا قابل ترین حامی تھا اور دیسی سپاہیوں کی فرنگی اصول پر اُسی نے تنظیم کی تھی۔ اس کی فوجی جمعیت کم تھی پھر بھی حیدرعلی کو قطعاً پسپائی نصیب ہوئی۔ وہ ناکامی سے ہمت ہارنے والا آدمی نہ تھا اور دوبارہ مدورا پر حملے کی فکر میں تھا بلکہ اس غرض سے ایم ایس ترو کی سرکردگی میں فرانسیسی کمک بھی اس کے پاس پہنچ گئی تھی کہ اتنے میں دوبارہ شدید سرکاری ضرورت سے سرنگاپٹم کی طلبی آئی جہاں حکومت کا خزانہ خالی تھا اور فوج والے اپنی بقایا تنخواہ کا شور مچا رہے تھے۔ حتیٰ کہ اب انھوں نے ننجی راج کے دروازے پر دھرنا دے کر بیٹھنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا تھا اور یہ بدقسمت وزیر اپنی ہوس اور سوئے تدبیر نیز مرہٹوں اور نواب نظام الملک کی لائی ہوئی مصیبتوں کے باعث عجب سیاسی پریشانی اور چکر میں پھنس گیا تھا۔ خود اس کا بھائی جو غصب حکومت کی سازش میں اس کا شریک تھا، اب بگڑ کے الگ جا بیٹھا تھا۔ اصلی فرماں روا پہلے ہی معطل مگر اپنی اس حالت سے ناخوش اور بیقرار ہو رہا تھا۔ ظاہر میں ریاست کے سارے ملکی اور فوجی اختیارات ننجی راج کے ہاتھ میں تھے لیکن خود اس کی حالت یہ تھی کہ ایک قدیم ایشیائی رسم کے آگے بے دست و پا رہ گیا اور جھلائے ہوئے سپاہیوں نے جو سر سہلانے، بھیجا کھانے پر تلے ہوئے تھے، اسے گھیر کر فی الواقع فاقہ کشی کی نوبت پہنچا دی۔

حیدرعلی فوراً، جس قدر فوج ممکن تھی جمع کرکے، ریاست کے صدر مقام میں آگیا (۱۷۵۹ء) کھنڈے راؤ سے قرار داد ہوگئی تھی اور وہ ستی منگلم میں اس سے ملاقی ہوا۔ پھر ان دونوں نے مل کر دیوراج کو سمجھایا کہ ایسے نازک وقت میں جب کہ دونوں بھائیوں کا اقتدار خطرے میں نظر آتا ہے، وہ ننجی راج سے

مصالحت کرلے۔ بوڑھے دیوراج کی قوت جسمانی جلد جلد زایل ہورہی تھی اور جلبندھر کا مرض ہوگیا تھا۔ وہ شہر میسور تک آیا اور ادھر حیدرعلی اپنے دیوان کے ساتھ نبجی راج کے پاس پہنچا کہ شرائط مصالحت طے کی جائیں۔ نبجی راج نے شہر کے ذخائر رسد فروخت کرکے دھرنا کے عذاب سے وقت کے وقت جان چھڑالی تھی مگر ابھی تک بہت پریشان تھا اور کافی ذلیل ہوچکا تھا۔ اس حالت میں راجہ سے اپنی شرمناک زیادتی کی پوری پوری معافی مانگنے پر رضامند ہوگیا اور قلعے کی توپوں نے صلح کی سلامی اتاری۔ دیوراج کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا گیا اور سرنگا پٹم سے جو جلوس روانہ ہوا نبجی راج اور حیدرعلی اس میں سب سے آگے تھے۔ مگر یہاں پہنچ کر ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ دیوراج نے وفات پائی۔ دغا سے مارنے کے شبہات بھی کئے گئے لیکن کرنل ولکس کے نزدیک ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ اگرچہ یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ایسے نازک موقع پر دیوراج کی موت حیدرعلی کے لئے کم سے کم نہایت سازگار ہوئی۔

فوج کی طرف سے نبجی راج کو ابھی تک قلق تھی وہ پہلے ہی سخت پریشان اور رنج ہورہا تھا۔ بھائی کی موت کا اسے واقعی بہت صدمہ ہوا مزید براں حیدرعلی کی اپنے ساتھ وفاداری پر حد سے زیادہ بھروسہ رکھتا تھا پس فوج کا معاملہ بھی تمام وکمال اپنے اسی مطلب ہوشیار آوردہ کے تفویض کیا۔ یہ نہایت اعلیٰ درجے کا موقع تھا اور حیدرعلی جیسا شخص اس کو خالی جانے دینے والا نہ تھا۔ دوسرے ایسی دشواریوں کو حل کرنے کی اس میں خاص قابلیت تھی۔ وہ ذاتی طور پر بالکل بے خوف، ارادے کا پکا، یار باش، زندہ دل، کائیاں اور ان سب چالاکیوں سے خوب واقف تھا جو فوج والے، حکام کو لوٹنے کے لئے کام میں لاتے تھے۔ پس اس نے چند ہی روز میں واقعی مطالبات تو پورے کردیے اور راجہ اور نبجی راج کو صدہا ایسے دعووں سے جن کی بنیاد مکر پر تھی، نجات دلائی۔ نیز ایسے لوگوں کی بہت بڑی جماعت کو برطرف کردیا جو فتنہ وفساد میں سب سے آگے اور واقعی جنگ کے میدان میں کسی کام کے نہ تھے۔ اس کارگزاری کا حیدرعلی کے مستقبل پر بڑا اثر پڑا جیسے کرنل ولکس نے زور دے کے واضح کیا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ "ان سب معاملات کے تصفیئے میں حیدرعلی نے وہ طرز عمل بنائے رکھا کہ ہر شخص اسے اپنا محسن سمجھتا تھا۔ نبجی راج بھائی سے مصالحت کرادینے اور بہت سی پریشانیوں سے نجات

دلانے میں اس قدر تنگ دو دیکھ کر ممنون احسان ہوا۔ فوج والوں کو محسوس ہوا کہ ان کی چڑھی ہوئی تنخواہیں وصول ہوسکتی ہیں تو صرف اس کی مہربانی اور کوشش سے۔ راجہ کو نظر آیا کہ نبخی راج کے تشدد سے بچانے اور حمایت کرنے والا کوئی ہے تو حیدر علی۔ اور آبادی کے ہر طبقے میں اس پر نظر پڑنے لگی کہ ملک میں دوبارہ فلاح و بہتری کی صورت نکلے گی تو اسی کی سعی و قابلیت سے نکلے گی۔

حقیقت میں، وہ چاہتا تو غالباً اسی وقت کامل اقتدار کا خود مالک ہوسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے سپاہی جن پر یہ بھروسہ کرنا ممکن تھا کہ اس کے منصوبے پورے کرنے میں حکم کی تعمیل کریں گے، وہ قلعے پر فی الواقع قابض تھے۔ لیکن حیدر علی جانتا تھا کہ ابھی اس کام کا صحیح وقت نہیں آیا ہے اور وہ ایسا ناعاقبت اندیش نہ تھا کہ قبل از وقت باعلانیہ حکومت پر ضرب لگاتا۔ البتہ ایک کام اُس نے ضرور کیا جو اس کے بلند منصوبوں کی تکمیل کے لئے ضروری تھا، اس کی یقیناً اسے مدت سے فکر تھی۔ اودھر ولیوراج کی وفات اور اس موقع پر اپنا بڑھا ہوا اقتدار دیکھ کر بھی اسے کرگزرنے کی جسارت ہوئی۔ یاد ہوگا کہ ہری سنگھ بیلیا ربھیجا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آکر اب وہ کوئم بتور میں اطمینان سے خیمہ زن تھا۔ حیدر علی نے مخدوم صاحب کو ایک بڑی فوج دے کے روانہ کیا جس کا ظاہری مقصد تو ڈنڈی گل واپس جانا تھا لیکن حقیقت میں اس راجپوت پر شبخون مارکر اُس کا اور اُس کی جمعیت کا بے دردی سے خاتمہ کرنا منظور تھا۔ چنانچہ اس میں پوری کامیابی ہوئی۔

یہاں یہ بیان کردینا چاہیئے کہ حیدر علی کے ہموطن مداح نے اس واقعے کا زمانہ صحیح نہیں بتایا اور اسے دھرنا کے قضیئے سے متعلق کرکے تاویل و معذرت پیش کی ہے لیکن یہ عذر صریحاً ایسا ہی لنگ ہے جیسا کہ یہ فعل صریحاً ظالمانہ تھا۔ ہم کو حیدر علی کے اوصاف سے انکار نہیں اور یہ بھی تسلیم ہے کہ وہ بلاد بکشت ذہن سے عادتاً احتراز کرتا تھا۔ لیکن اس کی پوری سوانح پر غور سے نظر ڈالی جائے تو ضرور یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ کسی مسلمہ دشمن کو دفع کرنے اور اقتدار کامل کے حصول میں اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے وہ کسی جرم کے ارتکاب میں چوکنے والا آدمی نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی بخوبی آشکارا ہے کہ اپنی کارآمد خدمات کا بہ اصرار اجر طلب کرنے میں بیجا شرم و انکسار اس کے مانع

باب یازدہم

نہ ہوسکتے تھے۔ ان خدمات میں اس کی کارگزاری کے ساتھ حسن اتفاق کا بھی دخل تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ انھیں اپنے مربی اور ریاست کے ساتھ اپنی رفاقت و جانفشانی کا نتیجہ بتاتا تھا چنانچہ ملیبار کی مہم کے عوض میں متوفی دیو راج سے جو تین لاکھ روپیہ ٹھیرا تھا اس کی بجائے حیدر علی کو بلا دقت کو ئمبٹور کا پرگنہ عطا کر دیا گیا اور ملکی احسانات کے جلدوئے نیز غیر محفوظ سرحد کو بچانے کی امید میں قلعۂ بنگلور کی قیادت اور اُس کے پر گنے کی مالگزاری بھی مرحمت ہوئی۔ ریاست میسور میں بنگلور، صدر مقام کے بعد سب سے بڑا شہر تھا اور اِدھر کے پرگنے مرہٹوں کے تفویض کر دئے گئے تھے لہذا قیاس غالب یہ تھا کہ وہ حیدر علی کو ان علاقوں میں جن کو اپنا مال سمجھتے تھے، چین سے بیٹھنے نہ دیں گے۔

یہی ہوا کہ برسات گزرتے ہی وہ گوپال ہری اور انند راؤ کی سرکردگی میں دوبارہ آ پہنچے (۱۷۵۹ء) اور میدانی علاقے پر بلا تاخیر قبضہ کر کے اپنے کثیر سواروں سے بنگلور کی ناکہ بندی شروع کی۔ ان کی پیادہ فوج نے سینا پٹم پر قبضہ کیا جو سرنگاپٹم سے صرف چالیس میل دور اور بنگلور سے اور بھی نزدیک واقع تھا۔ سرنگاپٹم جانے کے راستے یہاں سے زد میں تھے جس سے اس مقام کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔

اب حیدر علی کے لئے موقع تھا کہ نجی راج سے جو وعدے کئے تھے، انھیں پورا کرے یعنی ان زبردست حملہ آوروں کی دوبارہ آمد پر کلہ بہ کلہ جنگ کرے اور اسی کے ساتھ نکتہ چینیوں کی جو اُس کی جنگی قابلیت میں شک وشبہہ رکھتے تھے، تردید کر دکھائے۔ دوسرے یہی وہ موقع تھا کہ جو مرتبہ کرام ویل کو آئرستان اور اسکاٹ لینڈ کی معرکہ آرائیوں کے بعد حکومت انگلستان میں حاصل ہوا وہی مرتبہ مرہٹوں سے لڑکر ریاست میسور میں حیدر علی کو میسر آسکتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر اُن پر فتح پانا میسور پر عملاً قبضہ ہو جانے کے مرادف تھا۔ کیونکہ پھر نجی راج کو دستا بتا کے راجہ کو اسی طرح اپنی مٹھی میں لے لینا ممکن تھا جس طرح کرام ویل نے طویل پارلیمنٹ کو چھانٹ دیا اور اس کی ذُنَل (Rump) کو برخاست کر کے عوام پر جابرانہ حکومت قائم کرلی اس لئے کہ پہلے اس حکومت کو پارلیمنٹ نے غصب کرلیا تھا اور اسی کے خلاف کرام ویل نے اہل ملک کی حمایت کا جھنڈا

باب یازدہم

بلند کیا اور پھر اپنا ذاتی قبضہ جمالیا۔
سپاہیوں کا گزشتہ قضیہ چکانے میں ایک حد تک یہ تدبیر بھی کی گئی تھی کہ ان کے سرداروں سے باقیات اداکرا دی گئیں اور حکومت نے ان سرداروں کو آئندہ اُن کا قرض چکادینے کی ذمہ داری لی۔ لیکن یہ قرضے ابھی تک ادا نہیں ہوسکے تھے اور اب جو مرہٹوں سے لڑنے کی سخت اور نئی مہم پیش آئی تو اکثر سرداروں نے صاف انکار کر دیا کہ جب تک وہ روپیہ ادا نہ ہوگا ہم لڑائی میں نہ جائیں گے۔ اس کشمکش نے پھر طول کھینچا اور دیوان ننجی راج کو پھر دھرنا کی مصیبت بسر پر تلی ہوئی نظر آنے لگی۔ عجب نہیں کہ حیدرعلی سرداروں کی اس عدم تعاون کی تحریک کو اندر ہی اندر شہہ دیر ہا ہو لیکن دوسری طرف اُس نے اپنی خدمات پیش کیں اور سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو بھی اُس نے یہ کہہ کر کہ جو کچھ تنخواہ باقی ہوگی وہ بلا واسطہ اُنھی کو ادا کر دی جائے گی، رضامند کر لیا حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اصلی مشکل سرداروں کا قرض ادا کرنا ہے نہ کہ سپاہیوں کا۔ مگر اس سے تجاہل کیا۔ ادھر خود اُس کے تقرر سے ناراض ہو کر بہت سے عالی خاندان عہدہ داروں نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے دشمن یقین رکھتے تھے کہ یوں بے یار و مددگار رہ جانے کے باعث حیدرعلی سے کچھ بنائے نہ بنے گا مگر ثنا خوانوں کو وثوق تھا کہ وہ سب مشکلات پر غالب آجائے گا۔

حیدرعلی نے سب سے پہلے تو صدر مقام کو آڑ میں لینے کا بندوبست اس طرح کیا کہ اپنے ماموں میر ابراہیم صاحب کو ملاولی میں مقرر کیا اور ایک سرفروش مغل لطف علی بیگ کو مدد بھیجا جس نے حسب ہدایت خوف و سراسیمگی کا ایسا بہانہ بنایا کہ مرہٹے مطمئن اور غافل ہوگئے اور اس وقت لطف علی یکایک سینا پٹم پر جا پڑا۔ یہ تاخت ایسی اچانک ہوئی کہ فریقین کو قریب قریب کوئی نقصان نہ پہنچا اور مرہٹوں کو بھگا کر لطف علی اس مقام پر قابض ہوگیا۔ اسی چھاونی کے عقب میں حیدرعلی نے اپنی سپاہ مجتمع کی اور گوپال ہری کو اس طرح لگا کے لایا کہ وہ بنگلور کا محاصرہ چھوڑ کر ادھر متوجہ ہوگیا۔ گوپال کے لاؤ لشکر کے مقابلے میں حیدرعلی کی جمعیت بہت کم تھی مگر میسوری سپہ سالار نے اسے کسی اچھے موقع پر نہ آنے دیا اور فرنگی طریق جنگ کے تجربے سے فائدہ

اٹھاکر لشکر کے گرد مورچے اور خندقیں تیار کریں کہ مرہٹہ سواروں کی شدید و ناگہانی یورشیں کچھ نہ بگاڑ سکے۔ پھر دن بھر اپنی جمعیت اصلیہ کو لئے خاموش بیٹھا رہا اگرچہ اس کے من چلے سوار برابر ہر طرف چکر لگاتے رہے اور شہسواری کے کمالات نیز قتل و غارتگری میں مرہٹوں سے بازی لے گئے۔ اس کے بعد جب رات کی تاریکی نے خفیہ اقدام کو آسان کر دیا اور اس کے بے ترتیب دشمن جن کی پاسبانی کا انتظام بھی ناقص تھا، غفلت کی نیند سو گئے تو اس وقت حیدر علی اپنے منتخب اور مرتب سوار لے کر آ پڑا اور ان آتش بار اسلحہ سے، جنھیں چلانے کی بجائے مرہٹے ان سے خوف کرنا زیادہ سیکھ چکے تھے، ان کے ٹکڑے اُڑا دئے۔ پھر ان کی تباہی اسی پر ختم نہیں ہوئی نہ حیدر علی نے اس پر قناعت کی۔ بلکہ فرنگی طریق جنگ چھوڑ کر اب اس کے سوار زیادہ دلیر و خطرناک ہوتے گئے اور دشمن کو خود اسی کے مخصوص طرز جنگ میں بھی خاصی طرح شکست دی۔ حقیقت میں مرہٹوں کے لئے یہ تجربہ بالکل نیا اور پریشان کن تھا کہ حریف کے بے قاعدہ سوار دوڑ میں اور غارتگری میں ان پر سبقت لے جائیں اور انھیں اپنے پڑاؤ پر بھوکا مار کے بیکار و معطل کر دیں۔ حالانکہ وہ تو خود دشمن کے ملک میں ٹڈی دل کی طرح پھیلنے اور (جیسا کہ مدراس کے انگریز حکام نے ایک سابق موقع پر ان کی نسبت لکھا تھا) "وہ ہڈی تک گوشت پوست نوچ لینے" کے ارادے سے آیا کرتے تھے۔

مگر یہاں واقع میں حیدر علی نے اپنے بے مثل قزاقوں سے یہی کر دکھایا۔ اور تین مہینے کے اندر جنگ کے میدان میں اپنی دھاک بٹھا دی۔ گوپال ہری اور اس کے ہم وطن جنگ سے عاجز آ گئے جس نے میسور کی مدافعانہ قوت کے متعلق ان کے سابقہ خیالات کی بالکل تکذیب کر دی اور آخر غنیم کو صلح ہی کرتے بنی۔ اس کی شرطیں بھی فتحمند حیدر علی نے ایسے ہی سلیقے سے طے کیں جیسی خوش اسلوبی سے لڑائی لڑی تھی۔ مرہٹوں نے ۳۲ لاکھ روپیہ نقد کے معاوضے میں مفوضہ اضلاع سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس قیمت میں ایسے دشمنوں سے نجات پانا کچھ کم فائدے کی بات نہ تھی۔ اگرچہ میسور کی تہی دستی کے باعث یہ بار کافی گراں بھی تھا۔ سو نصف رقم تو ایک جبری عطیے سے پوری ہوئی اور باقی نصف حیدر علی کی ذاتی ضمانت پر خود دشمن کے لشکری ساہوکاروں

باب یازدہم

نے قرض دے دی جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس مختصر معرکہ آرائی ہی کے دوران میں انھوں نے حیدر علی اور اس کے رسوخ کی نسبت کیسی رائے قائم کر لی تھی۔ ادھر خود اپنی سرکار سے، مذکورۂ بالا رقم ادا کرنے کی غرض سے، یہ سب اضلاع جو مرہٹوں سے چھوٹے تھے حیدر علی کے تفویض کر دیے گئے اور اس نے بلا تاخیر وہاں اپنے کارندے اور عملدار بھیجد یے کہ لگان کی وصولی شروع کریں۔ (ولکس)

اس طرح اس کی قابلیت اور خدمات نے بتدریج ریاست میسور کے داخل پر اسے تصرف دلوایا اور آئندہ بہت جلد ان کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے کا راستہ صاف کر دیا۔ مرہٹہ حملہ آوروں کے رخصت ہونے کے بعد اقبالمند سپہ سالار فاتحانہ شان سے سرنگاپٹم واپس آیا تو بڑی دھوم سے اس کا استقبال ہوا اور گھر گھر میں اس کی تعریف کے راگ گائے جانے لگے۔ وہ دربار میں آیا تو ننجی راج نے سرو قد تعظیم دی اور سب کے سامنے اسے گلے سے لگایا۔ راجہ نے "بہادر" کے نام سے اس سے خطاب کیا اور یہی خطاب اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنے سب سے سخت اور جانی دشمن، یعنی ہری سنگھ راجپوت کا وہ پہلے ہی کام تمام کر چکا تھا۔ بدگمانی اور نگرانی کرنے کے لئے ویوراج بھی اب زندہ نہ تھا۔ اس کے قدیم مربی کے اعتماد میں مطلق کمی نہ آئی تھی جنگی قابلیت میں شبہہ کرنے والوں کو مسکت جواب مل چکا تھا۔ مخالفین لرزہ براندام یا منافقانہ خوشامد میں سرگرم تھے۔ کرام ول کی طرح وفادار و کارگزار فوج ہاتھ میں تھی کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ ملک کے اکثر قلعے قبضے میں تھے۔ روپیہ وافر موجود تھا کہ جاسوسی کا انتظام یا بدخواہوں کی دہن دوزی کی جا سکے۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ رسمی طور پر مصالحت کے باوجود راجہ نے ننجی راج کو معاف نہیں کیا ہے اور زنانے کے اندر، وہی گوشوں میں ابھی تک بیوہ رانی موجود ہے جو اُس شخص کی تخریب پر ہر وقت آمادہ مل سکتی ہے جس نے اس رانی کے شوہر کو قتل کیا اور زنان خانے میں دزرانہ گھس آنے کی گستاخی کی۔ حیدر علی جانتا تھا کہ اس طاقتور اثر سے وہ جب چاہے کام لے سکتا ہے پس اسے محسوس ہوتا تھا کہ اتنی مدت سے جو منصوبہ بنایا تھا اب اس پر عمل کرنے اور اپنی منزل مقصود یعنی حکومت واقتدار کی مسند پر علانیہ قبضہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ بایں ہمہ وہ اپنی خصلت کے مطابق

پس پردہ ہی کام کئے گیا اور تخت حکومت تک بڑھنے میں بھی وہی اینچ پیچ اور داؤں گھات کرتا رہا جیسے کہ میدان جنگ میں غنیم کے خلاف استعمال کئے تھے۔

کرناٹک کی جنگ نواب نظام الملک اور مرہٹوں اور خود حیدر علی کے مطالبات نے ریاست کے مداخل کو ختم کر دیا تھا لہذا فوجی دشواری از سرِ نو رونما ہوئی۔ اس پیچیدگی سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ راجہ سے ملکر ننجی راج کو تباہ کرنے کی جو سازش ہوئی تھی، اسے بروئے کار لایا جائے۔ اس کا سلسلہ یوں شروع ہوا کہ پہلے فوج کی طرف سے ایک وفد، بہ حیثیت سپہ سالار، حیدر علی کے پاس حاضر ہوا کہ چڑھی ہوئی تنخواہیں طلب کرے۔ حیدر علی نے مطالبے کو حق بجانب قرار دیا اور جواب میں یہ بھی جتادیا کہ ریاست کا ذمہ دار دیوان ننجی راج ہے۔ اس گفتگو کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سپاہیوں نے پھر ننجی راج کے مکان پر دھرنا دیا اگرچہ اب کے سکھانے پڑھانے سے ان کا لب ولہجہ بہت باادب تھا مگر مطالبے پر پوری طرح جمے ہوئے تھے اور خود حیدر علی اس روحانی سزا دہی میں سپاہیوں کے ساتھ تھا۔ ننجی راج فوراً اس چال کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کا حوصلہ بھی اس کے اقبال و دولت کی طرح انتہا درجہ پست ہوگیا۔ حیدر علی نے تنہائی میں ملاقات کی اور ترغیب دی کہ از خود اور بلاشرط عہدے سے علٰحدہ ہونے کا اعلان اور آئندہ کارروائی بھی تجویز کر دے۔ چنانچہ ننجی راج نے سپاہیوں کو اطلاع دی کہ میری حکومت ختم ہوگئی۔ اب دھرنا کی مصیبت سے مجھے نجات دی جائے اور خود راجہ سے روپیہ ملنے کی توقع رکھی جائے۔ یہ اشارہ بالکل صریحی تھا لہذا فوج والے اس کی ڈیوڑھی چھوڑ چھوڑ کر راجہ کے محل کو روانہ ہوئے اور وہاں بھی اسی عجیب ناکہ بندی کا انتظام کیا۔ راجہ کے لوگوں سے پہلے ہی کہی بدی تھی اور وہ اس مضحکہ انگیز مگر اہم سیاسی سوانگ میں اپنا کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھے۔

محل میں پہلے کھنڈے راؤ کی طلبی ہوئی اور وہاں سے واپس آکر اس نے خبر دی کہ راجہ کی خوشی یہ ہے کہ "حیدر علی، غاصب دیوان (ننجی راج) سے قطع تعلق کرلے پھر اس معزول وزیر کے گزارے کا مناسب انتظام کرکے فوج کی جملہ شکایات رفع کر دی جائیں۔" اس پر حیدر نے چہرے کو مناسب محل رنجیدہ بنا کے وہ قسم کھائی جس میں اپنے عزیز مربی سے قطع تعلق کر لینے کا اقرار تھا۔ پھر وہ خود راجہ کے محل میں باریاب ہوا اور واپس آکر سپاہیوں سے وعدہ کیا کہ ان کے سارے مطالبات کا حسب دلخواہ

باب یازدہم

تصفیہ کردیا جائے گا جس سے سب لوگ خوش اور مطمئن ہوگئے۔

یہ وعدہ اور نیز آئندہ بھی تنخواہوں کے ادا کرنے کی ذمہ داری کی بنا پر سرکاری مداخل کا مزید معقول حصہ حیدر علی کے قبضے میں آگیا چنانچہ اب نصف ریاست میسور اس کی جاگیر میں تھی یعنی اس کا سرکاری مالیہ حیدر علی کے تفویض ہوگیا۔ انقلاب حکومت کا مرقع ابھی کسی قدر نامکمل رہ گیا تھا پس کھنڈے راؤ راجہ کا دیوان (یا وزیر مالیات) مقرر ہوا اور ساتھ ہی حیدر علی کی ذاتی ملازمت میں بھی بدستور رہا۔ اس سے ان کے تعلقات میں بے ربطی پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے کھنڈے راؤ نے حیدر علی کی نوکری کچھ اس طرح چھوڑی کہ غالباً اسے گراں گزرا کیونکہ وہ اب تک اس برہمن کو اپنا ہی ساختہ پرداختہ آدمی سمجھتا تھا۔ معزول دیوان ننجی راج کو تین لاکھ مالگزاری کی جاگیر تفویض کی گئی جس میں سے دو لاکھ فوج کی تنخواہ کے تھے جسے ریاست کی خدمت کے لئے فراہم رکھنا، اس کا فرض تھا۔ اس نے پُرانے دارالملک قصبۂ میسور میں سکونت اختیار کی تھی لیکن اس سے راجہ کے لوگوں کو وہم ہوا اور حکم ملا کہ وہ سرحد کے قریب تر کہیں جا رہے۔ اس اطلاع کے ساتھ حیدر علی نے یوں بھی اپنی جیب بھری اور زوال رسیدہ وزیر کی تمکنت کے ایک اور ٹھوکر یہ رسید کی کہ فوج کی مد میں جو دو لاکھ کی جاگیر ملی تھی وہ خود لے لی اور ننجی راج کو اس ذمہ داری سے معاف کردیا۔ یہ احکام سن کر ننجی راج بہت بگڑا اور ملامت آمیز تمرد کے لہجے میں کہنے لگا کہ تمھاری جو کچھ آج حیثیت ہے، یہ سب میری ہی بنائی ہوئی ہے اور آج مجھے سر چھپانے کی جگہ دینے میں بھی تم انکار کرتے ہو، جاؤ جو تمھارا جی چاہے کرو، میں تو میسور سے ایک قدم آگے نہ بڑھاؤں گا" (ونکس) تب راجہ کے احکام کی تعمیل اور ادائے فرض کے ایمانی جذبے سے مجبور ہوکر حیدر علی کو تشدد کرنا پڑا اور اس نے سرکش ننجی راج کا محاصرہ کرلیا۔ قلعہ گیری میں اُسے کبھی مہارت حاصل نہ ہوئی۔ دوسرے عجب نہیں کہ اس موقع پر محاصرے کو طول دے کر وہ سیاسی فوائد حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔ غرض تین مہینے کے بعد ننجی راج نے ہتھیار ڈال دیے اور میسور کے مغرب میں اسے بہ مقام کونور بسا دیا گیا (۱۷۶۱ء) جنگ کا مقام دیکھنے خود راجہ بھی آیا اور اپنے نئے سپہ سالار کی قوت اور دمدمول وغیرہ کی تعریف کی اور کامیابی کے بعد کچھ اور علاقہ اور اختیارات انعام میں دیے۔ اس آخری معاملے کو کھنڈے راؤ نے

باب یازدہم

حیدر علی کے ملازم کی بجائے راجہ کے وزیر مالیات ہونے کی نظر سے دیکھا اور مخالفت کی اس پر ان میں جھگڑا اور اس آنے والے طوفان کے ابتدائی آثار ہویدا ہوئے جو تھوڑے ہی دن بعد اس اقبال مند اور ذی ہوس منظور نظر کو، کچھ مدت کے لئے، پنجی راج سے بھی زیادہ آسانی سے اُٹھا کر پھینک دینے والا تھا۔

یہ کرنل ولکس کے اُس بیان کا خلاصہ ہے جو انھوں نے اس مشہور انقلاب کے بارے میں بہت عمدہ واقفیت اور باریک بینی کے ساتھ تحریر کیا تھا، مگر صاف ظاہر ہے کہ بہت سی باتیں پس پردہ ہوتی رہیں اور اس معاملے میں ہم خصوصیت کے ساتھ مورخ کے ایسے وست نگر ہیں کہ اُس کے قیاسات کو واقعات سمجھ کر آسانی سے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ ولکس نہ صرف بہترین ماخذ ہے بلکہ ان واقعات اور ایشیائی تاریخ کی اور بہت سی بھول بھلیوں میں ہمارا سب سے باخبر رہنما ہے۔

الغرض، حیدر علی کا اب کوئی مدمقابل نہ رہا۔ کم سے کم اسے اطمینان تھا کہ ملک میں اس کے اقتدار کو کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ لہذا اب اُس نے ریاست میسور کی حدود و مداخل اور شہرت کو بڑھانے کی طرف توجہ کی۔ اسی زمانے میں دو درخواستیں بھی موصول ہوئیں جن میں شوقِ جنگ جوئی کی تشفی کا بخوبی امکان تھا۔ اول تو فرانسیسیوں کو مدد کی فوری ضرورت اور خواستگاری ہوئی۔ دوسرے رئیس کڑپا کی رعایا میں سے ایک شخص نے منحرف ہو کر حیدر علی سے تحریک کی کہ ایک پرگنہ جو پہلے ریاست میسور کی عملداری میں تھا، دوبارہ فتح کر لے۔ چنانچہ حیدر علی نے پہلے اسی تجویز پر عمل کیا اور مخدوم صاحب کو روانہ کیا کہ پرگنہ بارہ محل کی تسخیر کرے اور یہ کام ہو جائے تو فرانسیسیوں سے نامۂ و پیام شروع کرے۔

بارہ محل کی پہاڑی پٹی، مشرقی گھاٹ اور اُس علاقے کے درمیان حائل تھی جسے انگریز عموماً، اگرچہ غلطی سے کرناٹک کہا کرتے تھے۔ پرگنے کی حفاظت بارہ گڑھیوں سے ہوتی تھی جو پہاڑ کی چوٹیوں پر واقع تھیں اور آگے چل کر جب انگریزوں کی حیدر علی سے لڑائیاں ہوئیں، تو ان میں سے بعض قلعوں نے بڑی شہرت اور اہمیت حاصل کی یہ علاقہ کڑپا کے پٹھان نواب نے ریاست میسور سے چھین لیا تھا مگر جس زمانے کا ہم ذکر

باب یازدہم

کر رہے ہیں اس سے صرف دو سال قبل آدھے پرگنے پر مرہٹے جبراً قابض ہو گئے تھے
مخدوم صاحب کا پہلا کام یہ تھا کہ انی کُل کے پولی گار کو مغلوب کر کے اس کا قلعہ دانی کُل (چھین لے تاکہ بارہ محل میں جانے کا راستہ نیز پانڈی چیری کی شاہ راہ پر بے کھٹکے تصرف ہو جائے۔ اس میں کامیابی ہوئی اور پھر سارے بارہ محل کے قبضے میں کوئی تعویق پیش نہ آئی۔ یہاں سے فرصت پاکر یہ میسوری سپہ سالار فرانسیسی صدر مقام میں آیا اور اپنے آقا کی جانب سے فرانسیسی حاکم لالی کے ساتھ ایک عہد نامہ کیا (جون ۱۷۶۰ء) جس کی رو سے تھیاگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ میسور و پانڈی چیری کی گزرگاہ پر بہت باموقع مقام تھا اور کچھ مدت پہلے فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری طرف حیدر علی نے وعدہ کیا کہ انگریزوں کے مقابلے کے لئے ۳ ہزار عمدہ سوار اور ۵ ہزار باقاعدہ پیادہ سپاہ مہیا کرے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ کامیابی کی صورت میں اگر ترچناپلی نہیں تو کم از کم مدورا اور تناولی ضرور حیدر علی کی ملکیت ہو جائیں گے اور فرانسیسی ان کے محاصرے میں مدد دیں گے۔ آئندہ واقعات نے اس آخری شرط کو بیکار کر دیا مگر اسے یہاں بیان کر دینا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ نواب محمد علی اور انگریزوں کی اُس پریشانی اور خوف کی وجہ سمجھ میں آجائے جو کچھ عرصے کے بعد حیدر علی کے ملیبار میں فاتحانہ اقدام سے انھیں لاحق ہوئی۔ خصوصاً جب ان کی سرحد کے بالکل قریب وہ کوئمبٹور پہنچ کر ٹھیر گیا اور معلوم ہوتا تھا کہ کرناٹک کے جنوب مشرقی اضلاع پر چھپٹا مارنے کی فکر میں ہے جن پر ڈنڈی گل کی قلعہ داری ہی کے زمانے سے اس کا دانت تھا۔ بہر حال غالباً زیادہ تر اسی خوف اور گھبراہٹ نے انگریزوں کو تحریک دلائی کہ بے سوچے سمجھے اپنے خوف ناک ہمسائے سے دست و گریبان ہو گئے اور بقول کرنل ولکس کے "محض بے وقوف بنکر" جنگ میں اُلجھ گئے۔

مخدوم صاحب نے راستے میں تھیاگر کو فتح کیا اور حسب معاہدہ فوجی امداد کی پہلی جمعیت پانڈی چیری میں پہنچا دی۔ باقی سپاہ کو خود لئے ہوئے جا رہا تھا اور سامان رسد کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ہمراہ تھا جس کے عوض میں اُس نے اپنے فرانسیسی اتحادیوں سے بہت سخت شرطیں منوائی تھیں کیونکہ وہاں رسد کی تنگی اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ راستے میں انگریزوں کی ایک فوج مقابلے کے لئے آئی مخدوم صاحب نے حملہ کر کے اسے کامل شکست دی۔ واقعہ یہ ہے کہ کوٹ کو ابھی تک بالکل اندازہ نہ تھا کہ میسوری سپاہ میں حیدر علی نے کیسی نئی روح پھونک

وی ہے۔ البتہ کچھ مدت کے بعد یہ بات ایسی سمجھ میں آئی کہ بھول نہ سکتا تھا۔ بہر حال، اس معرکے میں کوٹ نے کافی ساز و سامان نہیں کیا (اور شکست کھائی)۔ اس فتح کی خبر سنکر حیدر علی بہت خوش ہوا اور کمکی سپاہ کی تعداد معاہدے کی شرائط سے بھی زیادہ بڑھا دی۔ پھر وہ انگریز اور فرانسیسیوں کی جنگ میں ایسی سرگرمی اور وسیع پیمانے پر حصہ لینے کی فکر میں تھا جس سے شاید جنگ کی پوری نوعیت ہی بدل جاتی کہ اتنے میں یکایک خود اُس پر ایسی آ بنی کہ اپنے پریشان حال حلیفوں ہی جیسی مخدوش حالت خود اس کی ہوگئی۔

تاریخ میں ایسے یکساں واقعات ایک ہی وقت میں بہت کم کبھی واقع ہوئے ہونگے جیسے کہ لالی کی آخری کشمکش کوٹ سے۔ مرہٹوں کا جدال و قتال ابدالی سے اور حیدر علی کی نزاع کھنڈے راؤ سے واقع ہوئی۔ اور ان سب میں وہ طاقتیں مصروف جنگ تھیں جو قریب قریب اسی زمانے میں، کسی نہ کسی وقت میں سارے ہندوستان پر سیادت قائم کرنے کی تمنا رکھتی تھیں۔ طرفہ تر یہ کہ یہ تینوں محاربات ایک دوسرے سے بے تعلق نہ تھے بلکہ ان میں علت و معلول کا عجیب اور بہت قریبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ پانڈی چیری کے سقوط سے ہندوستان میں فرانس کی سیاسی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اگرچہ میسور کے معاون بنکر فرانسیسی بہت دن تک یہاں کے معاملات میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اُدھر پانی پت کی ہزیمت نے مرہٹوں کو اُس وقت تو قریب قریب بالکل کچل ڈالا۔ کچھ مدت بعد وہ پھر بہت زبردست ہوگئے تھے لیکن ویسی طاقتوں میں جو مرتبہ انھیں پہلے حاصل تھا وہ وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوسکا، کھنڈے راؤ کے بگڑ جانے سے حیدر علی کو ایسی مصیبت کا سامنا ہوا کہ زندگی بھر نہ ہوا تھا بلکہ یہی اس کے خاندان بھر کے حق میں فیصلہ کن موقع بن گیا۔ غرض ہندوستان میں تین ایسی لڑائیوں کا وقت واحد میں چھڑ جانا کمال حیرت کی بات ہے۔ اور اگر یہ سوچئے کہ ان میں سے کوئی جنگ بھی ملتوی ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا، تو اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً کھنڈے راؤ کچھ روز اور رکا رہتا تو ممکن ہے کہ پانڈی چیری مسخر نہ ہوسکتی۔ اگر ابدالی کچھ ٹھیر کر ہندوستان میں آتا، یا اُسے شکست ہوجاتی تو حیدر علی اور مخدوم صاحب کی فوجیں ایک دوسرے سے نہ مل سکتیں اور علحدہ علحدہ شکست کھا کر بالآخر حیدر علی بالکل تباہ ہو جاتا۔ یہی وہ نتیجہ خیز پیچیدگیاں ہیں جن سے اس پیش پا افتادہ قول میں تازہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ "جنگ دو سر دارد۔"

یہ جوابی انقلاب، پہلے تغیر کی طرح جس نے اس انقلاب کی ضرورت پیدا کی، راجہ کے محل ہی سے شروع ہوا۔ راجہ کی ماں کو وقت نکل جانے کے بعد ہوش آیا کہ آئندہ حیدرعلی کی چھوٹی انگلی، نبھی راج کے پہنچے سے بڑھ کر قوی ثابت ہو گی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ اس کی سپاہ کا بڑا حصہ موجود نہیں اور وہ صرف مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ سرنگاپٹم کے ٹاپو میں گھرا ہوا سا رہ گیا ہے، تو بیوہ رانی مطمئن ہو گئی۔ حیدرعلی کی سپاہ کا دوسرا حصہ، اور مشہور و معروف توپ خانہ بھی ندی کے شمالی کنارے پر متعین تھا اور برسات کی وجہ سے ندی ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ پایاب گذرگاہوں سے عبور کرنا محال ہو گیا تھا۔ رہے ندی کے پل سو وہ قلعے کی زد میں تھے۔ ادھر سرحد پر مرہٹے فوجیں لئے منڈلاتے اور حسب معمول تاخت تاراج کرتے پھرتے تھے۔ مگر جو ان کو روپیہ دے اس کی نوکری کرنے میں بھی انھیں کوئی عذر نہ تھا۔ یہ موقع غنیمت سمجھ کر رانی نے شہر کے سب سے بڑے دیوتا کے سامنے راجہ اور کھنڈے رائے سے قسم کھلوائی کہ نو دولت حیدرعلی کی تخریب میں کوشش کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے اور سازش بھی ہر اعتبار سے بہت اچھی تھی۔ اس وقت برہمن (کھنڈے راؤ) کے سینے میں ایک طرف تو حیدرعلی کی بے پناہ حرص مال کا غصہ، اپنی ہوس اقتدار اور مذہبی عناد کے جذبات جوش مار رہے تھے اور دوسری طرف اپنے مربی کی تلوار کا خوف اور شاید شکر گزاری کا جذبہ موجزن تھا۔ تاہم اس نے اپنے مربی ہی کی پیروی، یعنی محسن کشی کا فیصلہ کیا اگرچہ اس میں حیدرعلی سے کہیں زیادہ بے تمیزی اور صریحی دغابازی دکھائی۔ اور یہاں یہ بات جتانے کے قابل ہے کہ اس موقع پر برہمن نے زیادہ سفاکی، اور مسلمان نے زیادہ اینچ پینچ اور مداہنت سے کام لیا۔ القصہ بہت جلد مرہٹہ سردار سے خفیہ معاملہ کر لیا گیا کہ وہ اگست کی ۱۲ تاریخ تک چھ ہزار سوار سرنگاپٹم روانہ کر دے گا۔

اس یادگار صبح کو حیدرعلی اس مقام پر خیمہ زن تھا جہاں بعد میں دولت باغ بنا۔ بال بچے ساتھ تھے۔ ٹیپو کی عمر اس وقت نو سال کی تھی۔ ایک اور بیٹا اسی روز پیدا ہوا اور ساتھ ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ معلوم ہوتا تھا قضا و قدر انگریزوں کی اُس قیامت خیز آتش باری کی مشق کر رہے ہیں جو ایک مدت کے بعد اسی جزیرے سے شہر پر ہونے والی تھی۔ قلعے کے دروازے کھلنے نہ پائے تھے اور سورج ابھی پورا نکلا بھی نہ تھا کہ

یکایک قریب کے سارے دمدموں سے غافل سپہ سالار اور اس کے ساتھیوں پر شدت سے گولہ برسنے لگا۔ اُس نے فوراً کھنڈے راؤ کو بلوایا مگر تھوڑی ہی دیر میں یہ بزرگ خود توپیں چلواتے ہوئے دیکھ لئے گئے۔ معلوم ہوتا ہے گولوں سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا۔ حیدر علی اپنے اہل وعیال اور سپاہیوں سمیت پناہ کی جگہ میں چلا آیا مگر پریشانی میں کچھ کمی نہ آئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قلعے سے ایک بڑی فوج نکلی اور ندی کے کنارے اس کی جمعیت پر حملہ کرکے اسے بھگا دیا اور توپ خانے پر قبضہ کرلیا۔ پھر یہ کہ وہ خود جہاں مقیم تھا، اس پڑاؤ پر ہر لحظہ حملے کا اندیشہ تھا۔ لیکن ایسے انتہائی خطرے میں بھی حیدر علی کے ہوش وحواس حسب معمول بجا تھے اور وہ غور وتدبیر میں مصروف تھا۔ میر حسین علی نے ان تدابیر کی کیفیت بیان کی ہے اور ہرچند ایسے مبالغہ پسند مدح خواں مصنف کے قول پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا لیکن بنفسہ اس روایت میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "حیدر علی نے فوراً موروچوں میں بندوقچی مقرر کئے اور کسی کو اطلاع ہوئے بغیر، کچھ آدمیوں کو بھیجا کہ ندی پر جتنے ستے پانی بھرنے آئیں ان سب کو مشکوں سمیت گرفتار کرلیا جائے۔ پھر قیام گاہ کے گرد پیادہ وسوار کی جمعیت کو تیار کرکے، مختلف سررشتوں کے صیغہ داروں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ جو کچھ مال اسباب، قیمتی لباس، ہاتھی، گھوڑے، اسلحہ، ظروف وغیرہ موجود ہیں، ان سب کی علحدہ علحدہ فہرستیں مرتب کردی جائیں۔ اور دوپہر تک یہ سب انتظام مکمل ہوگیا۔

مورخ کا بیان ہے کہ کھنڈے راؤ نے پڑاؤ پر حملہ بھی کیا تھا۔ مگر مجھے اس میں شبہہ ہے۔ یہ البتہ معلوم ہے کہ مرہٹے حسب معمول، مقررہ وقت پر نہ پہنچے اور ہوس و وغا میں مسابقت کرنے والوں میں باہم گفتگو ہوئی۔ حیدر علی ہمیشہ موقع کے مطابق لب ولہجہ اختیار کرتا تھا۔ اس نے اپنی تمام سابقہ خوش حالی دیوان کھنڈے راؤ سے منسوب کی۔ اعتراف کیا کہ اس نے ساتھ چھوڑ دیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ پھر اپنے پرانے نوکر سے التجا کی کہ ٹوٹے ہوئے نرسل کو جڑ سے نہ اکھاڑے بلکہ اپنے شخص کی مدد اور رہنمائی کرے جو ریاست کے نئے مدارالمہام کا ہر حکم خوشی سے بجالانے پر آمادہ ہے۔ جواب میں کھنڈے راؤ نے کمال لطف وعنایت سے ملتجی

باب یازدہم

حیدر علی کے احسانات کا اعتراف کیا اور یقین دلایا کہ میں ذاتی طور پر کوئی عداوت نہیں رکھتا لیکن راجہ کے حکم سے مجبور ہوں۔ اب اگر تم وعدہ کرو کہ میسور سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤ گے تو آج ہی شام کو تمھارے بے کھٹکے نکل جانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس نے صرف زبانی وعدے پر اکتفا کی اور حیدر علی سے حلف بھی نہیں لیا۔ اور جو کچھ کہا تھا اسی کے مطابق، واقع میں ندی کے شمالی کنارے پر اُتارے کی جگہ سے فوج ہٹالی جس سے غنیم کو اچھا خاصا پُل مل گیا کہ ادھر سے بچ کر نکل جائے۔ ممکن ہے کھنڈے راؤ کو مرہٹوں کے آنے سے ناامیدی ہو گئی ہو اور اپنی فوج پر اتنا بھروسا نہ ہو کہ حیدر علی جیسے دشمن کو قابو میں لاسکیگی۔ اور یا شاید یہ خیال ہو کہ حیدر علی غالباً بنگلور ہی کی طرف فرار ہو گا اور مرہٹے جو اُس طرف سے بڑھ رہے ہیں اُسے راستے ہی میں آدبائیں گے اور قصہ ختم کر دیں گے۔

بہرحال، اسی عجیب کارروائی کی جس پر اس کے حریف کی قسمت کا اس وقت مدار تھا، وجہ جو کچھ بھی ہو، حیدر علی نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کچھ دیر نہ کی سو سوار، دو سردار، دو شتر سوار جن پر کامل بھروسا تھا، اپنے ساتھ لئے اور یہ جس قدر روپیہ اور زیورات بوروں میں لے جا سکتے تھے، انھیں فوراً لادلیا۔ پھر پیادہ سپاہی اور اہل وعیال کو وہیں چھوڑ کر ڈونگوں میں ندی عبور کی۔ گھوڑے اور اونٹ تیر کر پار ہوئے اور دوبارہ سامان لاد کر یہ سب اس تیزی سے چلے کہ سرنگاپٹم سے گولہ باری رُکے چوبیس گھنٹے نہ گزرے تھے کہ اَنی کل پہنچ گئے جو سرنگاپٹم سے پچھتر میل کے فاصلے پر تھا۔ مرہٹے ان کی گرد بھی نہ پا سکے۔ اس یلغار میں بہت سے گھوڑوں کا دم ٹوٹ گیا، لیکن تاتاری طریق کے مطابق کوتل گھوڑے ساتھ تھے۔ ان سے کام لیا اور سب آدمی اور زر زیور بخیریت منزل پر پہنچ گیا۔ حیدر علی آخر تک ایک ہی گھوڑے پر سوار رہا۔ ادھر صبح ہوتے کھنڈے راؤ فراریوں کے پڑاؤ پر آیا۔ پیادہ فوج نے جو وہاں چھوڑ دی گئی تھی کوئی مزاحمت نہ کی۔ حیدر علی کے اہل وعیال کو قلعے میں لا کے پہرے میں رکھا لیکن ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا۔ غالباً خود حیدر علی خیال کرتا تھا کہ اس مصیبت اور تلاطم میں اپنے ساتھ رکھنے کی بجائے انھیں حریف کے پاس چھوڑ دینے میں زیادہ سلامتی ہے۔

باب یازدہم

دوبارہ جمعیت بہم پہنچانے میں سب سے مضبوط مقام صرف بنگلور نظر آتا تھا۔ وہاں کا قلعہ دار بھی پرانا رفیق تھا لیکن کھنڈے راؤ کی بے وفائی نے حیدر علی کو اس قلعہ دار کبیر بیگ سے بھی اگر بدظن نہیں کیا، تو محتاط ضرور بنا دیا تھا۔ دوسرے اسے معلوم تھا کہ اس قلعے میں ہندو نیم مسلح سپاہی بھی موجود ہیں اور اگر وہ وہاں گیا یا قبضہ کرنے کی تدبیر کی تو اس کی بلا تاخیر بخوبی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ اور وہاں بنفس جانا اسے کسی طرح منظور نہ تھا۔ بخلاف اس کے انی کل میں اس کا برادر نسبتی اسمٰعیل علی قلعہ دار تھا اس کے متعلق کوئی بدظنی نہ تھی اور یہ بھی امید تھی کہ ایک رسالہ جسے ارکاٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ انی کل میں مل جائے گا۔ غرض انی کل جاکر اس نے بلا تاخیر اسمٰعیل علی کو بنگلور روانہ کیا۔ کبیر بیگ رفاقت میں پکا تھا۔ حسن اتفاق سے اسی روز سپاہیوں کو تنخواہ تقسیم ہونے والی تھی۔ ہندو سپاہی غافل تھے ان کو تنخواہ دینے کے لئے باہر دھس پر جمع کرلیا اور دروازوں کی نگرانی قابل اعتماد مسلمانوں کے حوالے کردی گئی۔ یہ احتیاطی تدبیر کر چکے تھے کہ اتنے میں کھنڈے راؤ کے احکام پہنچے کہ بنگلور کو خاص راجہ کی طرف سے قبضے میں رکھا جائے۔ اس طرح حیدر علی کی مستعدی نے دوبارہ اسے سخت نقصان سے بچا لیا۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ وہ انی کل کی سوار فوج لے کر بنگلور میں جو مملکت بھر میں دوسرا سب سے بڑا شہر تھا، داخل ہوا اور جیسا کہ میر علی نے لکھا ہے، یہاں پہنچ کر "بے فکر ہوگیا" آرام کی تو اسے حقیقت میں ضرورت تھی کہ بیس گھنٹے میں اسی میل کی منزل طے کرکے آیا تھا لیکن اس بروقت کوشش اور اتنی کچھ کامیابی کے باوجود مستقبل کی طرف سے بے فکر نہ ہوسکتا تھا۔ کرنل ولکس اس موقع پر تحریر کرتا ہے کہ "اب حیدر علی کو از سر نو اور صرف قوت بازو کے بھروسے پر زندگی شروع کرنی پڑی۔ بہت کچھ پچھلا اندوختہ، سارا توپ خانہ اور ذخائر حربی جو اب تک جمع ہوئے تھے، سرنگاپٹم میں چھن گئے۔ جاگیریں اور مالگزاری کھنڈے راؤ کی تحویل میں آگئیں۔ لے دے کے شمال کی سرحد پر بنگلور انتہائی جنوب میں ڈنڈی گل اور مشرق کی طرف انی کل اور بارہ محل کے قلعے قبضے میں رہ گئے اور انہی مقبوضات پر آئندہ فروغ واقتدار پانے کا مدار تھا۔ مخدوم صاحب کی فوج کو بنیاد بنا کے نیا لشکر ترتیب دیا جاسکتا تھا اگر خود اس فوج کا حیدر علی تک پہنچنا امید موہوم ہوگیا تھا۔"

باب یازدہم

بایں ہمہ اُس نے فوراً اور کارگر انتظامات کئے جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ صورت حالات کو کس قدر اچھی طرح سمجھ گیا اور انھی سے جو کچھ ہو سکے کام لینے پر آمادہ تھا۔ بنگلور کے ساہوکاروں سے اس نے اپنی ذاتی ضمانت پر چالیس ہزار اشرفیاں قرض لیں اور آئندہ ان کا پیسہ پیسہ ادا کر دیا۔ لوگوں کو دریا دلی سے انعام اکرام دیے تاکہ سپاہی زیادہ پختگی سے اس کی وفاداری میں سرگرم رہیں۔ دمدموں پر نئی توپیں چڑھائیں اور پرجوش رفیقوں کو وہاں متعین کیا۔ مخدوم صاحب کو لکھا کہ پانڈی چیری سے واپس آئے۔ تھیاگر کو فرانسیسیوں کے حوالے کر دے اور وہاں کی جمعیت نیز راستے میں تمام قلعوں کی فوجوں کو اپنے ساتھ بنگلور لے کر آئے۔ پھر تمام من چلے سپاہیوں کو جن کی بدامنیوں کے باعث ملک میں کثرت ہو گئی تھی صلائے عام دی کہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں۔ خود کھنڈے راؤ کے لشکر سے اپنے بعض پرانے رفیقوں کو ترغیب دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بہت سے سپاہی جو اس کے سابقہ پرگنوں میں قلعوں پر متعین تھے اور اب برخاست کر دیے گئے تھے، بنگلور پہنچ گئے۔ ایک بہت اچھا سردار ریٹین خاں جو حیدر علی کا چاہیتا یار غار تھا، چند روز بعد اپنی جمعیت لے کر آملا۔ لیکن نہایت اہم اضافہ جس نے اس وقت میں حیدر علی کی عزت و اثر دوبارہ قائم کرنے میں سب سے زیادہ مدد دی فضل اللہ خاں کی شرکت سے ہوا۔ یہ بہت عالی خاندان آدمی اور دلاور خاں نواب سیرا کا، (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے،) داماد تھا۔ اس کی جنگی قابلیت نہایت مشہور تھی۔ ساتھ ہی امارت کا ایسا دعویٰ تھا کہ حیدر علی کی شرکت کرتے وقت اُس نے شرط کی تھی کہ حیدر علی کے زیر حکم ہونے کے باوجود میرا مرتبہ اس کے برابر سمجھا جائے گا اور اس کے ثبوت میں مسند، قالین، یا زین پوش جس پر بھی نشست ہو، مجھے حیدر علی ہمیشہ اپنے برابر بٹھائے گا۔ یہ وہ فرش ہیں جن پر اہل مشرق درزیوں کی طرح چار زانو بیٹھا کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے اعزاز و اکرام کی اور بھی شرطیں پیش کی تھیں ان سب کو حیدر علی نے منظور کیا اور ان کی پابندی کرتا رہا حتیٰ کہ آخر زمانے میں ان دونوں میں ان بن ہوئی۔ اُس وقت حیدر علی کی حکومت میسور میں پوری طرح قائم ہو چکی تھی اور اس نے اُس مصیبت کے زمانے کے رفیق کو اسی ناشکر گزاری کے ساتھ دھتا بتایا جو حیدر علی

باب یازدہم

کی خصوصیت تھی۔
القصہ، فضل اللہ خاں امیرانہ شان شوکت اور کثیر التعداد فوج کے ساتھ حیدر علی سے آملا۔ اور اس کی مثال نے دوسروں پر بھی بڑا اثر ڈالا لیکن کھنڈے راؤ بھی سپاہ کی فراہمی اور ترتیب میں مصروف تھا اور ان کی تقسیم اور تعین میں بھی اس نے کچھ کم اہلیت نہ دکھائی۔ اس کے مرہٹہ حلیفوں کی تعداد اب دس ہزار ہوگئی تھی انھیں حیدر علی کے پرانے حریف گوپال ہری کی قیادت میں آگے روانہ کیا کہ مخدوم صاحب کو بنگلور نہ پہنچنے دے اور راستے ہی میں روک لے۔ ایک اور مرہٹہ لشکر وادی ولی نور کے اوپر گھاٹ کے پہاڑوں میں منڈلا رہا تھا۔ یہ حدود میسور سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور اس کے سردار ویساجی پنڈت سے بھی کھنڈے راؤ نے معالمت کرلی مخدوم صاحب ان چتی ڈرگ تک تو بڑھا چلا آیا مگر وہاں اسے رُکنا اور حیدر علی کو اطلاع دینی پڑی کہ جبتک مزید کمک نہ آئے وہ کوچ جاری نہ رکھ سکے گا۔ اس کی مدد کے لئے فضل اللہ کو پانچ توپوں کے ساتھ بھیجا گیا۔ زیادہ سے زیادہ سپاہی جن کو بھیجنا ممکن تھا اور جن کی کل تعداد چار ہزار تھی، اس کے ہمراہ کئے گئے۔ ان میں بھی اکثر نئے بھرتی کئے ہوئے اناڑی تھے۔ مگر اس کی جانبازانہ کوشش کہ مخدوم صاحب سے جا ملے کامیاب نہ ہوئی۔ اس کے ناتجربہ کار سپاہیوں نے حملہ تو ایسی بے جگری سے کیا کہ فتح میں کچھ کسر نہ رہ گئی تھی لیکن آخر کار ان کی صفیں ٹوٹ گئیں اور جنگلوں میں فرار ہوگئے۔ توپیں چھن گئیں اور وہ بھی بمشکل جان بچا کر اپنی کمک پہنچ سکا۔ اس ناکامی کے بعد کوئی امید نظر نہ آتی تھی کہ مخدوم صاحب اپنے آقا سے جا ملے گا اور کرنل ولکس کے بقول، "پھر حیدر علی کی سیاسی زندگی کا خاتمہ قریب معلوم ہونے لگا تھا" لیکن یہ ہونا قسمت میں نہ تھا۔ پھر ایک مرتبہ تقدیر نے اس کی یاوری کی۔ ٹھیک اسی وقت مرہٹہ سپہ سالار کو پانی پت کی اطلاع اور بلا تاخیر واپسی کا حکم ملا۔ حیدر علی اس سے برابر نامہ و پیام کر رہا تھا اب خود ویساجی نے بہت آسان شرطوں پر صلح کرنی چاہی۔ حیدر علی کو اس وقت تک کچھ خبر نہ تھی کہ مرہٹوں کے لشکر عظیم پر شمالی ہندوستان میں کیسی تباہی آئی اور اس لئے وہ مرہٹوں کی اس نرمی کا مطلب نہ سمجھ سکا لیکن ان کی شرطیں خوشی سے قبول کیں۔ قرار پایا کہ وہ بارہ محل کا پرگنہ اور تین لاکھ روپیہ نقد مرہٹوں کے حوالے کرے اور مرہٹے اپنے تمام سپاہیوں

کو لے کر ریاست سے رخصت ہو جائیں اور کھنڈے راؤ کو اس کے حال پر چھوڑیں کہ تنہا حیدر علی سے بھگت لے۔ اصلی معاہدہ تو حیدر علی سے ہو رہا تھا مگر مرہٹوں کی خاص عیاری کی یہ مثال قابل ذکر ہے کہ انھوں نے انگریزوں سے علٰحدہ یہ معاملہ کیا کہ ہم فرانسیسیوں کو کوئی مدد نہ دیں گے اور میسور کے علاقے سے چلے جائیں گے۔ اور اس کے عوض میں بیس لاکھ کی معقول رقم الگ وصول کی۔ اگرچہ فرانسیسی سپہ سالار لالی اور پانڈی چیری کا بھی خاتمہ یقینی ہو گیا۔ بہر حال ان معاہدوں اور موصولہ احکام کے مطابق ویساجی رخصت ہو گیا کہ اُس حملہ آور کے مقابلے کے لئے اپنی جمعیت پیش کرے جو اس کے پہنچتے پہنچتے افغانستان واپس روانہ بھی ہو چکا تھا۔ ‹باب یازدہم›

حیدر علی کو شرطوں کی نرمی اور مرہٹوں کا اس طرح خلاف معمول جلدی سے رخصت ہونا دیکھ کر ہی شبہہ ہو گیا تھا کہ ضرور ان کے اندرونی معاملات میں کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا بارہ محل کے حوالے کرنے میں تساہل کرتا رہا اور جب اُن کے اعتدال اور عجلت کی اصلی وجہ کا علم ہوا تو پھر پرگنہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔

اس عرصے میں انگریزوں کو حکومت میسور کی آراء میں تلون کے آثار دیکھ دیکھ کر سخت پریشانی تھی حیدر علی نے فرانسیسیوں سے عہد نامہ کرنے کے بعد استفادہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ مدورا کے پرگنے پر بہت دن سے اس کا دانت تھا۔ اب ایک فوج روانہ کی کہ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے جواب میں انگریزوں نے کارور کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دن میں کھنڈے راؤ کا پیام پہنچا کہ دراز دستی کرنے والے کا خاتمہ ہوا اور اب راجہ کو انگریزوں سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ مخدوم صاحب کی سپاہ کے ہٹنے سے بھی ان اطلاعوں کی تصدیق ہوئی۔ تاہم انھوں نے صرف کارور کے میسوری سپاہیوں کو قلعے سے چلے جانے کی اجازت دی اور قلعے پر اپنا ہی قبضہ رکھا کہ جب تک حکومت میسور سے کوئی قطعی تصفیہ ہو یہ مقام ہاتھ میں رہے۔ ڈنڈی گل والے بھی حیدر علی کی رفاقت میں قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتے رہے مگر ان دو قلعوں کے علاوہ بارہ محل تک باقی سارا علاقہ کھنڈے راؤ کے قبضے میں آ گیا۔

انھی دنوں حیدر علی کو سامان رسد کی تکلیف ہوئی۔ اس نے ایک معقول جمعیت کو کمبٹور روانہ کی اور خود کاویری اُتر کے جنوب مغرب میں چلا کہ اس جمعیت پر بازو سے

حملہ نہ ہو سکے۔ تنجن ڈگوڈ کے قریب دشمن سے اس کا سامنا ہوا۔ پانڈی چیری مفتوح ہو چکی تھی۔ اور تین سو فرنگی جو فرانسیسی ملازمت سے الگ ہو کر بے روزگار تھے، ہُوگل اور الین کی سرکردگی میں حیدرعلی کے پاس کوچ شروع ہوتے وقت ہی آگئے تھے۔ ان میں دو تہائی سوار تھے اور دیسی سپاہیوں کی بھی ایک مختصر سی فوج ان کے ہمراہ تھی۔

دونوں طرف کے سپہ سالاروں نے نسبتہً تھوڑی تعداد ہی کو لڑا کر جنگ کا فیصلہ کر لینے میں کچھ تامل نہ کیا۔ حیدرعلی کے پاس چھ ہزار سوار، پانچ ہزار پیادے اور بیس توپیں تھیں۔ کھنڈے راؤ ایک ایک ہزار پیادہ و سوار زیادہ لایا تھا اور توپیں بھی ۲۸ تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن پرانے رفیقوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اور ایک دم لپٹ پڑنا شاق ہے بلکہ ایک دوسرے کو گھیر لینے کی فکر میں ہیں۔ اس کوشش میں نیزجا بہ جا جو آویزشیں ہوئیں، ان میں برہمن وررہا۔ آخر جم کر لڑائی کی نوبت آئی اور اس میں بھی حیدرعلی کو بھاری نقصان اور شکست نصیب ہوئی۔ تاہم وہ ہوردھن ہلی تک ہٹ آیا اور سپاہ کی ترتیب قائم رہی۔

بہر حال اب پھر اسے ہر طرف مایوسی نظر آتی تھی جنگی چالوں اور معرکے میں شکست ہوئی۔ کمک آنے کا سخت انتظار تھا۔ وہ نہیں آئی۔ دشمن کی کثرتِ تعداد اور ہوشیاری برابر گھیرتی دباتی جاتی تھی۔ کھنڈے راؤ پہلے صلح وآشتی پر مائل بھی تھا تو اب پوری قوت اور سرگرمی سے کام لے رہا تھا۔ ادھر رسد میں کمی آنے لگی اور بالآخر ساتھ والوں کو بھی یقین ہونے لگا کہ حیدرعلی کا ستارہ ہمیشہ کے لئے پستی میں آگیا ہے۔ اس حالت میں وہ حیران تھا کہ کس سے مدد لے؟

اتنے میں اسے ایک پُرامید خیال پیدا ہوا۔ جو اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اسے اپنی ذات اور بہلا پھسلا کے کام نکال لینے کی قابلیت پر بے حد اعتماد تھا ورنہ ایسا منصوبہ ہرگز نہ باندھ سکتا تھا۔ وہ خیال یہ تھا کہ نجی راج سے اس کے گوشۂ عزلت میں جا کے ملے۔ اپنی خطا کا اقبال اور عفو وصلح کی درخواست کرے۔ اور اپنے قدیم مربی کو آمادہ کرلے کہ کھنڈے راؤ کے مقابلے میں حیدرعلی کا شریک ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ نجی راج سے حیدرعلی نے سیاسی اقتدار چھینا تھا مگر اب خود اس کے

باب یازدہم

آلۂ کار نے چند ہی روز میں حکومت پر قبضہ جما لیا اور حیدر علی گردش روزگار کا ایسا شکار ہوا جس کی عبرت ناک مثال مشکل سے ملے گی۔ خلاصہ یہ کہ مصیبت نے اسے اپنے ہی سابق مظلوم کا ہم صفیر بنا دیا تھا۔ حیدر علی کو امید تھی کہ ننجی راج خوشامد سے رضامند ہو جائے گا اور غالباً اس کا رنج و عناد نئے غاصب حکومت کے خلاف منتقل ہو سکے گا کیونکہ حکومت کو وہ صرف اپنا جائز حق سمجھتا تھا۔ غرض مختصر سا بدرقہ لے کر یہ دلیر سپاہی شاطر، رات کے وقت اپنے لشکر سے نکلا اور غنیم سے بچتا ہوا، دوسری صبح کو نور پہنچ گیا۔ ہتھیار اُتار دیے اور تنہا جا کے ننجی راج کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کی استادانہ ریاکاری نے دل شکستہ عزلت نشیں کو بالکل اپنا بنا لیا اور وہ اِس اڑے وقت میں کام آنے پر تیار ہو گیا۔ معزول دیوان کا ملک میں ابھی تک کافی اثر تھا۔ تھوڑے بہت سپاہی بھی بدستور نوکر تھے بلکہ جب سے خانہ جنگی ہوئی، ان کی تعداد غالباً اس امید میں بڑھ رہا تھا کہ شاید تقدیر پلٹا کھائے اور وہ پھر اپنے سابقہ منصب پر بحال ہو جائے۔

مگر کھنڈے راؤ بھی چوکس اور باخبر تھا۔ اس نے وہ تدبیر کی کہ حیدر علی اور اس کا نیا حلیف پھر کر لشکر ہی تک نہ پہنچ سکے۔ ان کی دشواری بڑھتی گئی حتیٰ کہ پھر مایوس کن حالت ہو گئی۔ اور پھر حیدر علی کی عیاری آڑے آئی۔ اس مرتبہ اس نے جو داؤں کھیلا وہ بالکل پیش پا افتادہ تھا جس سے ممالک مشرق میں اکثر کام لیا گیا ہے، لیکن تمدن کی ایسی حالت میں جہاں ایک دوسرے پر اتنا کم بھروسا ہو، یہ برابر کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہ تدبیر چل گئی۔ ہوا یہ کہ حیدر علی نے کھنڈے راؤ کے بڑے بڑے سرداروں کے نام ننجی راؤ کے نام اور مُہر سے خط لکھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے سرگروہ سے دغابازی کرنے کے جوڑ توڑ کر رہے ہیں۔ پھر پورا انتظام کر لیا کہ یہ خط خود کھنڈے راؤ کے ہاتھ پڑ جائیں۔ کھنڈے راؤ نے ان کو پڑھا تو ہوش گم ہو گئے۔ وہ خود اول درجے کا دغاباز تھا اور اپنے سابق آقا اور موجودہ حریف کو بخوبی جانتا تھا کہ کس بلا کا غدار و سازشی ہے، پس اس مفروضہ سازش کے انکشاف سے سخت خوفزدہ ہو گیا۔ اور بغیر اس کے کہ کسی بات کی تحقیق تفتیش کرے، جان کے خوف سے گھوڑے پر سوار افتاں وخیزاں

باب یازدہم

سرنگاپٹم بھاگ آیا۔

مشرقی لشکر میں سرگروہ کی فراری سے ہمیشہ کھل بلی پڑ جاتی ہے۔ وہی یہاں واقع ہوا۔ حیدرعلی تشویش و تذبذب کی حالت میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ غنیم کی اسی بے ترتیبی اور پریشانی میں سامنے اور عقب سے ٹوٹ کر گرا اور تباہ کن شکست دی۔" پوری پیادہ فوج، توپیں، ذخائر اور خیمہ و خرگاہ اُس کے ہاتھ آگیا۔ (ولکس) ان اسیر سپاہیوں میں سے اکثر خوشی سے اُس کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ سوار بھاگ کر نکل گئے تھے وہ سرنگاپٹم کے ٹاپو کے جنوبی حصے میں پھر جمع ہوئے اور پیادوں کی جمعیت کی کمک بھی وہیں پہنچ گئی۔ اس لشکر پر حیدرعلی نے آدھی رات کو شبخون مارا اور خاص قلعے کی توپوں کے نیچے قتل عام کر دیا۔ پھر سات سو گھوڑے اور بہت سا مال غنیمت لے کر چلتا بنا۔ اب اُس نے اطمینان سے فوجیں، مالگزاری اور ذخائر حربی جمع کئے اور گھاٹ کے نیچے کے علاقے کو فتح کیا۔

کھنڈے راؤ کے پاس ابھی تک پانچ چھ ہزار سوار اور ایک پیادہ فوج موجود تھی۔ سواروں میں زیادہ تر مرہٹے تھے۔ اور یہ سب پہلے کی طرح، جنوبی کنارے کے قریب ٹاپو میں خیمہ زن تھے۔ کچھ مدت بعد حیدرعلی اپنا تمام لشکر پہاڑوں پر لایا اور اطمینان سے بالکل غنیم کے پڑاؤ کے سامنے مقیم ہو گیا۔ یہاں بہانے سے نامہ و پیام کرنے میں منہمک رہا لیکن ندی جابجا سے پایاب تھی شام کو تھوڑی تھوڑی فوج بھی گشت کے حیلے سے روزانہ میدان میں نکالتا اور پھر ڈیروں میں بھیج دیتا تھا۔ مگر ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ اسی نقل و حرکت کو اُس نے یکایک ندی کے پار ایک تیز و تند تاخت بنا دیا اور دشمن پر اس طرح ناگہانی آپڑا کہ وہ اپنا سامان اور گھوڑے بھی بچا کر نہ لے جا سکے، اس ضرب نے کھنڈے راؤ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اب حیدرعلی ٹاپو کے پار مقیم تھا قلعے کے فوجی اور دیوانی عہدہ داروں سے ساز باز شروع ہوئے۔ اطمینان کے ساتھ راجہ کے سامنے وہ شرطیں پیش کی گئیں جنھیں حیدرعلی جانتا تھا کہ کوئی پورا نہیں کر سکتا اور نہ مقابلے کی کسی میں طاقت ہے۔ غرض اس طرح ڈرا ڈرا کے بدنصیب راجہ کو مجبور کر دیا کہ اپنی جان بچانے کی خاطر ایسی شرطیں قبول کرے جو عملاً اس کی دست برداری کے مرادف تھیں۔

باب یازدہم

ننجی راج حلیف کی خدمت انجام دے چکا، لہذا اب اسے الگ کر دیا اور پہلے سے زیادہ عزلت وکس مپرسی میں ڈال دیا گیا۔ فاتح نے راجہ سے قسم کھا کے وعدہ کیا تھا کہ کھنڈے راؤ کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس طرح "پالا جائے گا جیسے کاکا توے کو" اِس کو بلفظ یوں پورا کیا کہ اپنے شکست خوردہ حریف کو لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا اور چاول اور پانی اس کی خوراک مقرر کی۔ یہاں پہنچ کر مورخ حسین علی نے موعظت کا پیرایہ اختیار کیا ہے جو ایسے شخص کو کچھ بہت زیب نہیں دیتا جسے معلوم ہے کہ اُس کا ممدوح گذشتہ مصائب وانقلابات میں برابر فریب و دغا سے کام لیتا رہا اور اس آخری معرکے کے بعد پھر تا زیست نہایت خوش حال و با اقبال رہا حالانکہ جعل سازی اور غداری میں کوئی اس کا پاسنگ بھی نہ تھا۔ بہر حال، حسین علی لکھتا ہے کہ " دنیا کو مستفید کرنے والے (حیدر علی) نے اپنی قسم کی بنا پر کھنڈے راؤ کی کھال کھینچنے یا تکا بوٹی کرا دینے کی بجائے، جس کا وہ پوری طرح سزاوار تھا، اُسے منحوس کوتے کی طرح لوہے کے پنجرے میں بند کرا کے بنگلور بھجوا دیا۔ حق ہے کہ جس شخص نے اپنے آقا کے خوانِ نعمت سے نمک کھایا اور پھر بے وفائی کی تو منتقم حقیقی بہت جلد اسے خود اپنے دغا کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسائے بغیر نہ رہے گا"

الغرض، گذشتہ صدی میں، جنوبی ہند کے مُگر تھا کی ابتدائی زندگی کا خلاصہ یہ تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس کے تفصیلی حالات ہمارے اہل وطن (انگریزوں) کو بہت کم معلوم ہیں اُس عہد اور خود اس شخص (حیدر علی) کی خصوصیات کا عمدہ نمونہ ہیں اور ہندوستان کی عام تاریخ میں بجائے خود ایک سبق آموز اور مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھی وجوہ سے ان کو وضاحت سے بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔ لیکن اب ہم کو پھر شمال کی طرف پلٹنا اور مرہٹوں کے جنگی میلاب کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے جب کہ کسی غضب ناک طوفان کی طرح وہ پانی پت کے مہلک میدان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

باب دوازدہم

محاربۂ پانی پت

جس قیامت انگیز جنگ کا ذکر آئندہ صفحات میں مسطور ہے، اس کے حالات بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دسویں باب کے اخیر میں ہم جس زمانے تک پہنچ گئے تھے، تھوڑی دیر کے لئے اسی کے ماسبق سلسلے کو تازہ کیا جائے اور ناظرین کو دوبارہ یاد دلایا جائے کہ ۱۷۵۴ء میں میر شہاب الدین (جو بعد میں غازی الدین کے خطاب سے مشہور ہوا) ہلکر و سندھیا کی مدد سے وزیر سلطنت اور دہلی کا مالک بن گیا تھا، پھر اُس نے شہنشاہ احمد شاہ کو اندھا اور معزول کر کے ایک اپنے آلۂ کار کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا تھا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ افغان بادشاہ احمد شاہ ابدالی پہلے ہی کئی بار سلطنت کے شمال مغربی صوبوں پر فوج کشی کر چکا تھا۔ (ابدالی اس کے قبیلے کا نام تھا) اور ملتان اور لاہور کے صوبے فتح کر کے انھیں مغلوں کے سابق والی میر منو کے تفویض کر دیا گیا تھا۔ (۱۷۵۲ء) اگر جغرافی صحت کا زیادہ پاس نہ کیا جائے تو اس علاقے کو زمانۂ حال کی زبان میں پنجاب کہہ سکتے ہیں اگرچہ نہایت وسیع ہونے کے باوجود اس وقت یہ خطہ نیم ویران تھا۔ پھر میر منو نے وفات پائی تو ابدالی کی منظوری سے متوفی کی بیوہ اپنے شیرخوار بچے

باب دوازدہم

کی طرف سے صوبے کا انتظام کرنے لگی۔ یہ بچہ بھی فوت ہو گیا اور ایک عہدہ دار نے حکومت پر خود قبضہ کرنا چاہا تو میر منو کی بیوہ نے اسے شریک حکومت کرکے انکی دونوں یہ جھگڑا طے کر دیا تھا کہ اتنے میں غازی الدین خاں نے لاہور پر فوج کشی کی۔ اس سے میر منو کی بیٹی منسوب تھی اور اسی کو بیاہنے کے حیلے سے یہ پچھین اور شیخت پسندوزیر فوج لے کر آیا تھا جب اس کی مخطوبہ حوالے کر دی گئی تو پھر بھی وہ فوج کشی سے باز نہ آیا بلکہ اپنی ساس کو حراست میں لے کر دہلی بھجوا دیا۔ (۱۷۵۶ء) اور صوبے کی حکومت آدینہ بیگ کے سپرد کی۔ یہ وہ پُرانا گنہگار تھا جس نے سب سے پہلے افغان بادشاہ کو اٹک عبور کرنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن ابھی اس کا قبضہ جمنے نہ پایا تھا اور ناعاقبت اندیش غازی الدین کو پنجاب کا الحاق کئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ احمد شاہ ابدالی غضب ناک ہو کر چوتھی مرتبہ ہندوستان میں داخل ہوا۔ وہ انتقام کی ٹھانے ہوئے تھا۔ اس کی آمد پوری پوری طرح اس لاطینی مقولے کی مصداق تھی:

"(Quicquid delirant reges, plecluntur Achivi)"

"جو کچھ ہی حماقت راجا کریں، خمیازہ پرجا (یونانی) بھگتے") مگر غازی الدین تو غلامانہ لجاجت کرکے چھوٹ گیا اور ابدالی نے اسے معافی دے دی۔ البتہ دہلی پر بری بنی۔ مرہٹہ مورخ خوف انگیز ایجاز کے ساتھ لکھتا ہے کہ "شہر دہلی کو لوٹا گیا۔ اس کے بدنصیب باشندے تاراج اور بہو بیٹیاں خراب ہوئیں"۔ دوسرے مقامات پر بھی یہی آفتیں آئیں لیکن وبا نے ان میں تخفیف کرا دی جس کے باعث حملہ آور واپس ہو گئے۔ ابدالی اپنے فرزند تیمور شاہ کو پنجاب کا والی بنا کر چھوڑ گیا اور اپنے ہی اختیار سے روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ خاں کو سلطنت دہلی کے ایک بلندترین عہدے پر فائز کر گیا۔ روہیلے وہ افغانی لوگ تھے جو تھوڑے زمانے سے ہندوستان میں بس گئے تھے۔

احمد شاہ ابدالی کے رخصت ہوتے ہی گستاخ و شوریدہ سر وزیر نے روہیلہ سردار کا، جس سے حسد رکھتا تھا، تنزل کر دیا۔ رگھوناتھ راؤ سے اتحاد کیا اور اسی کی مدد سے پھر پائے تخت دہلی پر قبضہ اور بادشاہ کی نگرانی حاصل کر لی (۱۷۵۸ء) حتیٰ کہ اگر ہلکر خفیہ طور پر مدد نہ کرے تو نجیب الدولہ کا خاتمہ ہو جاتا اور شاید پانی پت کے

باب دوازدہم

معرکے میں ایسا ممتاز حصہ لینے کے واسطے وہ زندہ ہی نہ بچا۔ ابدالی کو سخت غصہ دلانے کے لئے یہ حرکتیں کچھ کم نہ تھیں مگر اس کے پیمانہ صبر کو ان سے بھی بڑھ کر ناگوار واقعات چھلکانے والے تھے۔ نوجوان وزیر کی کبھی سرکشی اور کبھی چاپلوسی کو وہ قابل تحقیر سمجھ سکتا تھا اگرچہ رگھوناتھ راو کی پائے تخت میں دخل اندازی مزید ناخوشی کا موجب تھی۔ لیکن پنجاب میں دوبارہ بدامنی پیدا ہوئی۔ آدینہ بیگ نے جو آب رواں کی طرح ناستقل مزاج اور ورا ذرا دیر میں ایک طرف سے دوسری طرف جا ملتا تھا، احمد شاہ سے بغاوت کی۔ سکھوں کو جو اب جنگی قوم بن گئے تھے فوج میں بھرتی کیا اور رگھوناتھ راو کو ہندووں کے بڑے لاو لشکر کے ساتھ پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس باہمت مگر ناعاقبت اندیش اور بدقسمت مرہٹہ سردار کے تو نصیب میں لکھا تھا کہ عمر بھر اسی قسم کی مخدوش بازیاں کھیلے اور بالآخر اپنے سب رفیقوں کے سر پر مصیبت لائے۔ اس نے آدینہ بیگ کی دعوت قبول کی اور افغان صوبہ دار کو شکست دے کر فاتحانہ لاہور میں داخل ہوا (۱۷۵۸ء) ان خبروں سے احمد شاہ کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور اس نے جنوبی ہند کے اُن من چلوں سے شمشیر آزمائی کی تیاریاں کیں، جو اب اس کے راستے میں حائل اور خم ٹھونک کر مقابل ہوئے بہت کچھ اسی طرح جیسے بایزید نے دیو قوت تیمور کو ٹوک کر لڑنے کی جرأت کی تھی۔

اس عرصے میں رگھوناتھ نے اس دور دراز مہم میں بے حساب دولت جمع کرنے کی بجائے، خرچ کر ڈالی۔ صحرائے ہند کی حدود سے متصل غیر آباد و بے گیاہ خطے پر لشکر کشی کی اور اسے فتح کیا اور ایک بعد کے (انگریز) مرد سیاسی کی مثل، بے سوچے سمجھے اپنے ہم وطنوں کو ایسی عداوت میں اُلجھا دیا جس کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ ہونے والا نہ تھا۔ اور آخر میں اس بھولی بھٹکی سرزمین کی حفاظت کے لئے کمزور سی مرہٹہ فوج متعین کر کے، خود واپس روانہ ہوا کہ پیشوا کو اپنی کارگزاری کی روداد سنائے اور پھر ہیتو کلیدس کی طرح جوش میں آکے آئندہ کشمکش کی ذمہ داری اپنے نکتہ چیں عمزاد سداشیو کے سر ڈال دے جو خود رگھوناتھ سے بھی کم تجربہ کار اور زیادہ عاقبت اندیش تھا۔

مرہٹہ سرداروں کی دوسری کارروائیاں بھی شمالی ہندوستان میں طوفان

برپا کرنے میں ممد ہوئیں اور یہ طوفان اُٹل نظر آنے لگا۔ ہلکر نے وزیر غازی الدین کا ہندو جاٹوں کے مقابلے میں ہاتھ بٹایا تھا۔ یہ جاٹ اونی ذات کے گر بڑے لڑنے والے اور طاقتور تھے۔ رگھوناتھ نے خوددار و امیر مزاج راجپوتوں پر چڑھائی کی، اجمیر پر قبضہ کیا اور راجپوتوں کے سب سے پرانے اور متکبر خاندان، یعنی جودھپور کے راجہ سے نذرانہ وصول کیا تھا۔ اب (سب سے پہلے اور متوفی) سندھیا کے بیٹے دتاجی نے دوبارہ روہیلوں کے علاقے پر تاخت کی۔ اس حملے پر بھی اسے شیطان صفت وزیر نے ابھارا تھا۔ ابدالی کے ہم قوموں کو پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی اور اسی ضمن میں دتاجی اودھ کے نئے نواب سے بھی اُلجھ پڑا۔ یہ نواب روہیلوں اور احمد شاہ ابدالی دونوں سے نفرت کرتا تھا لیکن مرہٹوں سے اور بھی زیادہ ڈرتا تھا۔ مقابلے میں شجاع الدولہ سے دتاجی کے نائب کو شکست کھانی پڑی اور اس سے بھی بڑھ کر بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے نازک زمانے میں یہ دونوں مسلمان طاقتیں از سر نو مرہٹوں سے برانگیختہ ہوگئیں اور ان کے پہلی دفعہ روہیل کھنڈ پر مسلط ہو جانے کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ سچ ہے کہ احمد شاہ کے متعلق یہ خبریں سن کر کہ وہ ہندوستان کے ارادے سے چل کھڑا ہوا ہے، نواب اودھ اور نیز روہیلوں سے مرہٹوں نے بہ عجلت صلح کے عہد و پیمان کر لئے (۱۷۵۹ء) لیکن دونوں فریق بخوبی جانتے تھے کہ اپنی اپنی غرض کے وقت یا قومی یا مذہبی پاسداری کے موقع پر اس قسم کا صلح نامہ کس حد تک ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

ادھر اس تمام فساد کے بانی مبانی، غازی الدین نے اپنے عہد بادشاہ گیری کی مناسب و موزوں تکمیل یوں کی کہ اپنے ہی پھٹو یعنی بدبخت عالمگیر ثانی کو مروا کے، مقتول کے نامور ہمنام (یعنی اورنگ زیب عالمگیر) کے ایک پوتے کو برائے نام بادشاہ بنا دیا اور خود جاٹوں کے راجہ سورج مل کے پاس بھاگ کر اس کے ایک قلعے میں جا چھپا اور ادھر وہ خوفناک کشت و خون کا میدان گرم ہوا جسے بپا کرنے میں سب سے زیادہ اسی شخص کا حصہ تھا۔ بہر حال، مذکورۂ بالا قتل اُس کے مختصر لیکن فتنہ انگیز و نتیجہ خیز عہد اقتدار کا آخری کارنامہ تھا۔

نئے محاربے کے ابتدائی واقعات مرہٹوں کے حق میں کچھ نیک فال نہ تھے۔

احمد شاہ کی پیش قدمی ہوتے ہی ان کی فوج لاہور سے پچھلے پاؤں واپس ہوئی اور ہلکر و دتاجی سندھیا بھی یہ سمجھ کر کہ افغانیوں کا پورا لشکر آپہنچا، جمنا کے دائیں کنارے پر پسپا ہوئے۔ حقیقت میں احمد شاہ اپنی سپاہ کے بڑے حصے کو لے کر جمنا کے دوسرے کنارے پر عبور کر آیا تھا کہ روہیلوں کو جو خوشی سے آمادہ تھے، اپنے ساتھ لے لے اور پھر کچھ آگے بڑھ کر وہ دہلی کے قریب ہی دوبارہ دریا کے پار ہوا اور یکایک سندھیا کے بازو پر ٹوٹ پڑا۔ مرہٹوں کی دو تہائی سپاہ وہیں کھیت رہی اور خود دتاجی مارا گیا البتہ اس کا سوتیلا بھائی جھاواجی جس نے آگے چل کر بہت شہرت پائی، بھاگ کر بچ نکلا۔ ہلکر بھی آگرے کے آگے تک فرار ہوگیا تھا۔ وہاں سے ایک قافلے پر جو افغانی لشکر کے لئے رسد لارہا تھا، اس نے حملہ کیا اور لوٹ لیا، اور پھر اتنا تیز بھاگا کہ نہ صرف جمنا بلکہ چنبل بھی اس کے اور غنیم کے درمیان حائل ہوگئے بایں ہمہ افغانی دستوں نے اس پھرتی سے کام لیا کہ مرہٹوں کے سر پر آپہنچے اور ایک خونریز معرکے میں ہلکر کو شکست دی۔

بھاؤ کو نظام دکن پر فتح پائے ہوئے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مذکورۂ بالا خبروں نے اُس کے جوش افتخار کو ذرا ٹھنڈا کر دیا۔ تاہم وہ اپنی گذشتہ کامیابی پر اتنا پھولا ہوا تھا کہ ان شکستوں میں بھی اُسے اپنی مزید شہرت و ظفرمندی کا موقع نظر آیا اور اُس نے بڑے ذوق شوق سے "ہندوستان میں مرہٹوں کی بگڑی ہوئی ہوا دوبارہ باندھنے اور افغانوں کو اٹک کے پار دھکیل دینے کی" اجازت طلب کی۔ بالاجی پیشوا نے یہ درخواست قبول کی اور خود اپنے بیٹے اور پیشوائی کے آئندہ وارث وسواس راؤ کو سداشیو کے ساتھ کر دیا۔

تجویز قرار پائی کہ بتدریج مرہٹہ جتھے کی جس قدر سپاہ مل سکے، اس سب کو مجتمع کر لیا جائے اور جاٹوں اور راجپوتوں کو بھی گذشتہ واقعات اور کشیدہ تعلقات کے باوجود، حملہ آور مسلمانوں کے مقابلے میں مل کر کام کرنے کی دعوت دی جائے۔ لیکن اس لشکر عظیم کی جان خود پیشوا کی سپاہ تھی جس کی تعداد تیس ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہوگی مگر اس میں چیدہ دستے بہترین اسلحہ سے آراستہ اور نہایت شان و شوکت سے مرتب تھے۔ ان میں بائیس ہزار سوار اور دس ہزار توپ خانہ اور پیادہ سپاہی

باب دوازدہم

تھے جن کو فرنگی طرز پر سدھایا گیا تھا اور بُسّی کا قدیم رفیق ابراہیم خاں گاردی ان کا سردار تھا۔

اُس پرشکوہ لشکر کو بدقسمت بھاؤ، بالآخر تباہ ہونے کے لئے جس شان سے لے کر چلا، اس کی کیفیت کرنل گرانٹ ڈف نے ایک عینی شاہد سے سن کر تحریر کی تھی یہ اس قابل ہے کہ ذیل میں نقل کی جائے کیونکہ اس سے بہت اچھا اندازہ ہوتا ہے کہ بھاؤ کے زمانے کے مرہٹوں میں اُس وقت سے جب کہ سیواجی نے ان کے اجداد کو اپنے سیدھے سادے سخت اور کارآمد اصول پہ مرتب ہونا سکھایا تھا، اب تک کس قدر نمایاں فرق پڑ گیا تھا۔

"اب تک جس قدر بھی مرہٹہ فوجیں لڑنے نکلی تھیں، اِس لشکر کا ظاہری ساز و سامان اُن سب سے زیادہ شاندار تھا۔ ... وسیع اور رفیع خیموں پر ریشم اور مُقیش کی جھالریں لگی تھیں اور ان کے بڑے بڑے چمکیلے کلس دُور دُور سے نظر آتے تھے۔ ہر بڑے سردار کی خیمہ گاہ کے گرد قناتیں کی رنگ برنگی قناتوں کا احاطہ بنا ہوا تھا۔ ہاتھیوں کی بہت ہی کثیر تعداد، بہترین گھوڑے بیش بہا ساز و یراق سے آراستہ پیراستہ، طرح طرح کے پرچم اور بیرق، غرض معلوم ہوتا تھا ہر شے جو ہندی فوج کے لوازم میں داخل اور اس کے تزک و احتشام کا باعث ہوتی ہے، بھاؤ کے لشکرگاہ میں ہر طرف سے سمٹ آئی تھی۔ سرداروں کا لباس کمخواب کا تھا، اور جیسا کہ مفت کی دولت حاصل کرنے والوں کا قاعدہ ہے وہ ایک سے ایک بڑھ کر اپنی شان شوکت کی نمائش میں کوشاں تھے۔ اس معاملے میں انھوں نے تجمل پسند مغلوں کے عہد عروج کے لشکروں کی نقل کی تھی اگرچہ وہ ذوق تزئین اور حسن تناسب اُن میں نہ تھا۔"

مرہٹوں کے تمام رئیسوں، مُکھیا چودھریوں اور آزمودہ کار سرداروں کے نام گنانا غیر ضروری اور خارج از آہنگ ہوگا۔ ان کا لشکر کا لشکر ساتھ آیا تھا کہ کریسی، پوٹیرس (Agincurt) آژیں کور وغیرہ فرانس کے مشہور معرکوں کی طرح، بھاؤ کے لشکر عظیم کی شان و عظمت بڑھائے اور یہ بات سپاہیوں کے دلنشین ہو جائے کہ اس لشکر کا زک اٹھانا، ساری قوم کے نقصان اور بدنامی کا موجب ہوگا۔

باب دوازدہم

یہ تصریح کر دینا مناسب ہوگا کہ ہلکر، سندھیا اور گائکواڑ کی فوجیں چنبل کے قریب پیشوا کے لشکر میں آملیں اور اسی طرح بہت سے چھوٹے موٹے رئیس اپنے اپنے دستے لے آئے راجپوت رئیسوں نے رسالے بھیجے اور جاٹ راجہ تیس ہزار آدمی لے کر خود شریک ہوا۔ اس طرح، گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ "معلوم ہوتا تھا یہ سارے ہندوؤں کا قومی مسئلہ بن گیا"۔ من چلے قسمت آزما، نیم مسلح سپاہی اور پنڈارے ہر سمت سے جوق جوق آکر شامل ہوے۔ (پنڈارے کی ہراس انگیز اصطلاح ابھی سے ایک معروف گروہ پر مستعمل اور کافی زبان زد ہو چکی تھی) یہ اتنا بڑا اجتماع تھا کہ اب اس کی صحیح تعداد کا تخمینہ حاصل کرنا محال نظر آتا ہے۔ لیکن بدنظمی اور نفاق نے تھوڑے ہی دن میں تعداد کم کرنی شروع کر دی اگرچہ جو باقی رہی وہ بھی اتنی کثیر سپاہ تھی کہ بھاؤ جیسا سپہ سالار اس سے بخوبی کام نہ لے سکتا تھا، خصوصاً جب کہ مقابلہ ابدالی جیسے دشمن سے ہو جو لڑکپن سے مرد میداں رہا، اور اپنی فوج کی نقل و حرکت میں بالکل خود مختار اور غنیم کے حالات و خیالات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

مرہٹہ سپہ سالار کی نااہلی محض ناتجربہ کاری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس میں بعض طبعی نقائص اور خطرناک تعصبات تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور جن کی گذشتہ واقعات سے اور زیادہ توثیق ہو گئی۔ اب اس نااہلی کے مضر اثرات بھی بہت جلد ظہور میں آ گئے۔

واضح رہے کہ ہندوستان میں تین مختلف قوموں نے اپنے اپنے طرز پر جنگ کر کے امتیاز حاصل کیا ہے۔ ان میں (مسلمانوں کی) بادشاہی فوجوں کی وجوہ امتیاز یہ تھیں کہ ان کے عالی خاندان سردار موقع شناسی کی تربیت اور سپاہیانہ شجاعت سے موصوف ہوتے۔ ان کے سپاہی قد قامت، قوت اور تعداد میں فائق ہوتے۔ ان کے گھوڑے، قد کے بلند نک ٹک سے درست رہتے۔ ان کے توپ خانے اگرچہ بھدے تھے لیکن زبردست اور پرہیبت نظر آتے۔ ان کی ہر شے میں شاہانہ دریا دلی اور تجمل کی شان ہوتی۔ اور آخری مگر کافی اہم بات یہ تھی کہ ان کے جھنڈے کے نیچے ہندو اور مسلماں پوری ہم آہنگی سے کام کرتے تھے، ان کے بعد مرہٹوں نے شہرت پائی، جو نقل و حرکت کی تیزی، صحیح خبر کی

بہم رسانی اور فوراً کام کرگزرنے میں جواب نہ رکھتے تھے اور ان اوصاف سے جو فوائد ہو سکتے ہیں، ان سب سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ اپنے موقع سے ناگہاں امر کارگر حملہ کرنا۔ جوابی حملے سے کترا کے نکل جانا اور پیچھا کرنے والوں کو پریشان کر ڈالنا۔ اپنی ضرورتوں کو آسانی سے پورا کر لینا اور اسی صفائی سے حریف کے رسل رسائل اور سامان رسد پر اچانک تاخت کرکے اسے تنگ کرنا اور فاقہ کشی کی واقعی تکلیف یا خدشے میں مبتلا کر دینا۔ یہ اُن کے خاص اوصاف تھے اور انھی کی وجہ سے اتنے دن تک ان کی دہشت طاری رہی تھی۔ تیسری قوم جو اسی زمانے میں میدان میں اُتری فرانسیسی تھے جنھوں نے قواعد داں جیوشں اور ہلکی میدانی توپوں کے رواج سے جنگ کی بازی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مگر ایسا سپہ سالار جس نے ان ہرسہ اصول سے ایک جامع اور منظم جنگ آرائی کا نظام بنانے میں کامیابی پائی، حیدر علی تھا جو زیر نظر زمانے ہی میں مشق و تربیت حاصل کر رہا تھا۔ بخلاف اس کے، اگر بے محل نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ بھاؤ، حیدر علی کا عمل معکوس تھا کہ ہر اصول جنگ کے بہترین اجزا جمع کرنے کی بجائے اس نے ان میں سے وہی چیزیں انتخاب کیں جو اس کے حالات سے سب سے کم مناسب تھیں، اور اس طرح ایک ایسا آلۂ حرب تیار کیا جو خود اپنے مقصد کو برباد کرنے کی غرض سے بڑے اہتمام کے ساتھ بنایا گیا ہو۔

عشرت پسندی، تزک و احتشام، بھاری پن، لیت و لعل، خبر رسانی کا ناقص انتظام۔ یہ خصوصیات تو اس نے مغلوں کی اختیار کیں۔ اور مرہٹوں سے ان کے خاندانی جھگڑے، ذاتی کینہ و کاوشں، ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں اُلجھنا، اور ایسے نامہذب طریقوں سے روپیہ وصول کرنا سیکھا جو اُن لوگوں کی نظر میں جنھیں مغلوں کی شاہانہ عظمت و سطوت فراموش نہ ہوئی تھی، قابل نفرت اور ہتک آمیز تھا۔ یہ فطری مذاق، اس کی ابتدائی صحبت کا نتیجہ تھا اور چونکہ مہاراشٹر کے باہر جانے اور دنیا دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی، لہذا یہی خصائل پوری طرح جاگزیں ہو گئے تھے۔ پھر انھی اوصاف کی بدولت اُس نے بہت جلد مرہٹہ طریق جنگ کی فائدہ بخش خصوصیات کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنے دوسرے ہندو رفیقوں کی خدمات

باب دوازدہم

سے بھی محروم ہوگیا۔ آخر میں فرنگی نمونے کے ہندی جیش اور میدانی توپ خانے کے متعلق بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ جن لوگوں نے انھیں رواج دیا، ان کے ہاتھ میں اور قابل سرگروہ کے تحت میں تو واقعی یہ نہایت اعلیٰ درجے کے ہتیار تھے، لیکن عام کلیہ ہے کہ محض کل پرزوں یا نظری اصول سے کوئی لڑائی نہیں جیتی جاتی جب تک کہ کام لینے والے استاد کی چشم تمیز اور فراستِ دماغی عمل نہ کر رہی ہو۔ اور ابراہیم خاں یا بھاؤ، بسّی یا کلائیو بلکہ ڈالٹن بھی نہ تھے۔ اور اگر وہ ان کے مثیل ہوتے تو بھی خالص دیسی فوجیں، خالص دیسی قائدین کی ماتحتی میں وہ عجائبات نہ دکھا سکتی تھیں جو فرنگیوں نے ہندوستان کی معرکہ آرائیوں میں دکھائے ہیں۔ بحالیکہ اُس تیز روشنی کا جو ابھی دونوں کارومنڈل کے اُفق پر نمودار ہوئی، ان دیسیوں پر صرف خفیف سا پر تو پڑ گیا تھا۔

بہر حال ایک ایسے فاسد مجموعے سے کیا توقع کی جا سکتی تھی جس میں سلطنت مغلیہ کی سی دھوم دھام تو تھی مگر اس کے وقار و تمکین، فراخ حوصلگی اور وحدت کا پتہ نہ تھا۔ مرہٹوں کی خود رائی تھی، مگر چوکنا پن اور گریز پائی نہ تھی مغربی لشکروں کی شکل تھی مگر روح نہ تھی۔ اور ان سب کا سرگروہ، بے تکے پن سے کام لینے والا وہ سرپھرا اناڑی آدمی بنا دیا گیا تھا جو ماتحتوں سے حسد اور حلیفوں سے حقارت آمیز برتاؤ کرتا تھا۔ اپنے لائق دشمن کو حقیر سمجھتا تھا اور صریحی شواہد و واقعات کو ٹھکرا کر، ضد سے وہی کرنا چاہتا تھا جس کی اسے ترنگ اُٹھے یا جو اس کے دل میں سما جائے۔

اس لشکر عظیم کا یہ نقص جاٹ راجہ سورج مل نے آتے ہی تاڑ لیا کہ اس میں سوار فوج آزادی سے کام نہ کر سکتی تھی۔ وہ ایک طرف تو پیادوں کی سست نقل و حرکت کا ساتھ دینے پر مجبور تھی دوسرے بھاری توپوں اور عورتوں بچوں نیز بھیڑ کی حفاظت اس کے سپرد تھی اور ان کے کنجروں کے سے بڑے بڑے ٹانڈے لشکر کے ہمراہ تھے نظر برایں اس نے بہ اصرار کہا کہ ان رُکاوٹوں کو دُور کیا جائے اور قریب کے علاقے میں جو بہت سے قلعے موجود ہیں، ان میں سے کسی میں ان عورتوں بچوں کو بھجوا دیا جائے۔ ہلکر نے اس تجویز کی تائید کی۔

باب دوازدہم

مگر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، بھاؤ ہلکر سے بہت پرانا کینہ رکھتا تھا اور اس کی زبان یا دماغ کی کوئی تجویز اُسے پسند نہ تھی۔ حسد، بدگمانی، خودرائی اور یہ غرور بھی کسی کی صلاح ماننے میں مانع تھا کہ فرنگی تدبیر و ہنرمندی میں کوئی شخص ماہر کامل ہے تو وہ صرف میں ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مرہٹوں کے اہل وعیال کو اس غرض سے بطور کفالت، ساتھ رکھنا چاہتا ہو کہ بعض مرہٹہ رئیس وفاداری اور سرگرمی سے کام کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ بہرحال، اُس نے سورج مل کی صلاح ماننے سے انکار کر دیا۔

اس نے پائے تخت دہلی پر سارے لاؤ لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد شہر پر قابض ہو گیا قبضہ ہوتے ہی اس نے تجویز کی کہ سلطنت دہلی کے تخت پر پیشوا کے نوعمر لڑکے وسواس راؤ کو متمکن کر دیا جائے (اور ایک روایت یہ ہے کہ فی الواقع تخت پر بٹھا دیا) جس سے عموماً (شمالی) ہندوستان کے سبھی باشندوں اور نیز جزیرہ نما کے دوسرے اقطاع کے مسلمانوں کو دلی صدمہ پہنچا۔ اسٹی لی چو یا گلی مرکسی آرچ کا تھ یا ونڈال کو روبتہ الکبریٰ کا بادشاہ بنا دیتے تو شاید اطالیہ کے کیتھولک باشندوں کو اتنا شدید رنج نہ ہوتا جتنا کہ اس حرکت سے مسلمانوں اور نیز خاندان تیموری کے غاشیہ بردار راجپوتوں تک کو محسوس ہوا۔

پھر اُس نے مسلمانوں اور نیز راجپوتوں کی ایک اور توہین یہ کی کہ دربار شاہی کے پرشکوہ ایوان میں زیب و زینت کا جو بیش بہا سامان تھا اور سابقہ غارتگروں کی دست برد سے بچ رہا تھا یا اس قسم کی غارتگری کے بعد تلافی مافات کے طور پر از سرنو مہیا کیا گیا تھا سو وہ سب وہاں سے اتروا لیا اور آخر میں نادر شاہ کی تقلید میں خود تخت بادشاہی کو تڑوا دیا۔ مسلمانوں کی ناراضی کے ساتھ راجپوتوں کی دلشکنی کا سبب یہ تھا کہ عموماً ان کی راج کماریاں مغل بادشاہوں سے بیاہی جاتی تھیں اور راجپوت امرا ایوان شاہی میں ہمیشہ حاضر رہتے اور مغلوں کے عزیز عہدہ داروں میں پیش پیش تھے۔

سورج مل اور ہلکر نے ان بیباکیوں کے خلاف کہا سنا بھی مگر انھیں بھاؤ نے از رہ نخوت درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اور انھی بیہودہ افعال کا فوری اور سخت نقصان دہ نتیجہ یہ ہوا کہ جاٹ اور راجپوت رئیس اپنی اپنی فوجیں لے کر واپس چلے گئے اور آئندہ

باب دوازدہم

جنگ عظیم میں لڑنے کے لئے اس آشفتہ سر اور محل نشناس مرہٹے کو تنہا چھوڑ گئے۔

ہندوؤں نے بے وفائی کی تو بھاؤ نے نواب اودھ سے مدد چاہی۔ پہلے بھی وہ اُس کی رضاجوئی کے واسطے یہ تجویز، جو لکھنے کے قابل ہے، پیش کر چکا تھا کہ وسواس راؤ کی بادشاہی میں قلمدان وزارت نواب موصوف کے سپرد کیا جائے۔ یہ مسلمان رئیس ابدالی یا روہیلوں کو ذرا پسند نہ کرتا تھا اور دلخوش کُن باتوں کے علاوہ، آخر وقت تک مصالحت کرا دینے کے نام سے، علانیہ سداشیو سے ذاتی طور پر خط کتابت بھی کرتا رہا۔ بایں ہمہ وہ بلا تاخیر ایک جرار فوج لے کر احمد شاہ سے آملا (جولائی ۱۷۶۰ء) اور اپنی اور اپنے ہمراز مرہٹہ مراسلہ نگار کی سب باتوں سے افغانی بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ اس طرح، سابق وزیر سلطنت کے فرزند کی حیثیت سے اُسے جو رنج پہنچا تھا، پھر مرہٹہ طاقت سے حسد اور بھاؤ کی سیرت اور طرز عمل سے واقفیت اور ان سب کے علاوہ مذہبی تعصبات، ان جملہ اسباب نے مل کر مرہٹوں کو شمال میں مدد ملنے کی جو رہی سہی امید تھی اُسے خاک میں ملا دیا۔

اب سداشیو نے ایک اور تدبیر کی مگر اس سے بھی جہاں اُس کا تلون ظاہر ہوا وہاں ان لوگوں کو اور بھی غصہ آیا جو ان کم ذات لٹیروں کی گستاخی پہ پہلے ہی بگڑ رہے تھے۔ یعنی دوبارہ یہ فیصلہ کرنے کی جرات کی کہ تخت سلطنت کی جسے واقعۃً توڑ چکا تھا، وراثت کا سزاوار کون ہے۔ اس مرتبہ جو نیا بادشاہ بنایا وہ خاندان مغلیہ سے تھا اور اس دفعہ پھر شجاع الدولہ کی وزارت کا اعلان کرایا لیکن جنگ کے ہنگامے میں جس کا اب آغاز ہو گیا تھا، اس فعل کی جانب جو بجائے خود دراز دستی پر مبنی تھا، توجہ کرنے کی کسی کو فرصت نہ ملی۔

بھاؤ نے ایک قصبے پر جہاں ابدالی کے حلیف تھے، یورش کی اور تاراج کر دیا۔ تب، بارش کے کم ہوتے ہی احمد شاہ ابدالی نے جمنا کو عبور کرنے کے پہلے موقع سے کام لیا۔ (اکتوبر ۱۷۶۰ء) غافل مرہٹے ان خبروں کو ناقابل یقین ہی سمجھتے رہے اور وہ بخیریت دریا کے پار اُتر آیا اور دوسری صبح غنیم کے ہراول سے جنگ کی۔

اس نازک موقع پر پھر ہلکر نے بہ تاکید صلاح دی کہ اپنے قدیم طرز جنگ کو

جس میں مرہٹے بلائے بے درماں ثابت ہو چکے تھے، اختیار کیا جائے لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بھاؤ نے اپنا علٰحدہ نقشۂ جنگ سوچ رکھا تھا اور ہلکر کی تجویز اس کے معارض تھی اگرچہ اس گرگِ باران دیدہ نے بطورِ خود جو سعی کی وہ اس درجہ کامیاب ہوئی کہ اُس کی تجویز کو کافی تقویت پہنچی۔[1]

اصل میں بھاؤ اپنے توپ خانے کا گرویدہ تھا اور اسے یہ تمیز نہ تھی کہ اتنے بڑے لشکر سے محض دفاعی مقابلہ کرانا، کس قدر ہمت شکنی کا موجب ہوگا۔ وہ ہٹ کر پانی پت کے قریب مورچہ بند ہوگیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں کئی بار یادگار لڑائیوں میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہُوا ہے۔ یہاں اُس نے وسیع پیمانے پر خندقیں اور دفاعی مورچے بنوانے شروع کئے۔ گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ

[1] ہلکر کے اوصاف و خصائل کا سرجان میل کم نے جو عمومی اندازہ کیا ہے، وہ ملخصاً حسب ذیل ہے:-

"ملہار راؤ جب مرا تو اس کی عمر چھہتر ۷۶ برس کی تھی۔ زندگی میں چالیس سال سے زیادہ ممتاز سپہ سالار رہا اور اس زمانے کے آخری حصے میں یقیناً مرہٹہ جتھے کے سب سے نامور رئیسوں میں شامل تھا۔ . . . طور طریق کی سادگی اور ہمت میں اس کے ہم وطن ملہار راؤ سے بڑھ کر کسی مرہٹہ سردار کے معترف نہ تھے۔ اور اس کی قابلیتیں سپاہ گری تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ جو علاقے براہِ راست اس کے زیر نگیں تھے، ان پر اُس کی حکومت محکم اور اسی کے ساتھ آشتی آمیز تھی . . . . اس کی بڑی خوبی فیاضی تھی کہ ذاتی طور پر روپے کی مطلق پروا نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا (اور غالباً یہ بات غلط نہ تھی) کہ مجھے حساب کتاب نہیں آتا۔ مشیر یا دیوان جو صلاح دیتے کہ اس پیہم انعام و اکرام کو کم کرنا چاہیئے، تو وہ ان مشوروں کو سننا بھی گوارہ نہ کرتا تھا۔ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں بلکہ تمام مرہٹوں کے ساتھ غیر معمولی عنایت سے پیش آتا۔ مرہٹہ جتھے کے ایک رکن کی حیثیت سے جو فرائض اس نے انجام دیے یا پیشوا کے ساتھ جیسا معاملہ کیا، ان کی نسبت کہا گیا ہے کہ جو بات مادھو جی سندھیا دماغ سے کرتا تھا، ہلکر نے اُسے دل سے انجام دیا۔ وہ درحقیقت سیدھا سادا مخلص سپاہی تھا۔ بخلاف اس کے سندھیا میں بہت سے عمدہ اوصاف کے ساتھ سیاسی شاطروں کے تمام فن فریب بھی موجود تھے" (سنٹرل انڈیا۔ اول۔ ۱۵۰)

باب دوازدہم

اس نے لشکر گاہ اور موضع پانی پت دونوں کے گرد بارہ فیٹ گہری اور پچاس فیٹ چوڑی خندق کھدوائی اور دمدمہ بنا کے ان پر توپیں چڑھوا دیں"۔ یہ گویا جادو کا کُنڈل تھا جس میں خود اس کے سپاہی گھر گئے اور جس نے انھیں بچانا تو درکنار الٹا اُن کے جنگی جوش اور قوت بازو پر اپنے اعتماد کو ایسی سرعت سے زائل کرنا شروع کیا جیسے فی الواقع کوئی مسحور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ صفات تھیں جن کی بدولت وہ کسی معرکے میں ہمت نہ ہارتے تھے"۔ ادھر احمد شاہ نے اپنے پڑاو کے گرد شہتیر کٹوا کر ایک باڑ سی بنوا لی اور اسی ہلکی سی پناہ کو کافی سمجھا"۔

تعداد کے اعتبار سے دونوں لشکروں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ ابدالی کے پاس ۲۴ ہزار سوار ۳۸ ہزار پیادہ اور ستر توپیں، مجموعی طور پر کارآمد اور باقاعدہ سپاہی اسی ہزار کے قریب تھے۔ مرہٹوں کے ۵۵ ہزار سوار، ۱۵ ہزار پیادے مل کر ستر ہزار ہوتے تھے لیکن دو سو توپیں تھیں اور ان سے افغان بادشاہ کی بیشی تعداد کی تلافی ہو سکتی تھی۔ لیکن اتنی توپوں کی نقل و حرکت اور ان سے کام لینے کی دشواری، پھر مورچہ بند پڑاو کی حفاظت جس میں عورتیں بچے بھرے پڑے تھے، ان اسباب سے یہ ظاہری فوقیت بہت کچھ زائل ہو گئی تھی۔

پھر اہل اودھ کو نہیں، تو افغانوں کو قد قامت میں بھی بعض اعتبار سے اور خاص خاص صورتوں میں وہی برتری حاصل تھی جو گذشتہ جنگ میں جرمنوں کو اپنے تند و چالاک گر کم جثہ و کم مستقل فرانسیسی دشمنوں پر تھی۔ یہ برتری نمایاں نہ ہو مگر قطعی طور پر موجود تھی۔ پھرتی اور چابک دستی مرہٹوں کا خاص وصف تھا۔ تیز و تند حملہ کرنے اور لڑائی کے پہلے تصادم اور جھپٹے میں کام کر جانے میں وہ کمال رکھتے تھے لیکن برابر کی ٹکر میں بھڑ کر لڑنا، یا طویل کشمکش جس میں صرف پے در پے اور مسلسل کوشش سے فتح حاصل ہو سکتی ہے، اس میں اُن کے پہاڑی ہونے کے باوجود یہ اندیشہ تھا کہ صحت بخش و عظیم کوہستان ہمالیہ کی سرحد کے قوی الجثہ اور دیو قامت حملہ آور ان پر بھاری پڑیں گے۔

اِن سب وجوہ کے لحاظ سے جنگ کا فیصلہ بہت کچھ میدان کی حالت اور نوعیت پر اور دوسرے اس بات پر مبنی ہو گیا تھا کہ افغان اپنی ہنرمندی اور اہتمام

باب دوازدہم

سے مرہٹہ سواروں کی شدید یورشں کے سامنے تھمے رہیں اور اس طوفانی سیلاب کو کسی طرح دھیما کر دیں جس کا پہلا ریلا مشکل سے رُکتا تھا، تاکہ پھر ان کی دیر پا قوت اور جسمانی مضبوطی کو اپنی فوقیت قائم کرنے کا وقت مل جائے۔ یہاں یہ اور وضاحت کر دینی چاہیئے کہ ابدالی کے لشکر میں باقاعدہ سپاہ کے علاوہ اسی قدر نیم مسلح جوان تھے اور مرہٹوں کی تعداد ایسے کمتر درجے کے سپاہیوں، پنڈاروں یا نیم سپاہی اور نیم غارتگر ساتھیوں کو ملا کر دو لاکھ سے بھی اوپر پہنچتی تھی۔

یہاں تک تو سپاہ کا ذکر تھا۔ رہے سپہ سالار تو ان میں کامل اور نمایاں فرق تھا۔ سداشیو کی سیرت وخصائل کا میں اوپر نقشہ دکھا چکا ہوں اور اس معرکے میں سیاست دانی اور سپاہ گری دونوں اعتبار سے اس کی نااہلی کے اثرات دکھانے کی بھی میں نے کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مہاراشٹر میں اس کا نظم ونسق قابل تعریف رہا لیکن شمال میں وہ بداہتہً خارج از آہنگ نظر آتا تھا اور پھر یہاں اسے سپہ سالاری کرنی تھی اور وہ بھی ابدالی جیسے سپہ سالار کے مقابلے میں۔

بخلاف اس کے احمد شاہ ابدالی پر نظر کیجیے تو وہ اس زمانے میں جب کہ بہت سے نامی اشخاص اپنی قابلیت اور سعی سے بلند مراتب پر پہنچے اور سلطنت مغلیہ کے انحطاط واختلال کے عالم میں انھوں نے بڑے بڑے کرشمے دکھائے، احمد شاہ ان مشاہیر کی بھی صف اول میں جگہ رکھتا ہے۔ وہ افغانوں میں نہایت ذی وجاہت خاندان کا شخص اور ایسے مدبر کا بیٹا تھا جس کی ایران میں سفارتی خدمات دیکھ کر ایک وحشی ملک کے وحشی قبائل بھی اُس کے ثناخواں ہو گئے تھے۔ پھر ابتداً اسے گرم وسرد زمانہ دیکھنے سے احمد کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو گیا اور فوج میں جنگی تربیت اُس نے خود نادر شاہ جیسے اُستادِ فن کی نگرانی میں حاصل کی۔ نادر شاہ قتل ہوا تو احمد اپنی افغانی فوج لے کر ایران سے واپس وطن چلا آیا اور ایک طویل وعجیب مباحثے کے بعد کسی درویش کی قطعی تحریک پر پوری قوم کا متفقہ بادشاہ منتخب کیا گیا۔ حالانکہ اس کی عمر تیئیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن بہت جلد اُس کی مصلحت اندیشی نے اِس انتخاب کی صحت کی تصدیق کر دی۔ اُس نے حاسد وفتنہ پرداز قبائل کی خانہ جنگیوں کو فرو کیا۔ اپنی مرکزی حکومت میں دور دور کے، دل برداشتہ یا مذبذب رئیسوں کو شریک

باب دوازدہم

کرکے حدود اثر میں توسیع کی عاقلانہ احکام وضوابط سے مختلف النسل قبائل میں وحدت پیدا کی اور ایسے حاکم کا احترام دلوں میں قائم کیا جو اپنی حکومت منوانے پر بھی اسی قدر آمادہ تھا جس قدر اپنے ماتحتوں کی دادرسی اور تحفظ حقوق پر اسی کے ساتھ اس نے جنگجوئی کے جوش کو بیرونی ممالک میں لگا دیا جو ایسا نہ ہونے کی صورت میں یقیناً باہمی کشت وخوں اور خطرناک بغاوتوں میں صرف ہوتا۔ اس تدبیر سے اپنے عہدۂ بادشاہی کے طبعی خطرات پر غالب آگیا اور چند ہی سال کے عرصے میں ایشیا کے سب سے قوی حکمرانوں میں شمار ہونے لگا۔ لیکن میں نے احمد شاہ کے لئے جو مرتبہ تجویز کیا ہے، اس کے استحقاق کے لئے یہی کافی نہ تھا بلکہ بہ حیثیت بادشاہ وکشورکشا اس کے قابل افتخار کارنامے یہ ہیں کہ افغانوں کی شعلہ مزاج وآئیں نشناس قوم کو منضبط اور متحد کرکے نادر شاہ کی جنگی فتوحات کی مثل کام انجام دیے۔

مزید برآں، ذاتی کردار و دین داری میں احمد شاہ کا رتبہ اور بھی بلند ہے۔ سیانے اور مستقل مزاج لیکن خود غرض، سفلہ مذاق اور سراپا دنیا دار قسمت آزماؤں کی وہ تیرہ رُو جماعت جس نے حرص وہوس میں استقامت دکھائی اور بالآخر کامیابی پائی۔ اسی ہوس کے لئے ایسے ایسے افعال کی مرتکب ہوئی کہ ممکن ہے ان کی سرگزشت پڑھ کر سادہ دل ناظرین کے اسی طرح دل لرز جائیں جیسے کسی ایشیائی سیزر بورجیا کی سرگزشت پڑھ کر مگر احمد شاہ ابدالی کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان دنیا پرستوں میں سب سے علٰحدہ نظر آتا ہے۔

ممکن ہے یہ بات اجتماع ضدین معلوم ہو۔ خصوصاً اس لئے کہ ابدالی کے نام کے ساتھ کشت وخون کے مناظر آنکھوں میں پھر جاتے ہیں جو اُس کی قوم کی خونخواری کے لازمی نتائج تھے اور انھیں پڑھ کر طامس راہب (Thomas A Kempis) کی بجائے تیمور زیادہ یاد آتا ہے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت ہے کہ احمد شاہ ابدالی نہ صرف مہذب وتربیت یافتہ آدمی تھا، بلکہ پکا صوفی اور اعلیٰ درجے کا مذہبی شاعر بھی تھا۔ بے شبہہ اس پر ایرانی اثرات پڑے تھے اور کچھ عجب نہیں کہ نادر شاہ کی عین گم کردہ راہی اور مذہبی جور وتشدد کے زمانے میں اس کا عبرت انگیز انجام دیکھ کر بھی نوجوان احمد بہت متاثر ہوا ہے۔ غرض اسباب جو کچھ بھی ہوں، یہ بالکل مسلم ہے کہ وہ خدا جوئی کا سچا ذوق شوق رکھتا تھا جس کا اظہار کبھی کبھی اس قسم کے مناجات کے اشعار میں بھی ہوا ہے۔

"اے خدا، میں اپنے گناہ اور بدکرداری سے شرمندہ ہوں اور مجھے

التجا کرتا ہوں۔ کہ تیری رحمت سے کوئی مایوس نہیں گیا۔

اے خدا تیری رحمت و رافت کی کوئی حد نہیں اور میرے گناہ بے پایاں اور بے حساب ہیں۔ اپنی بے اعتدالیوں پر نظر پڑتی ہے تو کہتا ہوں کہ کاش میں پرکاہ ہوتا۔

اے خدا، میری سرشت گناہوں اور خواہشوں میں آلودہ ہے۔ ہزار کوشش کروں، شیطان کی ترغیب سے نجات نہیں ملتی۔ اگر دل کو بُرائی سے بچانا ممکن ہو، تو بھی آنکھوں کو بچانا ممکن نہیں ہے۔

اے احمد، خدا ہی سے استعانت کر، گردولت و جاہ پر اعتماد نہ کر۔

گوشۂ تنہائی میں احمد کی یہ شان تھی۔ لیکن اس کے صوفیانہ تزکیہ و استغفار کو چھوڑ کر سپہ گری پر نظر ڈالئے تو بالکل دوسرا عالم نظر آتا ہے۔ اگرچہ کہہ سکتے ہیں کہ وہی فطری خلوص جو خلوت میں اُس سے باری تعالیٰ کے حضور، مغفرت اور تسکین و استقامت کی دعا منگواتا ہے۔ میدان جنگ میں اس امر کا محرک ہے کہ جو کچھ سامنے آئے اسے پوری قوت سے انجام دے۔ اور اسی لئے وہ جس قدر صاحب غور و فکر با ہوش و ہمت سپہ سالار ہے اسی قدر زیادہ قابل و کامیاب بھی ہے۔

اس کے جنگی اوصاف کے متعلق ذیل کے فقرے سے، جو اس کے انتخاب بادشاہی کے وقت کا ہے، کچھ اندازہ ہوگا:۔

"سرداری کے یہ سب اوصاف احمد شاہ میں پائے گئے۔ جس کے جوشِ جوانی کو اسیری معتدل کر چکی تھی اور لڑکپن سے قیادت کرنے کے باعث، وہ نشیب و فراز اور ذمہ داریاں جو ایک سپاہی کو پیش آتی ہیں، ان سب کا بخوبی تجربہ رکھتا تھا۔ مگر یہ ابتدائی قیادت بھی سخت ترین ضوابط کی پابند رہی تھی۔ وہ اپنی تدابیر میں نہایت فہیم و دوراندیش تھا لیکن ان پر عمل کرنے میں ایک طرف وہ صبر دکھاتا تھا جو انتہائی مستقل مزاجی کا نتیجہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنی جلد فیصلہ کر لیتا تھا کہ صرف

---

[1] کلکتہ ریویو، نمبر ۱۰۱ میں ایک نہایت دلچسپ مضمون احمد شاہ ابدالی پر بہت خوبی سے لکھا گیا تھا۔ یہ اقتباسات وہیں سے لئے گئے ہیں۔

باب دوازدہم

وہی شخص ایسا کرسکتا ہے جسے جنگ کی نیرنگیوں کا پورا تجربہ ہو اور ہر تبدیلی سے فائدہ اٹھالے۔" (کلکتہ ریویو۔ ع۱۱ صفحہ ۷)

اس عبارت میں اور بہت کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں اسی قدر کافی ہے خصوصاً جب کہ مقابلہ بھاؤ جیسے حریف سے تھا۔

اس معرکے میں احمد شاہ نے مرہٹہ لشکر کے نقشے اور ترتیب کا صحیح اندازہ کرلیا۔ خود اس کے سپاہی جنگ کے لئے بیقرار ہو رہے تھے اور اتنے کثیر گروہ کی رسدسانی میں بھی بڑی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ بایں ہمہ احمد شاہ نے عام جنگ کا اقدام کرنے یا مرہٹوں کے مورچہ بند لشکرگاہ پر یورش کرنے اور کسی ہمت شکن پسپائی کا جوکھوں مول لینے سے قطعی انکار کردیا فریقین میں باہم نامہ وپیام اور بھاؤ کی نواب اودھ سے بیچ کی خط کتابت برابر جاری تھی۔ اور احمد شاہ کا یہ حلیف ان راز کے مراسلات کا خلاصہ بتا دینے میں کبھی غفلت نہ کرتا تھا۔ اس ذریعے نیز دوسرے طریقوں سے اسے علم ہوگیا اور خود صورتِ حالات سے بھی قیاس ہوسکتا تھا کہ مرہٹہ غارتگروں کی بڑی بڑی ٹکڑیوں کا جو معمول تھا کہ گرد و نواح کے علاقے کو لوٹ کر خود جنگ سے جنگ کے اسباب و رسد بہم پہنچا لیتے تھے، اس میں خلل پڑ گیا ہے۔ مرہٹہ سپاہی نہ تو قلت رسد کی تکلیف سہنے کے عادی ہیں اور نہ جو ذخیرے ہاتھ میں ہوں، ان سے کفایت شعاری کے ساتھ کام لینا جانتے ہیں۔ ایک طرف تو ابراہیم خاں کے اجیر سپاہیوں کی معنویانہ شورش نے، کہ پچھلی تنخواہ ادا کی جائے، انھیں سخت پریشان کرڈالا ہے کیونکہ بھاؤ کا خزانہ روز بروز خالی ہوتا جاتا ہے اور وہ بقایا ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ دوسری طرف ہزاروں بھگوڑے، لٹیرے، عورتیں بچے پڑاو میں جمع ہیں، ان کی وجہ سے فوجی انتظامات میں رکاوٹیں پڑتی ہیں۔ ایک جگہ بیکار پڑے رہنے سے سپاہی دل برداشتہ اور اپنے سرداروں کے باہمی جھگڑوں سے بدمزاج ہوئے جاتے ہیں۔ غرض یہ سب ایسے اسباب ہیں کہ بہت ممکن ہے وہ گھبرا کر خود لڑ پڑیں اور جب تک ایسا نہ کریں گے اس وقت تک اپنے پڑاو میں بھنچے رہیں گے اور اس میں بھی احمد شاہ کا فائدہ اور خود ان کا نقصان ہے۔

مزید برآں تھوڑی ہی مدت میں دو مقابلے پیش آئے جن میں مرہٹہ حریفوں نے

باب دوازدہم

وہ غیظ و غضب اور مردانگی دکھائی کہ احمد شاہ اگر ان سے خوفزدہ نہ ہوا، تو بھی ان کو ہان ضرور گیا ہوگا۔ اور اس تجربے کے بعد اُسے پورے مرہٹہ لشکر کی زد اٹھانے میں تامل ہوگا جب تک کہ مایوسی، نفاق اور فاقہ کشی ہی حریف کی طاقت کو کافی کمزور نہ کردے۔ ان مقابلوں میں ایک تو وہ تھا کہ ہلکر پندرہ ہزار سواروں سے افغانی لشکرگاہ میں گھس پڑا اور جب تک تھک پہنچے دو ہزار سپاہیوں کو کاٹ گیا اور خود اس کا نصف نقصان اٹھا کر پسپا ہوا۔ دوسری دفعہ سداشیو بھاؤ کا دیوان بلونت راؤ، جو اچھا فوجی سوار بھی تھا، اس نے ابدالی کے وزیر پر مسجد کو جاتے وقت کھلے میدان میں حملہ کیا اور تین ہزار روہیلے جنھیں نجیب الدولہ مدد کے لئے لایا تھا، مارے گئے تا آنکہ بلونت راؤ بھی یہیں کھیت رہا۔ معلوم ہوتا تھا بھاؤ پر آنے والی مصیبت کا خوف مسلط ہوتا جاتا اور اس کے قوا کو معطل کئے دیتا ہے کہ اپنے دیوان اور دوست کی موت کی خبر سن کر وہ خلوت کے خیمے میں چلا گیا، اور دیر تک مقتول کا ماتم کرتا رہا۔

الغرض، کچھ مدت تک فریقین نے اسی پر اکتفا کی کہ ایک دوسرے کی نگرانی کرتے رہیں یا پُرانے ہومری عہد کی رسم کے مطابق جریدہ سپاہیوں کے مقابلے کا تماشا دیکھا کریں۔ یہ مقابلے لشکرگاہوں کے درمیان کے میدان میں ہوتے تھے اور اس جگہ ایک حصار سا کھینچ دیا گیا تھا۔ راجپوت اور جاٹ جنگ سے علحدہ ہو گئے تھے لیکن اپنے ہندو ہموطنوں کی کبھی کبھی روپے پیسے اور سامان رسد بھیج کر امداد کئے جاتے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ مرض کا پورا مداوا نہ ہوسکتا تھا۔ دوسرے دشمن (یعنی افغانی لشکر) مرہٹوں کے مستمرہ دستور کے جواب میں اکثر فرستادہ سامان کو لوٹ لیتا تھا۔ احمد شاہ نے روک تھام کا جو منصوبہ سوچا تھا، اس پر عمل کرنے میں جس قدر مستعدی اور پیہم مشقت سے کام کر رہا تھا، اسی قدر قوت بازو پر بھروسہ رکھتا تھا اور ماتحتوں سے حکم منوانے میں ذرا سی کوتاہی جائز نہ رکھتا تھا۔ الفنسٹن ایک عینی شاہد کی سند پر (جسے اس روایت کی، کہا جاتا ہے کہ ہلکر نے اجازت دی تھی) بیان کرتا ہے کہ احمد شاہ تمام دن گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا، اور اپنی اور دشمن کی چوکیوں کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا۔ اس طرح کم سے کم پچاس ساٹھ میل کا روزانہ گشت لگاتا تھا۔ رات کو پانچ ہزار سواروں کا پہرا دشمن کے لشکر سے جہاں تک ممکن ہو قریب مقرر کرتا اور

باب دوازدہم

اپنے پڑاؤ کے گرد گشت لگانے کی غرض سے چوکیداروں کی ٹولیاں علحدہ ہوتیں۔ کاشی راؤ نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ اُس کے احکام قضا و قدر کی شل بجالائے جاتے تھے اور کسی متنفس کی مجال نہ تھی کہ ان کی تعمیل میں ذرا بھی تامل یا تاخیر کو راہ دے؛

زمانۂ جنگ میں اِس عجیب شمالی امیر کی یہ کیفیت تھی جسے تقدیر نے انتخاب کیا تھا کہ جنوب کی حد سے بڑھنے اور چھا جانے والے سرکشوں کا سر توڑ کر انھیں غرور و نخوت کا مزا چکھائے گا۔

القصہ اب ان مرہٹہ جنگ آزماوں پر بُری بنی تھی۔ وہ ہر طرف سے گھرے ہوئے جھلا رہے تھے۔ فاقہ کشی کی نوبت تھی۔ روز بروز طاقت گھٹ رہی تھی اور پرنس بسمارک کے بلیغ قول کے مصداق، اپنی چربی میں آپ پگھل رہے تھے۔ یا تو چند روز پہلے تک ہندوستان کے ہر گوشے میں مظفر و منصور ہوتے تھے اور یا آج یہاں اتنے نامساعد حالات کے نرغے میں پڑے تھے۔ اور ان پریشانیوں سے تنگ آکر بالآخر مُصر تھے کہ انھیں میدان میں لڑایا جائے کہ یا کامیاب ہوں یا جان سے گزر جائیں۔ رات ہی کو ایک بڑی جمعیت اپنی مرضی سے سامان خوراک کی مایوسانہ تلاش میں نکل کھڑی ہوئی جسے راستے میں غنیم نے آلیا اور ترس کھائے بغیر ذبح کر ڈالا تھا۔ لشکر گاہ میں خوراک فقط اتنی رہ گئی کہ ایک مار پیٹ بھر کے کھا لی جائے۔ لیکن زمانۂ حال کی ترقی یافتہ صورت کہ ایسی مجبوریوں میں سارا لشکر ہتیار ڈال دے بظاہر ان غازیگروں کے ذہن میں بھی نہ آئی۔ وہ کامل ناامیدی کے باوجود جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

آخر نہ ٹلنے والا وقت آپہنچا۔ بھاؤ نے سکون و افسردگی کے لہجے میں جنگ کا حکم دیا (۱۴ر جنوری ۱۷۶۱ء) سپاہیوں نے ایک مرتبہ اور کھانا کھایا اور پھر اس پڑاؤ سے باہر نکلے جس میں دو مہینے کی طویل و مضمحل کُن مدت تک ایسے قیدی بنے رہے تھے کہ ہمتیں پست ہوگئیں۔ پڑاؤ کو انھوں نے کچھ اس طرح چھوڑا جیسے کوئی وحشت انگیز و نامانوس سرداب کے مرطوب و تاریک حجروں سے گھبرا کر باہر آتا ہے۔ مگر لڑائی میں بھی نہ اُن کا وہ ناز و اعتماد نظر آتا تھا جو اپنے اجداد کے سلاطین مغلیہ کا طویل و کامیاب مقابلہ کرنے کی یاد سے پیدا ہونا چاہئے تھا۔ نہ اپنی دُور دور کی فتوحات یا اپنے ہمسایہ اور دائمی حریف نواب نظام الملک پر حالیہ فتح کامل کی یاد اور مسرت باقی تھی۔

باب دوازدہم

نہ جنگ کے نشاط انگیز جذبے سے چہرے مسرور و فرحناک تھے۔ بخلاف اس کے وہ انتہائی افسردگی میں ڈوبے ہوئے تھے اور سوائے اپنی شکست کے کامل یقین کے اور کوئی امید نہ رکھتے تھے۔ ان کے لباس اور پریشان صورت، ہر چیز پر تباہی برس رہی تھی اور صرف اس بات کے خواہاں تھے کہ اس طویل اسیری سے نکل کر پوری جانبازی دکھائیں اور زیادہ سے زیادہ قیمت میں اپنی جانیں فروخت کریں[1]۔

بھاؤ نے اپنی بیوی اور خاص خاص سرداروں کے اہل و عیال کو یہ سمجھ کر ہلکر کے سپرد کیا تھا کہ جنگ سے زندہ بچا تو شاید باا‌ثر مگر انتقام پسند روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی نظر میں رعایت و عنایت کا سب سے بڑھ کر مستحق وہی ہو سکتا ہے۔ کاسی راؤ کے پاس بھی ایک آخری اور پُر اثر التجا لکھ بھیجی جو مرسل الیہ کے پاس اُس وقت پہنچی جس کے تھوڑی ہی دیر بعد فریقین ایک دوسرے سے بھڑ گئے اور قیامت انگیز معرکہ بپا ہو گیا۔ بھاؤ کے اس خط میں تحریر تھا کہ "پیالہ منہ تک لبریز ہو چکا ہے اور ایک قطرے کی بھی اس میں گنجائش نہیں رہی۔ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو ابھی کر دو ورنہ صاف صاف فوراً مجھے جواب دو۔ اس کے بعد لکھنے یا بات کرنے کا وقت نہیں رہے گا" اس قسم کے آخری انتظامات کرنے کے بعد وہ اپنی سپاہ کو لے کر کھلے میدان میں آیا اور اسے ترتیب سے جمایا۔ سامنے کی صف میں توپ خانہ نصب کیا جس نے ایک باڑھ سے لڑائی کی ابتدا کی۔ غنیم کی طرف سے جواب میں توپیں چلیں اور گولہ باری کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ فریقین کے لشکر کشاکش میں اپنی توپوں سے آگے بڑھ آئے اور اس کے بعد سے معلوم ہوتا ہے توپ خانوں نے جنگ میں بہت کم حصہ لیا؛

بھاؤ اپنے نوعمر بھتیجے وسواس راؤ اور جسونت راؤ پوار سمیت وسط لشکر میں تھا اور ان کی سپاہ خاصہ بھی یہیں تھی۔ انھی سرداروں کے روبرو مرہٹہ

---

[1] گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ "ان کی پگڑیوں کے سرے کھلے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ہاتھ اور چہروں پر ہلدی کا اُبٹنا ملا تھا جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ مرنے کے لئے نکلے ہیں۔ اسی طرح ہر شے سے فتح کے تیقن کی بجائے جان دینے کی مایوسی نمایاں تھی۔"

قوم کا بڑا پرچم بھگوا جھنڈا لہرا رہا اور بڑے بڑے معرکوں کی قابل فخر یادولا رہا تھا۔ میمنہ کی قیادت سندھیا کو تفویض ہوئی اور میسرہ پر گائکواڑ کے ساتھ اب ابراہیم خاں کو شریک کر دیا گیا تھا۔

ادھر شاہ کو اول اول اس خبر کا یقین نہ آیا کہ واقعی دشمن کسی عام جنگ کے لئے پورے لشکر کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اور وہ دیکھ بھال کرنے کی غرض سے خود سوار ہو کر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ توپوں کے طویل اور فلک شگاف دھماکوں سے خبر کی تصدیق ہوئی۔ تب اُس نے اطمینان سے حقے کی نَے منہ سے ہٹائی اور شجاع الدولہ سے کہا وہ معلوم ہوا، آپ کے نوکر کی خبر بالکل صحیح تھی۔" پھر اُس نے بلا تاخیر اپنی سپاہ کو مرتب کیا۔ وزیر اعظم شاہ ولی خاں کو قلب میں جگہ دی افغانی لشکر کی بیشتر تعداد جس میں دس ہزار سوار تھے اسی کے زیر قیادت تھی۔ تین روہیلہ اور دو اور بڑے سردار میمنہ پر مقرر کئے۔ میسرہ نواب اودھ اور نجیب الدولہ خاں کے تفویض کیا۔ یہ روہیلہ امیر پیہم تجربات سے بخوبی جانتا تھا کہ مرہٹہ رسالے کی بے تحاشا یورش روکنا کیسا دشوار ہوتا ہے۔ نظر برایں، کمال دوراندیشی اور بڑی شفقت سے اُس نے ایک کام وہ کیا جو عجب نہیں کہ جنگ کا بالآخر فیصلہ کرنے میں سب سے کارگر سبب ہوا ہو۔ یعنے آگے بڑھتے بڑھتے وہ جا بجا عجلت میں دُھس بنواتا گیا کہ اگر اس کے سپاہی پسپا ہوں تو ان کی پناہ لے کر تھم جائیں اور ریلے میں بہے نہ چلے جائیں۔

جس وقت واقعی لڑائی شروع ہوئی تو بہت جلد اس حفظ ماتقدم کی دانائی ثابت ہوگئی۔ مرہٹہ لشکر کے قلب نے جنگ کا مشہور و جوش انگیز نعرہ بلند کیا اور نہ آدھی مینہ کے طوفان کی طرح یکبارگی سب مل کر سامنے کے افغانی لشکر پر آپڑے۔ چونکہ ریلے کا زور روکنے کے لئے سامنے سے کوئی رسالے کا حملہ نہ ہوا تھا لہٰذا یہ لشکر عظیم نہ رکنے والے سیلاب کی طرح، بھپرے ہوئے دشمن کی صفوں کو چیرتا پھاڑتا دور تک بڑھتا ہوا چلا گیا۔ ٹکر کے ساتھ ہی خوفناک شور و غوغا اور خونریز دست بدست کشمکش شروع ہوگئی۔ گرد کا ایسا دل بادل فوراً میدان میں چھا گیا تھا کہ فریقین صرف جنگی نعروں سے دوست دشمن میں تمیز کر سکتے تھے۔ "ہر ہر مہادیو" کے جواب میں افغانی مجاہدین "دین دین" کے نعرے لگاتے تھے اور یہ وہ صدا ہے جو خود ہمارے زمانے

یں ہزاروں انگریز مرد و عورت کا پیام قضا بن کر، زہرہ آب آب کر چکی ہے!

افغانی وزیر نے دیکھا کہ اس کے دلاور سپاہی اگرچہ الگ الگ ٹکڑیوں میں لڑ رہے ہیں لیکن ہر طرف سے ان پر دباؤ پڑ رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ ان کے بالکل پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔ تو وہ پانچوں ہتیار لگائے گھوڑے سے کود پڑا اس خطرناک جانبازی کی بہت سے سرداروں نے بھی تقلید کی لیکن قوت بازو پر اتنا بھروسا دکھانے کے باوجود ان کی بہادری پوری طرح کارگر نہ ہوئی اور افغانی سپاہی پیچھے ہی ہٹتے چلے گئے حتیٰ کہ ان میں سراسیگی پیدا ہونے لگی۔ پریشان خاطر سپہ سالار چلایا "دوستو، ہمارا وطن بہت دور ہے۔ تم بھاگتے کدھر ہو!" یہ التجائیں بھی سود مند نہ ہوئیں۔ بہت سے سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور کچھ دیر صرف ایک مٹھی بھر جماعت اس کے گرد رہ گئی۔

وسط میدان میں تو جنگ کا یہ طور تھا اِدھر مرہٹوں کے میسرے نے بھی اپنی شہرت قائم رکھنے میں کم کامیابی نہ پائی۔ ابراہیم خاں کی دانش مندانہ نقل و حرکت نے دکہ دو دستوں کو گھما کر بائیں طرف سے اپنے عقب کی جانب لے آیا) بازو کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا اور لڑانے میں بھی خاں کی ذاتی سعی و جانفشانی بڑا کام کر گئی۔ اس میں شک نہیں کہ خود یہ سپہ سالار زخمی ہوا اور اس کے آدھے سے زیادہ سپاہی کھیت رہے لیکن افغانی میمنہ بھی اس قیامت خیز حملے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور میدان کے صرف اس حصے میں کم و بیش آٹھ ہزار روہیلے مقتول یا مجروح ہو کر زمین پر لوٹنے لگے۔

طلوع آفتاب سے جنگ شروع ہوئی اور دوپہر تک برابر جاری تھی کہ احمد شاہ نے جو عقب لشکر سے ایک آزمودہ کار سپہ سالار کی طرح میدان کے ہر حصے اور میزان جنگ کے بار بار جھکتے اور اٹھتے پلڑوں کو غور سے جانچتا اور کامل سکون وصحت کے ساتھ احکام نافذ کر رہا تھا، اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کا صرف میسرہ ہنگامی دھکوں کی مدد سے بالکل سلامت ہے لیکن سخت اندیشہ ہے کہ بازو کی طرف سے دشمن عقب میں پہنچ کر اسے پامال نہ کر ڈالے۔ لنظر برایں اس نے جنگ کو پھر مستقیم کرنے کی ایک پوری اور بڑی کوشش کی تیاری کی۔ اس نے عاقبت اندیشی

باب دوازدہم

سے ایک بڑی جمعیت ردیف میں لگا رکھی تھی حالانکہ مرہٹوں نے اس قسم کا مطلق کوئی حفظ ماتقدم نہ کیا تھا مزید براں لشکر گاہ میں جو سپاہی ادھر اُدھر یا کسی بہانے سے رہ گئے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سب کو باہر جمع کیا۔ میمنے کو فوراً مدد پہنچائی اور اس کے پاؤں جم گئے۔ دس ہزار تازہ دم سوار شاہ ولی خاں کے تفویض ہوئے اور حکم کہ مرہٹوں کے قلب لشکر پر جواب تک بالکل کامیاب تھا، پے در پے حملے کرے۔ ادھر نجیب الدولہ اور ایک افغان سپہ سالار شاہ پسند خاں کو ہدایت پہنچی کہ وہ چیدہ افغانی جمعیت سے بھاؤ کے میمنے پر جو اتنا کامیاب نہ تھا، یورش کریں اور بالواسطہ شاہ ولی خاں کے حملوں کو تقویت پہنچائیں۔

اب جنگ تُل کے ہونے لگی اور دو گھنٹے تک خوفناک خونریزی اور شدت سے جاری رہی۔ صرف ہلکر کی نسبت لوگ سمجھتے تھے کہ پوری قوت سے نہیں لڑا۔ بہر حال، ہر چند میدان میں نکلتے وقت اس کے ہم قوم بہت مایوس اور کمزور نظر آتے تھے، لیکن جب واقعی جنگ کی نوبت آئی تو معلوم ہوتا ہے انھوں نے نہ صرف مصمم اور کارگر شجاعت، بلکہ اس طویل و پرمشقت کشاکش میں اس قدر جسمانی برداشت دکھائی جو حقیقت میں قابل تعجب تھی۔ بھوکے اور بے حد ناتواں ہوجانے اور شمال کے کہیں زیادہ قوی الجثہ کوہستانیوں کا مقابلہ ہونے کے باوجود، وہ مایوسانہ مستعدی اور مذہبی اور قومی تنفر کی اشتعال انگیز غضب ناکی کے ساتھ لڑتے رہے۔ لیکن بالآخر وسواس راؤ مہلک زخم کھا کے گرا۔ بدقسمت بھاؤ پر غالباً یکایک خاندانی جذبات کا غلبہ ہوا اور شاید اس ضرب میں قضائے مبرم کا ہاتھ نظر آیا کہ ہاتھی پر سے اُتر پڑا۔ ہلکر کو واقعۃً، یا جیسا کہ مشہور ہے مبہم سی ہدایتیں کیں پھر جہاں سب سے گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، وہاں گھس پڑا اور قرینۂ غالب یہی ہے کہ بہت جلد مارا گیا اگرچہ کچھ عرصے بعد یہ سوال اٹھا تھا کہ وہ حقیقت میں یہاں کھیت رہا یا بچ کر نکل گیا۔

بہر کیف جیسا کہ اور اکثر موقعوں پر ہوا ہے سر لشکر کے غائب ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریب قریب اُسی آن پورے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور پھر کہیں نہ ٹھیر سکے۔ بھاؤ نے ہلکر سے جو کچھ کہا، اس کا اصلی منشا کیا تھا، یہ ہمیشہ راز سربستہ ہی رہے گا۔

البتہ ہم اتنا قیاس کر سکتے ہیں کہ جیسا بالاکلاوا کے معرکے میں ہوا تھا۔

"کسی نے بڑی سنگین خطا کی"

رہا ہلکر، تو وہ اسی وقت میدان سے نکل کر فرار ہو گیا اور گائکواڑ نے بھی بے تامل اُس کی تقلید کی۔[1]

اب ساری سپاہ درہم برہم ہو گئی اور بھاگنے کی بھی بے سود کوشش کرنے لگی۔ اس طویل و پُرعناد جنگ کے دوسرے مناظر کچھ کم اور کم خوفناک نہ تھے مگر اب ان میں قتل عام کا اضافہ ہو گیا۔ مرہٹہ مقتولوں سے جو بھاگتے میں مارے گئے سارا میدان پٹ گیا۔ بھاؤ کے لشکر گاہ کے گرد جو خندقیں تھیں ان میں ہزاروں آدمی بے حواس ہو ہو کر گرے اور اس سے قبل کہ بچ کر نکل سکیں روندن میں آ کر ہلاک ہوئے۔ خونخوار فتحمندوں نے ساری رات لشکر گاہ کو گھیرے رکھا اور صبح ہوتے ہی عورتوں بچوں کو غلام بنا کے آپس میں بانٹ لیا اور مرد قیدیوں کو کمال اطمینان اور بے دردی سے ذبح کر دیا۔ سر کاٹ کاٹ کر خیموں کے گرد جمع کرتے گئے۔ ہزاروں مفروروں کو آس پاس کے دیہاتیوں نے قتل کیا۔ گرانٹ ڈف لکھتا ہے کہ لڑنے والوں میں سے قیاس کیا جاتا ہے کہ صرف ایک چوتھائی زندہ بچے اور یہی تناسب بھیر کے

---

[1] ہلکر کے طرز عمل کی نسبت سر جان میل کم کا بیان ہے (جلد اول صفحہ ۱۰۳) کہ ملہار راؤ ہلکر کا ایسے معرکے سے جو اُس کی قوم کے حق میں تباہ کُن تھا، جلد تر نکل جانا کسی قدر طعن و تعریض کا موجب ہوا لیکن اس کے حامی کہتے ہیں کہ یہ بھی اس کی سپہ سالاری کی اعلیٰ واقفیت تھی کہ وہ زندہ بچ گیا اور شکست ہوتے دیکھی تو اپنی فوج کو پراگندہ نہ ہونے دیا بلکہ ایسی ترتیب کے ساتھ پسپا ہوا کہ اور کسی کی جمعیت اتنی مرتب نہ رہ سکی۔ یہ بیان اور زیادہ قرین صواب نظر آتا ہے اگر ہم اس روایت کو بھی باور کریں کہ عین جنگ کی صبح کو اس کا اپنے اعلیٰ سپہ سالار سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس نے سداشیو بھاؤ سے التجا کی کہ ایک دو دن لڑائی اور ملتوی رکھی جائے مگر بھاؤ کی نخوت و خود پسندی حد سے گزر چکی تھی۔ وہ صلاح مشورے پر مطلق کان نہ دھرتا تھا۔ ہلکر کے جواب میں چلایا کہ "گڈریوں سے کون مشورہ مانگتا ہے!" اگر یہ حکایت صحیح ہو تو کیا عجب ہے کہ ملہار راؤ ہلکر جیسے مزاج کا آدمی سمجھ گیا ہو کہ جنگ میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

[2] سداشیو بھاؤ جائز رکھتا تھا کہ اس کے نوکر منجملہ اور القاب کے اسے "پرسرام اوتار" (یعنی وشنو کا اوتار) پکارا کریں۔

باب دوازدہم

بچ نکلنے والوں کا تھا۔ بالفاظِ دیگر تقریباً دو لاکھ مرہٹے اس جنگ میں ہلاک ہوئے"۔

جاٹوں کے راجہ نے پناہ گزینوں سے بہت مہربانی کا برتاؤ کیا۔ وسواس راؤ کی لاش میدان میں ملی اور وحشی رئیس جو افغانی تاجدار کے گرد جمع تھے، اول اول مُصر ہوئے کہ کافروں کے بادشاہ کی کھال میں بھُس بھرکر اسے کابل لے چلیں لیکن شجاع الدولہ کے کہنے سننے سے آخرکار اسے جلوا دیا گیا۔ ایک بے سر کی لاش پیش کی گئی کہ یہ بھاؤ کی ہے مگر اس بارے میں شبہہ باقی رہا۔ سندھیا گرفتار اور نجیب الدولہ کے جذبۂ انتقام کا شکار ہوا۔ ابراہیم خاں بھی اسیروں میں تھا اور اس ناقابل معافی جُرم کی پاداش میں قتل کیا گیا کہ کافروں کی طرف سے (حضور) رسول (مقبول صلعم) کے متبعین کے خلاف لڑا تھا۔

اس مصیبتِ عُظمیٰ کی خبر پیشوا کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ بہت جلد گھُل گھُل کے مر گیا اور اُس وقت تو اس کی تمام قوم کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی۔ چند اعلام بدل دیے جائیں تو اسکوٹ کے شعر جو اُس نے اپنے ہم وطنوں کی فلوڈن میں ہزیمت پر لکھے تھے اس موقع کے لئے بھی پوری طرح صادق آتے ہیں:-

"*Nerbidda* heard the ceaseless plash,
while many a broken band,
Disorder'd, through her currents dash,
to gain the *Dekkan* land;
To town and tower, to down and dale,
To tell red *Paniput's* dimal tale,
And raise the universal wail
Tradition, legend, tune, and song,
Shall many an age that wail prolong:
Still from the sire the son shall hear
Of the stern strife and carnage drear,
of *Paniput's* fatal field,
Where shiver'd was *Maharashtra's* spear
And broken was her shield."

اختتام

معرکۂ پانی پت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ ہند کا دیسی دور ختم ہوگیا۔ آئندہ اس داستان کی دلچسپی مغرب اقصا کے ملوک تجارت کی ترقی سے وابستہ تر ہوتی جائے گی سلطنت مغلیہ کا وجود محسوس ناپدید ہوگیا، اگرچہ وہ ایک تخیل، روایت یا ملکی داد و ستد میں، ایک مفروضے کی حیثیت سے دماغوں کو پریشان کرتی اور دیسی اور فرنگی دونوں کے سیاسی تعلقات میں الجھنیں ڈالتی رہی۔ نام کا شہنشاہ موجود ہے مگر ایک مغرور قسمت آزما سے بڑھ کر اس کی حیثیت نہیں قسزا قانہ توانائی کا وہم انگیز مجسمہ جس نے نظام ملوکیت کا کلیجہ چبا لیا اور خود ملبوس شاہی سجا کر، خوف تھا کہ اقتدار ملوکیت پر بھی قابض ہو جائے گی، وہ بلا، افغانی چھرے سے آغشتہ بخوں و سرنگوں پڑی ہے۔ البتہ "صاحبان فرنگی" کا ستارہ عروج پر ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ آفاق پر اسی کی بادشاہی تحریر ہے اگرچہ کبھی کبھی وہ گہن میں آجائے گا یا کوئی حریف سخت اسے ضرور للکارے گا۔

انگریزوں نے اسی زمانے میں دیسی طاقتوں کے باہمی جھگڑوں میں آزادی سے حصہ لینا شروع کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھی دنوں پہلی مرتبہ وہ مشرقی ہندوستان کے پورے ساحل پر بلکہ وادی گنگا میں بھی خاصی دور تک محفوظ و با اقتدار مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانسیسیوں سے کارومنڈل کے ساحل پر پانڈی چیری کی تسخیر کے ساتھ انکی طولانی کشمکش اختتام کو پہنچنے والی تھی۔ اور ادھر بنگالے میں کلائیو کچھ مدت پہلے پلاسی کی لڑائی جیتا تھا اور بادشاہ گری اور ہماری (انگریزوں کی) سلطنت ہند کی بنا ڈالنے کا منصب اختیار کر رہا تھا۔

یہ سچ ہے کہ جنوب میں اقتدار شاہی کا ایک نیا امیدوار پیدا ہوا اور ابھی سے وہ منصوبے تیار کر رہا تھا جو ان اطراف میں ہماری حکومت و سلامتی کے لئے ساز گار نہ تھے بلکہ ایک وقت میں یہاں تک اندیشہ پیدا ہو جائے گا کہ ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال نہ دیا جائے۔ دوسرے گو مرہٹہ اثر و در کا تاج سر ٹوٹا اور وہ مجروح و مدہوش گر پڑا۔ تاہم ایک مرتبہ اور ابھرا۔ اس کی قسمت میں بدا ہے کہ سراج الدولہ بلا کی اور ٹیپو کو مغلوب

کرنے والوں کی روز افزوں دست درازی کی مزاحمت اور ان سے قوت آزمائی کرے۔ اسی طرح مشرقی ہمالیہ میں ایک دلیر و جفاکش قوم پرورش پا رہی ہے جو آگے چل کر اہل برطانیہ کی جنگی قوت اور ذرائع پر سخت بار ڈالے بغیر نہ رہے گی۔ خود افغان بھی اگرچہ اتنی مشقت کے بعد جو فتح پائی، اس کے نتائج سے بہرہ مند ہونے کے لئے ہندوستان میں نہیں ٹھیرا لیکن پانی پت کی پُرخوں غنائم ہی میں اُس ذلت و سرنگونی کی فال موجود ہے جو اسی برس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے جان سے بیزار اور خونخوار ہموطنوں کے ہاتھوں انگلستان کو نصیب ہونے والی تھی۔

آخر میں وہ عجیب قوم قابل ذکر ہے جو پُرجوش مذہبی اور زبردست جنگجوؤں پر مشتمل اور دریائے سندھ کے آس پاس مجتمع ہو رہی ہے۔ بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر اس نے انھی دنوں بیرونی اقتدار و نگرانی سے آزادی پائی ہے۔ ایک پرہوس مگر محتاط سردار اس کی تنظیم و انضباط کرتا اور سالہا سال تک اسے قابو میں رکھتا ہے لیکن اس کے مرنے کے بعد اسی خطے کے بے پناہ سیلابوں کی طرح، وہ ہمسایہ برطانی صوبوں میں اُمنڈ آتی ہے اور ہماری شہنشاہی طاقت کو جس کی جڑوں کو افغانستان میں انگریزوں کی ہزیمت نے پہلے ہی ہلا دیا تھا، ایک مرتبہ اور خطرے میں ڈال دیتی ہے۔

مگر ان سب بڑی اور دوسری چھوٹی چھوٹی جھنجوڑیوں میں بھی انگریز کا سر ہر جگہ بلند نظر آتا ہے۔ اس کا بھاری ہاتھ اور منصوبہ گر دماغ بالآخر ہر سمت میں بازی لے جاتے ہیں۔ اس کی کامرانی کا تسلسل ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئی وحدت کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ بلاواسطہ حکومت اور بالواسطہ اثر ڈالنے کا جو نظام تیار کرتا ہے اس کی نوعیت اور اس کا عمل کہاں تک حدود ہے یہ اہم چیزیں ہیں جن پر لوگوں کی قسمتوں کا انحصار ہے۔

خلاصہ یہ کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور بالاجی باجی راؤ کی وفات تک جو یادگار لڑائیاں ہوئیں، ان سے بالواسطہ اہل برطانیہ کی فتح ہند میں مدد ملی اور ان کی بادشاہی کا آغاز ہوا۔ اسی لئے انگریزوں کی اس عظیم الشان کامیابی کی جنگی، سیاسی یا اخلاقی نوعیت اس وقت تک بخوبی سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ پہلے مذکورۂ بالا پیچیدہ اور نتیجہ خیز مقدمے سے آگاہی حاصل نہ ہو جائے۔

تمت

صحت نامہ

ہندوستان کی حالت (برطانی تسلط کے قریب)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲	۱۴	کوہستان ہمالہ	کوہستان ہمالہ	۳۲	حاشیہ سطر ۸	ہونے	ہوئے
۲	۱۵	نیل گرین	نیلی گرین	۴۰	۲۰	غلیوں	غلطیوں
۸	۱۳	پرسندربن	سندربن	۴۱	۱۲	عملا	عملاً
۱۱	۲۱	وسطی امتام	وسطی مقام	۴۷	۷	با فوجی	یا فوجی
۱۴	۱۲	ضمنا	ضمناً	〃	〃	ہولی	ہوتی
۱۸	۱۳	حملہ آواروں	حملہ آوروں	〃	۱۹	فتنہ جو	فتنہ جُو
۲۳	۲۳	ایک سفر	ایک سطر	۶۸	۲۳	تھی	تھیں
۲۴	۱۷	ہوکا	ہوگا	۷۱	۳	یہ ادمی	یہ ادنی
۲۷	۱۳	یقینیا	یقیناً	۷۲	۳	کے معینت	کی معیت
۲۸	۶	بادشاہ کو اس کو کی	بادشاہ کو اس کی	۷۴	۷	بیجا پورہ	بیجاپور
۲۹	۱۷	ہمت افرائی	ہمت افزائی	۷۵	۱	تا انکہ	تا آنکہ
〃	حاشیہ سطر ۱	گوانگنڈہ	گولکنڈہ	〃	۵	کی گی	کی گئی
۳۰	۱۱	اورمذکورہ بالا	(اور مذکورہ بالا	۱۲۰	۵	(رہالی)	(رہائی)
〃	۱۶	ہمایوں	ہمایوں)	۱۲۹	۸	آسافی	آسانی
۳۱	۱۹	مذ مذب	مذبذب	〃	۱۴	چوکنا	چوکنّا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۳۰	۱۰	مارگیا	مارا گیا	۱۷۷	پیشانی کتاب	برطانی تسلط کے قریب	برطانی تسلط کے قریب
〃	۱۷	خوشی شے	خوشی سے	۱۸۷	۱۹	نورکر	توڑکر
۱۳۴	۱۵	مضبو	مضبوط	۱۹۱	۱۰	دہ ست نگر	و دست نگر
〃	۲۵	معمور ہے	معمور رہے	۱۹۷	۱۱	ظہور	ظہور
۱۳۶	حاشیہ سطر ۱	سنہ ۱۳۲۴ء	سنہ ۱۷۳۴ء	۲۰۸	۲	نازل	نازل
۱۳۷	۱۳۶	عالم طور سے	عام طور سے	۲۱۳	حاشیہ سطر ۱	مہاراشٹر	مہاراشٹر
۱۴۱	۱۰	ہمیں	ہمیں	۲۱۷	۷	نواجوان	نوجوان
۱۴۱	۲۰	لوکوں	لوگوں	۲۲۱	حاشیہ سطر ۱	حیب ررعلی	حیدرعلی
۱۴۳	۹	مطابق کام کام	مطابق کام	۲۵۹	۱۹	تحت، بادشاہی	تخت بادشاہی
〃	۲۱	ناکپور	ناگپور	۲۶۴	۲	ماتحتوں کلی	ماتحتوں کی
۱۴۵	۱۶	دونو	دونوں	۲۷۲	۴	حکم کہ	حکم ملا کہ
۱۴۷	۷	قتح	فتح	〃	۱۰	لڑار	لڑا۔
۱۵۴	حاشیہ سطر ۱	حمد شاہ	محمد شاہ	〃	۲۱	حقیقت	وہ حقیقت
۱۷۳	۸	صفدرلی	صفدر علی	۲۷۶	۲۴	حاصل نہ ہو جائے	حاصل نہ ہو جائے